آج

۵۴

اِتالو کلووینو

ڈیوڈ کورٹن

نیر مسعود

ناتالیا گنزبرگ

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۵۴

جون ۲۰۰۶ء

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) ۳۰۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

ہندستان: ایک سال (چار شمارے) ۲۴۰ روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) ۳۰ امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 5213916 5650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com, aajquarterly@gmail.com

ہندستان:

C/o Dr/ Ather Farouqui, First Floor,

80, Sukhdev Vihar, New Delhi 110 025

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

رشید حسن خاں

کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

اِتالو کلوینو

۷

درخت نشیں

(ناول)

❁

ڈیوڈ کورٹن

۲۴۳

عالمگیر معیشت اور ماحولیاتی انقلاب

ایک ذاتی سفر

❁

نیر مسعود

۲۸۹

گل ستارہ

Scanned with CamScanner

❁

ناتالیا گنزبرگ

۳۰۷

ماں

نئی کتابیں

On the Outside
Poems by Zeeshan Sahil
Translation by Tehmina Ahmed
Rs.150

انیس

(سوانح)

نیر مسعود

Rs.375

مرثیہ خوانی کا فن

نیر مسعود

Rs.150

جوئندہ یابندہ

حیات، کمیونزم اور سب کچھ

رالف رسل

انگریزی سے ترجمہ: ارجمند آرا

Rs.295

Scanned with CamScanner

اِتالو کلوینو

کا مکمل ناول

درخت نشیں

انگریزی سے ترجمہ:

راشد مفتی

Scanned with CamScanner

اطالوی زبان کے منفرد ادیب اتالو کلوینو (Italo Calvino) ۱۹۲۳ء میں کیوبا میں پیدا ہوئے اور اٹلی کے شہر سان ریمو میں پرورش پائی۔ ایک بلند پایہ فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب سے متعلق موضوعات پر مضامین بھی لکھے اور تورینو کے ایک اشاعتی ادارے کے ادارتی عملے میں بھی شامل رہے۔ کلوینو نے اطالوی لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ بھی مرتب کیا۔ کلوینو کی وفات ۱۹۸۸ء میں ہوئی۔ کلوینو کی تحریروں میں پڑھنے والے کی وفات ایک بے حد فراواں تخیل اور اسلوب اور بیان پر بے پناہ گرفت سے ہوتی ہے۔ ان کا ناول *If on a Winter's Night a Traveller* اپنی ساخت اور اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے عالمی فکشن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ فکشن کے میدان میں ان کی متعدد دوسری تحریریں، ناول اور کہانیاں، شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک کہانی کا ترجمہ ''آج'' شمارہ ۳ میں ''چاند کی دوری'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

کلوینو نے *Our Ancestors* کے نام سے تین ناولوں کا ایک سلسلہ لکھا جس کے ایک ناول *The Cloven Viscount* کا ترجمہ ''دولخت سورما'' کے عنوان سے راشد مفتی نے خاص طور پر ''آج'' کے شمارہ ۲۵ کے لیے کیا تھا۔ اس بار انھوں نے اس سلسلے کے دوسرے ناول *The Baron in the Trees* کا ترجمہ کیا ہے جسے ''درخت نشیں'' کے عنوان سے آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ناول، جس میں ایک بظاہر ناقابلِ یقین کہانی کو کلوینو نے اپنے جادونگار اسلوب سے انتہائی قابلِ یقین بنا دیا ہے، پہلی بار اطالوی زبان میں ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا تھا اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس اسلوب کی سادگی دراصل کلوینو کے فکشن کی معنوی تہہ داری کا پردہ ہے۔ خود کلوینو کو اس سے اتفاق تھا کہ ان کی کتابوں کو مختلف ادبی، فلسفیانہ، سیاسی، نفسیاتی اور دیگر نقطہ ہائے نظر سے پڑھا جائے لیکن ان کی خوشی کا اصل سبب یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی کنجی تنہا تالے کو نہیں کھول سکے گی۔ باپ اور گھر کے سخت قوانین سے باغی ہو کر بارہ سال کی عمر میں درختوں پر جا بسنے اور ساری زندگی اپنے اختیار کردہ اسلوب میں گزارنے والے کوسیمو کا کردار عالمی ادب کے سب سے زیادہ دل موہ لینے والے کرداروں میں گنا جاتا ہے، اور اس کے طرزِ عمل کی بے شمار توجیہیں کی جاتی رہی ہیں، اور ناول کے متن میں ان تمام کے لیے گنجائش موجود ہے۔ لیکن کلوینو کے تخلیقی وفور سے چھلکتے ہوئے بیانیے کو کسی ایک نقطۂ نظر میں قید کرنے کی کوشش آخر کار اس بیانیے کے اثر کو محدود کرنے کی کوشش ثابت ہوتی ہے۔ ناول کے قصے اٹھارویں صدی کے یورپ کے تاریخی پس منظر میں پیش آتے ہیں جن میں انقلابِ فرانس کے واقعات بھی شامل ہیں — اور ان میں درخت نشیں کوسیمو کی نپولین سے ملاقات کی روداد شاید سب سے زیادہ پُرلطف قصوں میں سے ہے — لیکن ناول کے اصل معنی کسی خاص دور یا خطے تک محدود نہیں۔

راشد مفتی اس سے پہلے گابریئل گارسیا مارکیز، آئزک باشیوس سنگر، سال بیلو اور برنارڈ مالامڈ کی منتخب کہانیوں کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ ''آج'' کے شمارہ ۵۳ میں ان کا کیا ہوا فرانسیسی ادیب ژاں پال سارتر کی معروف کہانی کا ترجمہ ''دیوار'' کے عنوان سے شائع ہوا۔

Scanned with CamScanner

۱

۱۵ر جون ۱۷۶۷ء کا دن تھا کہ میرا بھائی کوسیمو پیوواسکودی روندو آخری بار ہمارے درمیان بیٹھا۔ یہ بات مجھے اس طرح یاد ہے گویا آج ہی کی بات ہو۔ ہم اپنے اومبروسا والے مکان کے ڈائننگ روم میں تھے جس کی کھڑکیاں باغ میں لگے سدا بہار شاہ بلوط کی موٹی موٹی شاخوں سے گھری ہوئی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہمارے خاندان میں ابھی تک کھانے کا پرانا روایتی وقت رائج تھا، حالانکہ بیشتر روسا فرانس کے ست الوجود درباریوں کی تقلید میں عین سہ پہر کے درمیان کھانا کھانے کا فیشن اپنا چکے تھے۔ سمندر سے آتی ہوئی خوشگوار ہوا، مجھے یاد ہے، پتوں میں سرسرا رہی تھی۔ کوسیمو نے کہا، ''میں نے کہہ دیا، مجھے نہیں چاہیے، بالکل بھی نہیں!'' اور اس نے اپنی گھونگھوں سے بھری پلیٹ ایک طرف سرکا دی۔ ایسی نافرمانی ہم نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

میز کے سرے پر ہمارے والد، بیرن آرمینیو پیوواسکودی روندو، لوئی چہار دہم کے انداز میں کانوں تک لمبی وِگ لگائے بیٹھے تھے جو ان کی اور بہت سی چیزوں کی طرح رواج سے ہٹ کر تھی۔ میرے اور میرے بھائی کے درمیان ہمارے خاندانی مہتمم خیرات اور ہم دونوں لڑکوں کے اتالیق ایبے فوشیلی فلیئر تھے۔ ہمارے مقابل ہماری والدہ بیرونس کورادینا دی روندو، جو عرف عام میں جنرلیسا کہلاتی تھیں، اور ہماری بہن جو ایک طرح کی گھر پر رہنے والی راہبہ تھی، بیٹھی تھیں۔ میز کے دوسرے سرے پر ہمارے والد کے مقابل ترکی عباؤں میں ملبوس کوالیئے اینیا سلویو کاریگا بیٹھے تھے جو ہماری زمینوں کے وکیل، منتظم اور آب رسانی کے نگراں تھے اور ہمارے والد کے ناجائز بھائی ہونے کے ناتے ہمارے فطری چچا بھی۔

چند ماہ قبل جب کوسیمو بارہ اور میں آٹھ سال کا ہوا، ہمیں والدین کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ مجھے اپنے بھائی کی ترقی سے فائدہ پہنچا تھا اور میں قبل از وقت آگے بڑھا دیا گیا تھا، کہ مجھے کھانا تنہا کھانا نہ پڑے۔ فائدہ غالباً موزوں لفظ نہیں ہے کیونکہ حقیقتاً یہ ہماری، میری اور کوسیمو کی، فارغ البال زندگی کا خاتمہ تھا۔ ہمیں اپنے چھوٹے کمرے میں اکیلے ایبے فوشیلی فلیئر کے ساتھ کھانا کھانے کی یاد ستانے لگی۔ ایبے ایک جھریوں بھرا خشک بوڑھا تھا۔ وہ ایک جینسنی (Jensenist) کی

حیثیت سے مشہور تھا اور حقیقت میں اپنے آبائی ملک دو فینے سے مذہبی عدالت میں دائر مقدمے سے بچنے کے لیے بھاگ آیا تھا۔ لیکن کردار کی سختی، جس کے لیے اس کی اکثر ستائش کی جاتی تھی، اور اس کا سخت ذہنی نظم، جو اس نے خود پر اور دوسروں پر عائد کر رکھا تھا، بے حسی اور آرام طلبی کی گہری دبی ہوئی خواہش کے آگے سپر انداز ہونے پر مائل تھا، گویا کہ خلا میں گھورنے والے لمبے لمبے مراقبوں نے اسے صرف شدید تکان اور بوریت ہی بخشی ہو، اور اب حال یہ تھا کہ ہر چھوٹی سے چھوٹی پریشانی کو وہ تقدیر کا لکھا سمجھنے لگا تھا جس سے لڑنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ ایسے کے ساتھ ہمارا کھانا ڈھیر ساری دعاؤں کے بعد منظم رسومات کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔ ہر کوئی بے آواز پیدا کیے چمچے اُٹھاتا اور جو بھی اپنی پلیٹ سے نظریں ہٹاتا یا شوربہ پیتے وقت ذرا بھی آواز نکالتا اس کی کمبختی آ جاتی۔ لیکن پہلی قاب ختم ہوتے ہوتے ایسے بور ہو کر تھک جاتا اور خلا میں نظریں گاڑے شراب کی ہر چسکی کے ساتھ اپنے ہونٹ چاٹا کرتا گویا کہ صرف حد درجہ گریزپا اور سطحی احساسات ہی اس تک پہنچ پاتے ہوں۔ خاص قاب کے آتے آتے ہم اپنے ہاتھ استعمال کرنے لگتے اور کھانا ختم ہونے پر ایک دوسرے کو ناشپاتی کے بیج مارنے لگتے جبکہ ایسے اپنی پژمردہ آواز میں بار بار فرانسیسی میں ''بہت خوب! بہت عمدہ!'' کی تکرار کرتا۔

اب خاندان والوں کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھنے سے وہ ساری مانوس رنجشیں جو بچپن کا اچھا خاصا بوجھ ہوتی ہیں، اُبھر آئی تھیں۔ اپنے ماں باپ کو ہمیشہ اپنے مقابل دیکھنا، مرغی کے لیے چھری کانٹے استعمال کرنا، اپنی کمر سیدھی اور کہنیاں نیچے رکھنا، یہ سب کیسا عذاب تھا—ہماری نفرت انگیز بہن باتیستا کی موجودگی کا ذکر تو چھوڑیے۔ اس طرح جھگڑوں، معاندانہ تو تو میں میں، سزاؤں اور کٹیلے فقروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تاوقتیکہ وہ دن آ پہنچا جب کوسیمو نے گھونگھے کھانے سے انکار کیا اور اپنی تقدیر ہم سے الگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ان بڑھتی ہوئی خاندانی آزردگیوں کو خود میں نے بعد ہی میں محسوس کیا۔ اُس وقت میں آٹھ سال کا تھا، ہر بات ایک کھیل لگتی تھی، ہم لڑکوں اور بڑوں کی باہمی کشاکش ایسی ہی تھی جیسی سب خاندانوں میں ہوتی ہے، اور میں یہ محسوس نہ کر پایا کہ میرے بھائی کی سرکشی اپنی گہرائی میں کچھ اور بھی چھپائے ہوئے ہے۔

یہ درست ہے کہ ہمارے سردار والد ایک بور آدمی تھے، حالانکہ وہ برے آدمی نہیں تھے: بوران

Scanned with CamScanner

معنوں میں کہ ان کی زندگی پر باہم متضاد خیالات حاوی تھے جیسا کہ عبوری ادوار میں اکثر ہوتا ہے۔ زمانے کی اتھل پتھل کچھ لوگوں کو اپنے آپ کو جھنجھوڑنے کی ضرورت محسوس کراتی ہے لیکن مخالف سمت میں، آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے کے لیے۔ چنانچہ اپنے اطراف تیزی سے بدلتے حالات کے باوجود ہمارے والد ڈیوک آف اومبروسا کا کھویا ہوا لقب دوبارہ حاصل کرنے پر تلے بیٹھے تھے، اور شجرہ ہائے نسب، جانشینیوں، خاندانی رقابتوں اور دور و قریب کے رؤسا کے ساتھ رشتے ناتوں کے علاوہ کسی شے کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ ہمارے گھر میں زندگی کسی دربار میں پوری تیاری کے ساتھ حاضر ہونے کی مستقل مشق تھی، چاہے وہ آسٹریا کے شہنشاہ کا دربار ہو یا بادشاہ لوئی کا، یا تورین کے کوہستانیوں کا۔ مثال کے طور پر جب کھانے کی میز پر بطخ پیش کی جاتی تو ہمارے والد یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم گوشت اور ہڈیاں شاہی اصولوں کے مطابق الگ کرتے ہیں یا نہیں، عقاب کی نظر رکھتے تھے۔ اور ایبے اس ڈر سے کہ مبادا آداب کی غلطی کر بیٹھے، بمشکل ہی لقمہ لینے کی جرأت کرتا، کہ اس غریب کو بھی ہمارے والد کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اور اب ہم نے کوالیئے کاریگا کا ایک پُرفریب پہلو دیکھا۔ وہ بطخ کی سالم رانیں فراغت کے وقت انگور کی بیلوں میں چھپ کر آرام سے کھانے کے لیے اپنی ترکی عبا کی تہوں میں چھپا لیتا۔ ہم قسم کھا سکتے تھے کہ جب وہ کھانے کی میز پر آتا تو اس کی جیب میں پچوڑی ہوئی ہڈیاں ہوتیں جو بطخ کے گوشت کے ان بڑے بڑے ٹکڑوں کی جگہ لے لیتیں جنھیں وہ چھپا کر لے جاتا۔ مگر وہ اتنا سریع الحرکت تھا کہ اس عمل کے دوران ہم اسے پکڑنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوئے۔ رہیں ہماری والدہ، جنرلیسا، تو ان کی طرف سے ہمیں فکر نہیں تھی۔ وہ اپنے لیے کھانا نکالنے میں اکھڑ فوجی آداب استعمال کرتیں، "تھوڑا سا اور، بس! خوب!" اور ان پر کوئی حرف زنی نہیں کرتا تھا۔ وہ ہم سے دسترخوان کے آداب کی نہیں بلکہ کڑے نظم کی متقاضی تھیں اور ہمارے والد کی مدد اپنے پریڈ گراؤنڈ جیسے احکام سے کرتی تھیں: "سیدھے بیٹھو اور اپنی ناک صاف کرو!" لیکن واحد ذات جو واقعی آرام سے تھی ہماری راہبۂ خانہ بہن باتیستا تھی۔ وہ سرجن کے نشتروں کی طرح چھوٹے چھوٹے تیز چاقوؤں سے، جو صرف اسی کے پاس تھے، انتہائی انہماک سے اپنی مرغی کو ریشہ ریشہ کرتی رہتی۔ ہمارے والد بیرن، جنھیں ہمارے سامنے اس کی مثال رکھنا چاہیے تھی، اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتے تھے کہ کلف دار سرپوش کے نیچے سے اپنی گھورتی ہوئی آنکھوں اور چوہے جیسے پیلے چہرے میں مضبوطی سے جڑے

Scanned with CamScanner

باریک دانتوں کے ساتھ وہ انھیں بھی ڈرادیتی تھی۔ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ہماری باہمی مخاصمتوں اور عدم مطابقتوں کے ساتھ ہماری حماقتیں اور منافقتیں کھانے کی میز پر ہی کیوں سامنے آئیں، اور کیوں وہیں کوسیمو کی بغاوت نے حتمی رخ اختیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ باتیں ذرا تفصیل سے بیان کی ہیں۔ بہرحال یہ آخری آراستہ میز ہے جو آپ میرے بھائی کی زندگی میں دیکھیں گے، یہ بات یقینی ہے۔

یہی وہ واحد جگہ بھی تھی جہاں ہم بڑوں سے ملتے تھے۔ دن کا باقی حصہ ہماری والدہ اپنے کمروں میں گزارتیں اور اپنی کلابتوں اور کشیدہ کاری اور گل کاری کے ٹانکوں میں مصروف رہتیں کہ حقیقت میں یہی وہ روایتی نسوانی مصروفیات تھیں جن کے ذریعے جنرلیسا اپنی جنگجویانہ خواہش کا اظہار کرسکتی تھیں۔ عام طور پر کلابتوں اور کشیدہ کاری جغرافیائی نقشوں کی شکل میں ہوتے جنھیں ہماری والدہ گدوں اور قالی بفتوں پر پھیلا دیتیں اور تخت نشینی کی جنگوں کی صف بندیاں دکھانے کے لیے ان میں پنیں اور چھوٹے چھوٹے جھنڈے لگادیتیں؛ یا وہ توپیں کاڑھا کرتی تھیں جن کے دہانوں سے نکلتے گولوں کے خطِ حرکت کے ساتھ خطِ پرواز اور زاویوں کے نشانات بھی ہوتے، کہ وہ منجنیقوں کے سلسلے میں انتہائی باعلم تھیں، علاوہ ازیں اپنے والد کا سارا کتب خانہ، جس میں فوجی علوم پر مقالے، نقشہ نامے اور گولہ باری کے جدول شامل تھے، ان کے تصرف میں تھا۔ ہماری والدہ فان کرتیوتز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کا شادی سے پہلے کا نام کونرادِن تھا وہ جنرل کونراد فان کرتیوتز کی بیٹی تھیں جس نے بیس سال پہلے ملکہ ماریا تیریسا کے ان دستوں کی کمان کی تھی جنھوں نے ہمارے علاقے پر قبضہ کیا تھا۔ رنڈوا ہونے کے باعث جنرل اپنی بیٹی کو ایک سے دوسرے کیمپ میں اپنے ساتھ لیے پھرتا تھا، مگر یہ کوئی خاص بات نہیں تھی، کہ وہ مکمل ساز و سامان کے ساتھ سفر کرتے، بہترین قلعوں میں قیام کرتے اور ان کے ساتھ ذاتی نوکر ہوتے تھے اور ہماری والدہ گدوں پر کلابتوں بنا کر اپنا وقت گزارتی تھیں۔ لوگ ان کے بارے میں جنرل کے ساتھ لڑائی میں حصہ لینے کی جو کہانیاں بیان کرتے تھے وہ داستانیں ہی تھیں۔ فوجی معاملات سے اپنے موروثی ذوق وشوق کے باوجود، جو غالباً شوہر کے سامنے اپنی ناک اونچی رکھنے کا ایک طریقہ تھا، وہ ہمیشہ گلابی چہرے اور خمیدہ ناک والی ایک عام، غیر اہم خاتون رہی تھیں۔

ہمارے والد علاقے کے ان چند روسا میں تھے جو لڑائی میں سلطنت کے حلیف تھے۔ انھوں

Scanned with CamScanner

نے جنرل فان کرتیوزز کا استقبال کھلی بانہوں سے کیا، اپنے ملازموں کو ان کے تصرف میں دیا اور کونراڈن سے شادی کر کے شاہی مقصد سے اپنی گہری وابستگی ظاہر کی تھی۔ یہ سب کچھ کرتے وقت ان کی نظر علاقے کی جاگیر پر تھی لیکن جب شاہی دستے حسبِ معمول آگے بڑھ گئے اور جینوآ کے حکام نے ان سے ٹیکس کا مطالبہ کیا تو وہ کافی مایوس ہوئے۔ لیکن انھیں ایک اچھی بیوی بہر حال مل گئی تھی۔ اپنے باپ کے پروونس کی مہم میں کام آنے کے بعد، جب ماریا تیریسا نے انھیں کمخواب کی گدی پر رکھا سونے کا ہار بھجوایا، وہ جنرلیسا کہلانے لگیں۔ وہ ایسی بیوی تھیں کہ ان کے ساتھ بیرن کی ہمیشہ نبھتی رہی، چاہے کیمپوں میں پیدا ہونے اور پروان چڑھنے کے باعث وہ فوجوں اور جنگوں کے علاوہ کچھ اور نہ سوچتی ہوں اور بیرن پر محض ایک معمولی زمیندار ہونے کے لیے تنقید کرتی ہوں۔

لیکن اندر سے وہ دونوں، اماں اپنی توپوں اور ابا اپنے شجرہ ہائے نسب کے ساتھ، ابھی تک تخت نشینی کی جنگوں کے عہد میں جی رہے تھے۔ اماں ہم لڑکوں کے کسی فوج میں، چاہے وہ جو بھی ہو، شامل ہونے کا خواب دیکھتیں، جبکہ دوسری طرف ابا کسی ڈیوک کی بیٹی یا سلطنت کی انتخاب کنندہ (Electress) سے ہماری شادی کرانے کا... ان سب باتوں کے باوصف وہ بہترین والدین تھے مگر اتنے غائب دماغ کہ بچپن میں کوسیمو اور میں عام طور سے اپنے حال پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بات صحیح تھی یا غلط؟ کوسیمو کی زندگی انتہائی غیر معمولی تھی، میری انتہائی عام اور سادہ، لیکن اس کے باوجود ہمارا بچپن اکٹھے گزرا۔ اپنے بڑوں کے خبط سے بیگانہ، ہم دونوں ناتراشیدہ راہوں کے جویا تھے۔

ہم درختوں پر چڑھنے کی کوشش کرتے (اب وہ معصوم کھیل پہلی پہلی روشناسی یا شگون کے طور پر مجھے یاد آتے ہیں، لیکن اُس وقت ایسا کون سوچ سکتا تھا؟)، چٹانوں پر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے پہاڑی چشموں کا پیچھا کرتے، سمندر کے ساحل پر نامعلوم غاروں کی سیر کرتے اور گھر میں زینے کی مرمریں منڈیر سے نیچے پھسلا کرتے۔ ایسی ہی ایک پھسلن کوسیمو اور ہمارے والدین کے درمیان پہلے سنگین افتراق کا باعث بنی، کیونکہ اس پر کوسیمو کو سزا ملی، جسے اس نے نامنصفانہ ٹھہرایا، اور تبھی سے خاندان کے خلاف (یا معاشرے کے خلاف؟ یا عمومی دنیا کے خلاف؟) اس کے دل میں رنجش بیٹھ گئی، جسے بعد ازاں، اس کے پندرہ جون والے فیصلے میں ظاہر ہونا تھا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مرمریں منڈیر پر سے پھسلنے کے بارے میں ہمیں پہلے ہی تنبیہ کر دی گئی تھی،

Scanned with CamScanner

اس خوف سے نہیں کہ ہم بازو یا ٹانگ نہ توڑ بیٹھیں — میرے خیال میں ہم نے اسی لیے کچھ نہیں توڑا — بلکہ انھیں یہ خوف تھا، چونکہ ہم بڑے ہو رہے ہیں اور ہمارا وزن بڑھ رہا ہے، کہیں ہم اجداد کے ان مجسموں کو نہ گرا دیں جو ہمارے والد نے زینے کے ہر موڑ کے بعد کھمبوں پر رکھے ہوئے تھے۔ درحقیقت کوسیمو نے ایک بار ایک بشپ کو جو ہمارے رشتے کے پردادا کے پردادا تھے، ان کی کلاہ سمیت گرا دیا تھا۔ اسے سزا ملی لیکن اس کے بعد سے اس نے زینے کے موڑ تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لگانا اور عین وقت پر مجسمے کو بچاتے ہوئے کود جانا سیکھ لیا تھا۔ یہ چالاکی میں نے بھی سیکھ لی، کہ میں اس کی ہر حرکت کی نقل کرتا تھا، سوائے اس کے کہ میں محتاط اور ڈرپوک ہونے کے باعث آدھے راستے ہی میں کود جاتا تھا، یا باقی حصہ مستقل روکیں لگاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کر کے پھسلتا تھا۔ ایک دن وہ تیر کی طرح منڈیر سے نیچے آ رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایبے فوشیلی فلیئر، مرغی کی طرح خلا میں نظریں جمائے، اپنی اوراد و وظائف کی کتاب کھولے، زینہ بہ زینہ چکراتا ہوا اوپر آ رہا ہے۔ کاش وہ حسبِ معمول نیم خوابیدہ ہوتا! لیکن نہیں، وہ انتہائی توجہ اور باخبری کی اس اچانک کیفیت میں تھا جو اس پر کبھی کبھار طاری ہوتی تھی۔ وہ کوسیمو کو دیکھ کر سوچنے لگا: کھمبے، مجسمہ، وہ اس سے ٹکرائے گا، الزام مجھ پر بھی آئے گا (ہماری ہر احمقانہ جسارت پر ہماری نگرانی نہ کرنے کے لیے اسے بھی ملامت کی جاتی تھی)، سو میرے بھائی کو پکڑنے کے لیے اس نے خود کو منڈیر پر دھکیل دیا۔ کوسیمو زوردار آواز کے ساتھ ایبے سے ٹکرایا اور اسے بھی منڈیر سے نیچے گھسیٹتا لے گیا، کہ وہ مردِ ضعیف محض ہڈیوں کا ڈھانچہ ہی تھا۔ کوسیمو نے دیکھا کہ اب روک لگانا اس کے بس میں نہیں، اور دگنی طاقت سے ہمارے جدِ اعلیٰ کا چیا گیرا پیو وا سکودی کروسیڈر کے مجسمے سے جا ٹکرایا۔ ریزہ ریزہ کروسیڈر (کہ وہ پلاسٹر کا بنا تھا)، ایبے اور کوسیمو، سب کے سب ایک ڈھیر کی شکل میں سیڑھیوں کے سرے پر آ گرے۔ اس کے بعد الزامات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ، پٹائی اور اسے روٹی اور ٹھنڈی یخنی کی خوراک پر ہمارے کمرے میں بند کر دیا جانا۔ کوسیمو نے، جو خود کو بے قصور گردانتا تھا، کیونکہ قصور اس کا نہیں ایبے کا تھا، مشتعل ہو کر اپنے محسوسات کا اظہار اس فقرے سے کیا: ''ابا، تمھارے سب اجداد پر لعنت ہو!'' باغی کی حیثیت سے اس کے مشن کا یہ ایک اشارہ تھا۔

ہماری بہن بھی اپنے دل میں یہی کچھ محسوس کرتی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ سے ایک باغی اور تنہا روح تھی۔ اگرچہ جس تنہائی میں وہ رہتی تھی وہ مارکیسینو دیلا میلا والے واقعے کے بعد ہمارے والد نے اس

پر مسلط کی تھی۔ مارکیسینو کے ساتھ کیا گزری، ہم یہ بات کبھی واقعتاً نہ جان پائے۔ وہ، جو ہمارے دشمن خاندان کا بیٹا تھا، ہمارے گھر میں داخل کیسے ہوا؟ اور کس لیے؟ ہماری بہن کو ورغلانے کے لیے، نہیں، بلکہ اس کے ساتھ بالجبر کرنے کے لیے، جیسا کہ میرے والد نے اس واقعے کے نتیجے میں دونوں خاندانوں کے درمیان شروع ہونے والے طویل جھگڑے کے دوران کہا۔ سچ پوچھیے تو ہم لڑکے، جھائیوں بھرے چہرے والے اس سادہ لوح کو لڑکیوں کو ورغلانے والا قیاس کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکے، کم سے کم اپنی بہن کے سلسلے میں تو بالکل نہیں جو یقیناً اس سے زیادہ طاقتور تھی اور جسمانی طاقت کے مقابلوں میں اصطبل کے کارکنوں کو ہرانے میں مشہور تھی۔ اور پھر، کیا وجہ تھی کہ مدد کے لیے پکارنے والا وہ تھا، ہماری بہن نہیں؟ اور پھر نوکروں نے، جو ہمارے والد کی سربراہی میں جائے حادثہ پر پہنچے تھے، اس کی برجس کو دھجی دھجی دیکھا تھا گویا اسے کسی چیتے کے پنجوں نے کھکھیرا ہو؟ دیلا میلا خاندان نے یہ تسلیم کرنے تک سے انکار کر دیا کہ ان کے بیٹے نے باتیستا کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور وہ ان دونوں کی شادی پر بھی رضامند نہیں ہوے۔ یوں ہماری بہن انجامِ کار ایک راہبہ کے لباس میں گھر میں محبوس ہوگئی، اگرچہ اپنے مشکوک مشغلے کے پیش نظر اس نے ثلاثی tertiary کی حیثیت سے منت بھی نہیں مانی۔

اس کے شیطانی منصوبوں نے اپنا اظہار اس کے پکائے ہوے کھانوں میں کیا۔ کھانے پکانے میں وہ واقعی طاق تھی کیونکہ وہ اس فن میں تخیل اور تندہی کی اہم صلاحیتوں کی حامل تھی۔ لیکن جب وہ کھانا پکاتی تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میز پر کون سی حیرت اپنا اظہار کرے گی۔ ایک بار اس نے چوہوں کی کلیجی سے نہایت اعلیٰ پائیاں بنائیں۔ یہ بات اس نے ہمیں نہیں بتائی تاوقتیکہ ہم نے انھیں کھا نہ لیا اور انھیں عمدہ قرار نہ دے دیا۔ اس کے ساتھ ٹڈوں کے کچھ خستہ اور کٹے ہوے پنجے تھے جو ایک کھلے ہوے سموسے پر پچی کاری کے انداز میں رکھے گئے تھے، خنزیروں کی دُمیں تھیں جو تنور میں اس طرح پکائی گئی تھیں گویا چھوٹے چھوٹے کیک ہوں۔ ایک بار اس نے پورا خارپشت کانٹوں سمیت پکا ڈالا، کون جانے کیوں، غالباً قاب کا ڈھکنا اُٹھائے جانے پر ہم سب کو دھچکا پہنچانے کے لیے، کیونکہ خود اس نے بھی، جو عموماً اپنی پکائی ہوئی چیز خواہ کتنی ہی عجیب ہو کھا لیتی تھی، اسے چکھنے سے انکار کر دیا، اگرچہ یہ بچہ خارپشت تھا، گلابی اور یقیناً نرم۔ اصل میں ان ہولناک کھانوں میں سے اکثر ہمیں اپنے ساتھ تنفر انگیز

چیزیں کھلا کر حظ اُٹھانے کے بجائے محض تاثر پیدا کرنے کے لیے سوچے جاتے تھے۔ باتیستا کے یہ کھانے جانوروں یا سبزیوں کے جڑاؤ کے انتہائی نازک کام تھے، مثلاً فر کے کالر پر خرگوش کے کانوں کے ساتھ سجائے ہوئے گوبھی کے پھول، یا خنزیر کی سری جس کے منھ سے چپکا ہوا سرخ جھینگا گویا کہ اپنی زبان نکال رہا ہو، اور جھینگے کے پنجوں میں خنزیر کی زبان گویا کہ اس نے پنجوں سے کھینچ ڈالی ہو۔ اور آخرکار گھونگھے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کتنے گھونگھوں کے سر قلم کر ڈالے تھے۔ ان نرم گھوڑے کے جیسے چھوٹے چھوٹے سروں کو، میرے خیال میں خلال کی مدد سے، اس نے چھلنی کے سوراخوں میں اس طرح رکھا تھا کہ جب وہ میز پر آئے تو چھوٹی چھوٹی بطخوں کے جیسے لگ رہے تھے۔ ان نفیس غذاؤں کے منظر سے بھی زیادہ گھن دلانے والی بات انھیں تیار کرنے میں باتیستا کے پُرجوش ارادے کا خیال اور اس ننھی سی مخلوق کو ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے اس کے پتلے پتلے ہاتھوں کا تصور تھا۔

یہ ہماری بہن کے بھیانک تخیل کے خلاف ایک احتجاج تھا جس نے مجھے اور میرے بھائی کو اس غریب مخلوق کے ساتھ ہمدردی، اور پکے ہوئے گھونگھوں کے ذائقے کے لیے اپنی کراہت ظاہر کرنے پر اکسایا۔ یہ حقیقت میں ہر چیز اور ہر شخص کے خلاف بغاوت تھی، اور یہ حیرت کی بات نہیں کہ اسی نے کوسیمو کے فیصلے اور اس کے بعد والے واقعات کو جنم دیا۔

ہم نے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ جب کوالیئے وزنی گھونگھوں کی بھری ہوئی ٹوکری گھر لایا تو انھیں ایک پیپے میں بھر کے اس خیال سے تہہ خانے میں رکھ دیا گیا کہ انھیں کھانے کو کچھ نہ ملے، یا صرف بھوسی کھائیں اور اس طرح آلائش سے پاک ہو جائیں۔ جب ہم نے ان پیپوں کے منھ سے تختے ہٹائے تو سامنے ایک ہیبت ناک منظر تھا۔ گھونگھے، بچی کھچی بھوسی، غیر شفاف منجمد گاد کی دھاریوں اور رنگ رنگے فضلے کے درمیان، جو کھلی ہوا اور گھاس میں گزرے ہوئے اچھے دنوں کی نشانیاں تھیں، پیپے کی پٹیوں پر ایسی ناتوانی کے ساتھ چڑھ رہے تھے جو ان کے کربِ مرگ کی علامت تھی۔ ان میں سے کچھ سروں کو آگے بڑھائے ہوئے پورے کے پورے اپنے خولوں سے باہر آ گئے تھے اور مونچھوں کو ہلا رہے تھے، اور کچھ سارے کے سارے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے اینٹنا کا ایک مختلف جوڑا دکھا رہے تھے، کچھ نے دیہاتی گپ بازوں کی طرح اپنی منڈلی جما رکھی تھی، کچھ باقیوں سے کٹے ہوئے اور خوابیدہ تھے، اور کچھ اپنے اوندھے خولوں کے ساتھ مردہ پڑے تھے۔ انھیں اس منحوس باورچن سے اور اپنے آپ کو اس کی

فرمانبرداری سے بچانے کے لیے ہم نے پیپے کے پیندے میں سوراخ کردیا اور وہاں سے کٹی ہوئی گھاس کے ٹکڑوں اور شہد کے ذریعے، پیپوں اور تہہ خانے میں پڑے مختلف اوزاروں کے عقب سے گزرتی ہوئی، ممکنہ حد تک پوشیدہ راہ بنائی جو گھونگھوں کو ایک غیر مزروعہ گھاس بھرے کھیت کے مقابل کھلنے والی ایک چھوٹی سی کھڑکی تک لے جانے والی تھی۔

اگلے دن ہم نتائج دیکھنے نیچے تہہ خانے میں گئے اور موم بتی کی روشنی میں دیواروں اور راستے کا معائنہ کیا۔ ''ایک یہ رہا!...ایک اور وہ رہا!...اور ذرا اِسے تو دیکھو، کہاں پہنچا ہے!'' گھونگھوں کی تقریباً مسلسل قطار تھی جو پیپے سے نکل کر ہماری راہ کو اپنائے ہوئے، فرشی پتھروں اور دیواروں پر سے ہوتی ہوئی، چھوٹی کھڑکی کی طرف رواں تھی۔ ''تیز! ست الوجود گھونگھو... جلدی کرو، نکلو!'' یہ دیکھتے ہوئے کہ وہ مکھیوں کی غلاظت اور پھپھوندی کی طرف کھنچ کر تہہ خانے کی کھردری دیواروں پر بار بار دائروں میں گھومتے ہوئے بہت ست رفتار سے بڑھ رہے ہیں، ہم ان پر چلّائے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن تہہ خانہ تاریک اور کاٹھ کباڑ سے اٹا ہوا تھا اور ہمیں امید تھی کہ کوئی انھیں دیکھ نہ پائے گا اور ان سب کو بچ نکلنے کی مہلت مل جائے گی۔

لیکن وہ بے چین مخلوق، ہماری بہن باتیستا، راتوں کو بغل میں بندوق اور ہاتھوں میں شمع دان لیے چوہوں کی تلاش میں حویلی کے اردگرد گھوما کرتی تھی۔ اُس رات وہ نیچے تہہ خانے میں گئی تو شمع کی روشنی نے چھت پر ایک بچھڑے ہوئے گھونگھے اور اس کی چمکدار گاد کو عیاں کیا۔ ایک فائر کی آواز گونجی۔ ہم سب اپنے بستروں میں چونک گئے لیکن اپنی سکونت پذیر راہبہ کی شبینہ شکار بازیوں کا عادی ہونے کی وجہ سے ہم نے جلدی ہی تکیوں پر دوبارہ سر دھر دیے۔ لیکن جبلت کے زیر اثر کیے ہوئے اپنے فائر سے گھونگھے کو نیست و نابود کرنے اور چھت سے پلستر کا ایک ٹکڑا گرا چکنے کے بعد اب باتیستا نے اپنی کرخت آواز میں چلّانا شروع کردیا تھا، ''دوڑو! وہ سب نکل بھاگے ہیں! دوڑو!'' نیم ملبوس نوکر تیزی سے اس کے پاس پہنچے۔ ہمارے والد تیغ سے مسلح ہوکر آئے اور ابے اپنی وگ کے بغیر۔ کوالیئے نے یہ بھی نہیں معلوم کیا کہ معاملہ کیا ہے، بلکہ افراتفری سے بچنے کے لیے جنگل میں بھاگ گیا اور بھوسے کے ایک ڈھیر میں گھس کر سو گیا۔

مشعلوں کی روشنی میں سب نے پورے تہہ خانے میں گھونگھوں کی تلاش شروع کردی، اپنی واقعی مرضی سے نہیں، بلکہ ڈھٹائی سے، یہ تسلیم نہ کرنے کے لیے کہ انھیں بے سبب پریشان کیا گیا ہے۔ انھوں

Scanned with CamScanner

نے پیپے میں سوراخ دیکھ لیا اور فوری طور پر محسوس کر لیا کہ یہ ہمارا کام ہے۔ ہمارے والد گاڑی بان کے چابک کے ساتھ آئے اور بستر ہی سے ہمیں گرفت میں لے لیا۔ پھر، بنفشئی نشانوں سے بھری کمر، کولھوں اور ٹانگوں کے ساتھ ہمیں اس چھوٹے غلیظ کمرے میں بند کر دیا گیا جو قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔

ہمیں روٹی، پانی، سلاد، گوشت کے پوست اور ٹھنڈی یخنی کی خوراک پر (جو خوش قسمتی سے ہمیں پسند تھی) تین دن وہاں رکھا گیا۔ پھر، جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہ ہو، اس پندرہ جون والے روز، دوپہر کے وقت، ہمیں اہل خانہ کے ساتھ اپنے پہلے کھانے کے لیے باہر لایا گیا۔ اور باورچی خانے کی مہتمم ہماری بہن باتیستا نے ہمارے لیے کیا تیار کیا تھا؟ گھونگھوں کا سوپ اور خاص قاب کے لیے گھونگھے! کوسیمو نے ایک لقمہ بھی چکھنے سے انکار کر دیا۔ ''کھاؤ ورنہ ہم اس چھوٹے کمرے میں تمھیں پھر بند کر دیں گے!'' میں نے ہتھیار ڈال دیے اور ان بدبخت گھونگھوں کو چبانے لگا۔ یہ میری بزدلی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ میرا بھائی خود کو ہمیشہ سے زیادہ تنہا محسوس کرنے لگا۔ اس طرح اس کا ہمیں چھوڑ جانا کسی حد تک میرے خلاف بھی احتجاج تھا کہ میں اس کی شرمندگی کا باعث ہوا تھا۔ لیکن میں صرف آٹھ سال کا تھا اور پھر میں، خاص کر ایک بچے کی حیثیت سے، اپنے عزم کی طاقت کا موازنہ اس فوق البشری استقلال سے کیسے کر سکتا ہوں جس کا مظاہرہ میرے بھائی نے اپنی ساری زندگی میں کیا؟

''پھر؟'' ہمارے والد نے کوسیمو سے کہا۔

''نہیں، ہرگز نہیں!'' کوسیمو نے اعلان کیا اور اپنی پلیٹ کو پرے سرکا دیا۔

''میز سے اٹھ جاؤ!''

لیکن کوسیمو پہلے ہی ہم سب سے منھ موڑ چکا تھا اور کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟''

ہم نے شیشے کے دروازے میں اسے اپنا ہیٹ اور نیمچہ اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے میں کہاں جا رہا ہوں!'' اور وہ باغ کے اندر دوڑ گیا۔

تھوڑی دیر میں ہم نے کھڑکیوں سے اسے شاہ بلوط پر چڑھتے دیکھا۔ وہ انتہائی رسمی کپڑوں اور ہیٹ میں ملبوس تھا کیونکہ اس کی بارہ سالہ عمر کے باوجود ہمارے والد کا اصرار تھا کہ وہ کھانے کی میز پر اسی

Scanned with CamScanner

وضع میں آئے۔ پاؤڈر لگے بالوں کے ساتھ چوٹی کے گرد ربن، تین کونوں والا ہیٹ، ریشمی گلوبند اور چنٹ دار پٹی، نوکدار دامن والی سبز قمیص، گلابی پتلون، نیمچہ اور نصف ٹانگوں تک پہنچنے والے چمڑے کے لمبے سفید ساق پوش جو اس پر تکلف لباس میں واحد چھوٹ تھے اور ہماری دیہاتی زندگی کے لیے موزوں ترین۔ (میں فقط آٹھ سال کا ہونے کے باعث بڑے مواقع کے سوا، پاؤڈر لگے بالوں سے مستثنیٰ تھا اور نیمچے سے بھی، جو میں باندھنا پسند کرتا۔) اس طرح اس تیقن اور رفتار کے ساتھ جو ہمارے برسوں اکٹھے مشق کرنے کا نتیجہ تھی، وہ شاخوں پر اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو حرکت دیتا ہوا پرانے گانٹھ دار درخت پر چڑھ گیا۔

میں ذکر کر چکا ہوں کہ ہم لگاتار کئی گھنٹے درختوں پر گزارا کرتے تھے اور اکثر لڑکوں کی طرح بدمقاصد کے لیے نہیں، جو درختوں پر فقط پھلوں اور پرندوں کے گھونسلے اتارنے چڑھتے ہیں، بلکہ تنوں اور دوشاخوں کے مشکل حصوں کو سر کر کے لطف اٹھانے کے لیے۔ ہم جتنا اونچا پہنچ سکتے پہنچ جاتے، کوئی اچھی سی شاخ ڈھونڈ کر سستاتے، نیچے دنیا پر نظر ڈالتے، گزرنے والوں کو آوازیں دیتے، ان سے مذاق کرتے۔ لہٰذا مجھے یہ بات بالکل فطری لگی کہ اس نامنصفانہ حملے کے بعد کوسیمو کو جو پہلا خیال آیا وہ شاہ بلوط پر چڑھنے کا تھا، جو ہمارے لیے ایک مانوس درخت تھا جس نے اپنی شاخیں ڈائننگ روم کی کھڑکیوں کی اونچائی تک پھیلا رکھیں تھی، جن سے اپنا دُکھا ہوا انداز وہ سارے خاندن کو دکھا سکتا تھا۔

"سنبھل کے! سنبھل کے! اب وہ گر پڑے گا! بے چارہ منا!" ہماری والدہ جو ہمیں توپ کی زد میں دیکھ کر بھی پلک نہ جھپکتیں تاہم ہمارے کھیلوں پر کوفت میں رہتیں، فکرمندی سے بولیں۔

کوسیمو ایک بڑی شاخ کے دوشاخے پر چڑھ گیا جہاں وہ آرام سے ڈیرا ڈال سکتا تھا۔ وہ وہاں اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کی ٹانگیں ہوا میں لٹک رہی تھیں، بازو سینے پر بندھے تھے، ہاتھ کہنیوں کے نیچے تھے، سر کاندھوں میں دبا ہوا تھا، اور تین کونوں والا ہیٹ ماتھے پر جھکا ہوا تھا۔

ہمارے والد کھڑکی میں جھکے۔ "جب تم اوپر رہنے سے تھک جاؤ گے تو اپنا ارادہ بدل لو گے!" انھوں نے چلا کر کہا۔

"میں اپنا ارادہ کبھی نہیں بدلوں گا،" میرے بھائی نے شاخ پر سے اعلان کیا۔

"تم جیسے ہی نیچے آؤ گے دیکھ لو گے!"

Scanned with CamScanner

''اب میں کبھی نیچے نہیں آؤں گا۔'' اور وہ اپنے قول پر قائم رہا۔

۲

کوسیمو شاہ بلوط پر تھا۔ شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، گویا زمین کے اوپر اونچے اونچے پل ہوں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ بلکہ شاخوں میں اس طرح چمک رہا تھا کہ ہمیں کوسیمو کو دیکھنے کے لیے آنکھوں پر اپنے ہاتھوں سے سایہ کرنا پڑتا تھا۔ کوسیمو درخت پر سے دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ اوپر سے دیکھے جانے پر ہر چیز مختلف لگتی تھی، اور یہ بات اپنے آپ میں لطف رکھتی تھی۔ گلی نے ایک نیا زاویہ اختیار کرلیا تھا، اور اسی طرح پھولوں کے تختوں اور کافی کے لیے باغ میں پڑی ہوئی لوہے کی میز نے بھی۔ پرے دوری پر درختوں کی پھننگیں چھدری ہو رہی تھیں اور کچن گارڈن چھوٹے چھوٹے چبوترا نما کھیتوں میں، جنھیں پتھر کی دیواروں نے سہارا رکھا تھا، مدغم ہو رہا تھا۔ درمیانی میدان زیتونوں کے سائے سے تاریک ہو رہا تھا۔ اس سے پرے اومبروسا کے گاؤں کی پتھر اور خستہ اینٹوں کی چھتیں ابھر رہی تھیں اور نیچے بندرگاہ پر جہازوں کے مستول۔ فاصلے پر سمندر تھا جہاں ایک کشتی کاہلی سے تیر رہی تھی، اور اس سے پرے ایک کھلا اُفق۔

اور اب کافی پینے کے بعد بیرن اور جنرلیسا باغ میں آئے۔ کوسیمو سے بے پروائی ظاہر کرتے ہوے وہ کھڑے ایک گلاب جھاڑی دیکھتے رہے۔ پہلے وہ بانہوں میں بانہیں ڈالے تھے، پھر جلد ہی باتیں اور اشارے کرنے کو الگ ہو گئے۔ لیکن میں کھیلنے کا بہانہ کرتے ہوے شاہ بلوط کے نیچے کھسک گیا گویا کہ میں اکیلے کھیل رہا ہوں، حالانکہ حقیقت میں میں کوشش کر کے کوسیمو کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتا تھا۔ وہ ابھی تک مجھ سے آزردہ تھا اور اوپر بیٹھا فاصلے میں دیکھتا رہا۔ میں ٹھہر کر ایک بنچ کے نیچے دبک گیا کہ بغیر دکھائی دیے اسے دیکھتا رہوں۔

میرا بھائی کسی پہرے دار کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ ہر چیز کو دیکھ رہا تھا اور ہر چیز اسے دیکھ رہی تھی۔ ایک عورت ٹوکری لیے لیموں کے درختوں کی قطاروں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ راستے پر ایک خچر والا اپنے خچر کو دم سے پکڑے چلا آ رہا تھا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ نعل لگے سُموں کی

آواز پر عورت مڑی اور راستے کی طرف بڑھنے لگی، مگر وقت پر نہ پہنچ سکی۔ پھر وہ گیت گانے لگی لیکن خچر والا پہلے ہی موڑ کاٹ چکا تھا۔ اس کے کانوں میں آواز پڑی تو اس نے چابک زمین پر مارا اور خچر سے مخاطب ہو کر کہا، ''آہ!'' بس، اس کے سوا کچھ نہیں۔ کوسیمو نے یہ سب دیکھا۔

اب راستے سے، اپنی اَوراد و وظائف کی کھلی کتاب تھامے، ایبے فوشیلی فلیئر گزر رہا تھا۔ کوسیمو نے شاخ پر سے کوئی چیز اٹھائی اور اسے ایبے کے سر پر پھینک دیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا چیز تھی، غالباً کوئی چھوٹی سی چمگادڑ، یا چھال کا کوئی ٹکڑا، بہر حال وہ ایبے کو لگی نہیں۔ پھر کوسیمو نے اپنے نیچے سے تنے کے ایک سوراخ کو کریدنا شروع کر دیا۔ ایک مشتعل بھڑ باہر نکل آئی۔ کوسیمو نے اپنے ہیٹ کے ایک جھکولے سے اسے بھگا دیا۔ وہ اپنی نظروں سے اس کا تعاقب کرتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک کدو کی بیل پر جا بیٹھی۔ مکان سے ہمیشہ کی طرح تیز رفتار کو الیئے برآمد ہوا، جو تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا باغ میں گیا اور انگور کی بیلوں کی درمیان غائب ہو گیا۔ کوسیمو یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کہاں گیا ہے ایک بلند تر شاخ پر چڑھ گیا۔ پتوں میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہوئی اور ایک کستورا اُڑتا ہوا باہر نکلا۔ کوسیمو کو افسوس ہوا کہ اس کے جانے بغیر اس تمام وقت وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے مزید کستورے دیکھنے کے لیے دھوپ میں نگاہ دوڑائی۔ نہیں، وہاں ایک بھی نہیں تھا۔

شاہ بلوط ایک بوقیذار کے درخت کے نزدیک تھا اور ان دونوں کی چوٹیاں ایک دوسرے کو تقریباً چھو رہی تھیں۔ بوقیذار کی ایک شاخ کوئی فٹ بھر کی دوری سے بلوط کی ایک شاخ کے اوپر سے گزر رہی تھی۔ میرے بھائی کے لیے اسے پکڑنا اور اس طرح بوقیذار کی بلندی پر پہنچنا آسان تھا۔ اونچے تنے اور زمین سے گرفت میں نہ آسکنے والی شاخوں کے باعث ہم بوقیذار کو سر نہیں کر سکے تھے۔ بوقیذار کی ایک شاخ کے ذریعے، جو اگلے درخت سے ہاتھ بھر دوری پر تھی، وہ ایک خرنوب کے پیڑ پر پہنچ گیا اور پھر ایک شہتوت کے درخت پر۔ اس طرح میں نے کوسیمو کو باغ کے اوپر معلق ایک شاخ سے دوسری شاخ پر بڑھتے دیکھا۔

شہتوت کے بڑے درخت کی کچھ شاخیں ہماری زمین کی چار دیواری اور اس کے پار تک پہنچ رہی تھیں جس کے اُدھر اونداریوا خاندان کا باغ تھا۔ ہم پڑوسی تھے، اس کے باوجود اومبروسا کے اس مارکوئیس (Marquis) اور نواب خاندان کے کسی فرد کو نہیں جانتے تھے۔ انھیں کئی پشتوں سے کچھ

جاگیردارانہ حقوق حاصل رہے تھے جن پر ہمارے والد کا دعویٰ تھا۔ یوں دونوں خاندانوں کو باہمی کدورت نے دور کر رکھا تھا، بالکل اسی طرح جیسے ہماری زمین کو ایک قلعہ نما اونچی دیوار نے ان کی زمین سے الگ کر رکھا تھا، جو یا تو ہمارے والد نے بنوائی تھی یا مارکوئیس نے، کون سے مارکوئیس نے، یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس میں اس حاسدانہ توجہ کا اور اضافہ کر لیجیے جو اونداریوا خاندان اپنے باغ پر صرف کرتا تھا، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ نادر ترین پودوں سے بھرا ہوا ہے۔ حقیقت میں موجودہ مارکوئیس کا دادا نباتات داں لینائیس کا شاگرد رہا تھا اور اس کے زمانے سے فرانس اور انگلستان کے درباروں میں موجود تمام خاندانی روابط نوآبادیوں کے بہترین نباتاتی نوادر اس باغ کے لیے بھجوانے میں سرگرمی سے استعمال کیے جاتے رہے تھے۔ کشتیوں نے برسوں بیجوں کی بوریاں، قلموں کے بنڈل، گملوں میں لگی بوٹیاں اور پورے کے پورے درخت تک، جن کی جڑیں بوریوں کی دبیز تہہ سے محفوظ ہوتیں، اومبروسا کی بندرگاہ پر اتارے تھے، یہاں تک کہ باغ — کہا جاتا تھا — ہندوستان، امریکہ اور نیو ہالینڈ کے جنگلوں کا ایک آمیزہ بن گیا تھا۔

امریکی نوآبادیوں سے درآمد شدہ نئے درخت کا، جس کا نام میگنولیا تھا اور جس کی سیاہ شاخوں پر سفید گودے دار پھول تھے، ہم جتنا حصہ دیکھ سکتے تھے وہ کچھ گہرے رنگ کے پتے تھے جو بڑھ کر باغ کی دیوار سے اوپر نکل آئے تھے۔ کوسیمو نے جو ہمارے شہتوت پر تھا، دیوار کے کونے تک پہنچ کے ایک یا دو قدم کے لیے توازن درست کیا اور پھر اسے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے پرلی طرف میگنولیا کے پتوں اور پھولوں کے درمیان کود گیا۔ پھر وہ نظروں سے غائب ہو گیا، اور جو کچھ میں بتانے جا رہا ہوں، اس نے مجھے بعد میں بتایا، یا میں نے کچھ منتشر اشاروں اور اندازوں سے مرتب کیا۔

کوسیمو میگنولیا پر تھا۔ حالانکہ اس کی شاخیں بہت پاس پاس تھیں لیکن میرے بھائی جیسے مشاق لڑکے کے لیے جو سب درختوں کا ماہر تھا، اس پر چڑھنا آسان تھا۔ شاخیں اس کا وزن سہار گئیں حالانکہ وہ پتلی اور نرم لکڑی کی تھیں اور اس کے جوتوں کی نوکوں نے ان کی سیاہ چھال پر سفید زخم ڈال دیے۔ کوسیمو پتوں کی تازہ خوشبو میں ملفوف، متغیر سبز رنگوں کے ورقوں کے درمیان جو ایک پل مدھم اور دوسرے پل چمکدار نظر آتے تھے، ہوا سے ادھر اُدھر ہو رہا تھا۔

سارا باغ مہک رہا تھا، اور حالانکہ گھنے درختوں کی وجہ سے کوسیمو ابھی تک اسے واضح طور پر نہیں

Scanned with CamScanner

دیکھ سکتا تھا مگر خوشبو کے ذریعے اسے جان رہا تھا اور مختلف خوشبوؤں کا ماخذ شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جنھیں ہوا کے جھونکے ہمارے باغ میں اڑا لاتے تھے، اور جن سے وہ پہلے ہی آشنا تھا؛ یہ خوشبوئیں ہمارے لیے اس جگہ کے اسرار کا ایک لازمی جزو تھیں۔ پھر وہ شاخوں کو دیکھنے لگا اور اسے نئے پتے نظر آئے، کچھ بڑے اور چمکدار گویا کہ چلتا پانی ان پر مسلسل بہتا رہا ہو، کچھ چھوٹے اور پردار، اور درختوں کے تنے جو یا تو بالکل ہموار اور چکنے تھے یا چھلکوں سے پوری طرح ڈھکے ہوے۔

چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ چھوٹی رین چڑیوں کی ایک ڈار چہچہاتی ہوئی اڑی اور تب گاتی ہوئی ایک مدھم آواز سنائی دی: ''اولا، لا... اولا بالان...'' کوسیمو نے نیچے دیکھا۔ قریب ہی ایک بڑے درخت کی شاخ سے جھولا لٹک رہا تھا اور اس پر اسی کی ہم عمر ایک ننھی لڑکی بیٹھی تھی۔

وہ گوری رنگت اور سنہرے بالوں والی تھی اور اس کے بال، اس کی عمر کے حساب سے ایک عجیب طرز میں، اونچے بنے ہوے تھے۔ اس کا ہلکا نیلا لباس بھی اس کے بدن پر بہت ڈھیلا تھا اور جھولے کے ساتھ اٹھتا ہوا اس کا اسکرٹ ریشمی پیٹی کوٹ کے ساتھ ہوا میں چکرا رہا تھا۔ لڑکی کی آنکھیں نیم وا تھیں اور اس کی ناک ہوا میں اس طرح اٹھی ہوئی تھی گویا کہ وہ حکم چلانے کی عادی ہو۔ دانتوں سے چھوٹا چھوٹا کاٹ کر سیب کھاتے ہوے اس نے اپنا سر ایک ہاتھ کی طرف جھکا رکھا تھا جسے بیک وقت سیب کو سنبھالنا اور جھولے کی رسّی پر اسے متوازن رکھنا تھا۔ اور ہر بار جب جھولا زمین سے لگتا وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جوتوں کی نوک سے زمین کو دھکیلتے ہوے خود کو چھوٹے جھکولے دیتی، سیب کا چھلکا تھوکتی اور ''اولا، لا... اولا بالان...'' گانے لگتی گویا کہ اسے جھولے کی پروا ہو اور نہ گیت کی اور نہ ہی سیب کی (اگرچہ شاید جھولے اور گیت سے ذرا سی زیادہ) بلکہ اس کے ذہن پر دوسری باتوں کا بوجھ ہو۔ کوسیمو میکنولیا کی اونچائی سے ایک زیریں شاخ پر اتر آیا اور اب اس کے پیر ایک دوشاخے کے دونوں طرف جمے ہوے تھے اور اس کی کہنیاں ایک سامنے والی شاخ پر اس طرح ٹکی ہوئی تھیں گویا کہ وہ کسی کھڑکی کی چوکھٹ ہو۔ جھولے کی پینگ لڑکی کو عین اس کی ناک کے نیچے لا رہی تھی۔

لڑکی کی نظر اُدھر نہیں تھی، لہٰذا اس نے نہیں دیکھا۔ پھر اچانک اس نے تین کونوں والے ہیٹ اور ساق پوشوں میں ملبوس کوسیمو کو درخت پر کھڑا دیکھا۔ ''ارے!'' اس کے منھ سے نکلا۔ سیب اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور دور تک لڑھکتا ہوا میکنولیا سے جا لگا۔ کوسیمو نے اپنا نیمچہ نکالا، وہ زیریں شاخ سے جھکا

اور سیب کو نیچے میں پروتے ہوئے لڑکی کو پیش کیا، جو اس دوران جھولے کا ایک چکر پورا کر کے دوبارہ اوپر آ گئی تھی۔ ''لو، گندا نہیں ہوا ہے، صرف ایک طرف سے ذرا سا دب گیا ہے۔''

خوبصورت ننھی لڑکی اب اس بات پر افسوس کرتی لگ رہی تھی کہ میکولیا پر اس عجیب لڑکے کے اچانک ظہور نے اسے اتنا حیران کیوں کیا اور اس نے اپنا تحقیری انداز دوبارہ اختیار کرتے ہوئے ناک چڑھالی۔ ''کیا تم چور ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''چور؟'' کوسیمو برا مان کر چلایا۔ پھر کچھ غور کرنے پر، اس خیال نے اسے خوش کر دیا۔ ''ہاں، میں چور ہوں۔'' اس نے اپنا تین کونوں والا ہیٹ نیچے سرکا کے ایک آنکھ کے اوپر کرتے ہوئے کہا، ''کوئی اعتراض؟''

''اور تم چرانے کیا آئے ہو؟''

کوسیمو نے سیب کو دیکھا جسے اس نے نیچے کی نوک میں پرویا تھا، اور اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بھوکا ہے، کیونکہ کھانے کی میز پر اس نے مشکل ہی سے کوئی چیز چکھی تھی۔ ''یہ سیب،'' اس نے کہا اور نیچے کی ایک طرف سے جسے گھر والوں کے احکامات کے باوجود وہ بہت تیز رکھتا تھا، سیب کو چھیلنا شروع کر دیا۔

''تب تو تم پھل چور ہوئے،'' لڑکی نے کہا۔

میرے بھائی کو اومبروسا کے ان غریب شرارتی بچوں کی بھیڑ کا خیال آیا جو باغوں کو تاراج کرنے کے لیے باڑھوں اور دیواروں پر چڑھنے کی جدوجہد کیا کرتے تھے۔ یہ وہ لڑکے تھے جن سے گریز اور نفرت کرنا اسے سکھایا گیا تھا اور اس نے پہلی بار سوچا کہ ان کی زندگی کیسی آزاد اور قابلِ رشک ہوگی۔ خیر، اب وہ ان جیسا بن سکتا تھا اور آئندہ سے انھیں کی طرح رہ سکتا تھا۔ ''ہاں،'' اس نے کہا۔ اس نے سیب کو قاشوں میں کاٹا اور اسے کھانے لگا۔

لڑکی کو ہنسی آ گئی جو جھولے کے اوپر اور نیچے کے پورے ایک چکر کے دوران جاری رہی۔ ''اوہ، تم جو چاہو کہتے رہو! وہ لڑکے جو پھل چراتے ہیں! میں ان سب کو جانتی ہوں! وہ سب میرے دوست ہیں! اور وہ بنیان پہنے، ننگے پیر، الجھے بالوں کے ساتھ گھومتے ہیں! ساق پوشوں اور پاؤڈر کے ساتھ نہیں!''

میرا بھائی اتنا ہی سرخ ہو گیا جتنا سیب کا چھلکا۔ نہ صرف پاؤڈر لگے بالوں کی وجہ سے، جنھیں وہ

Scanned with CamScanner

ذرا بھی پسند نہ کرتا تھا، نشانہ تضحیک بنتا بلکہ اپنے ساق پوشوں کی وجہ سے بھی، جنھیں وہ بہت پسند کرتا تھا، دیکھنے میں ایک پھل چور سے، ان لڑکوں سے جن سے وہ لمحہ بھر پہلے نفرت کرتا تھا، کمتر سمجھا جانا اور سب سے بڑھ کر یہ جاننا کہ یہ لڑکی جو اوندار یوا خاندان کے باغ سے اچھی طرح واقف لگتی ہے، سارے پھل چوروں کی دوست ہے، مگر اس کی نہیں — ان سب باتوں نے اسے غصے، حسد اور شرمندگی کا احساس دلایا۔

"اولا-لا-لا... ساق پوشوں اور پاؤڈر کے ساتھ!" جھولے پر لڑکی گنگنائی۔

لمحہ بھر کے لیے اس کے غرور کو چوٹ لگی۔ "میں ان لڑکوں جیسا چور نہیں ہوں جنھیں تم جانتی ہو!" اس نے چیخ کر کہا۔ "بلکہ میں چور ہوں ہی نہیں! میں نے خود کو چور اس لیے کہا تھا کہ تم ڈر نہ جاؤ۔ اگر تم واقعی جانتیں کہ میں کون ہوں تو خوف سے مر جاتیں! میں ڈاکو ہوں، ایک خوفناک ڈاکو!"

ننھی لڑکی اس کے بالکل قریب ہوا میں پینگیں لیتی رہی گویا کہ اپنے جوتوں کی نوک سے اسے چھو لینا چاہتی ہو۔ "بکواس! تمھاری بندوق کہاں ہے؟ سب ڈاکوؤں کے پاس بندوقیں ہوتی ہیں! اور گوپھنیں بھی! میں نے انھیں دیکھا ہے! انھوں نے قلعے سے یہاں آتے ہوئے پانچ بار ہماری بگھی کو روکا تھا!"

"لیکن سردار کو نہیں دیکھا ہوگا! میں سردار ہوں۔ ڈاکوؤں کا سردار بندوق لیے نہیں پھرتا! صرف تلوار ساتھ رکھتا ہے!" اور اس نے اپنا چھوٹا سا نیچہ سامنے کر دیا۔

ننھی لڑکی نے اپنے کندھے اچکائے۔ "ڈاکوؤں کا سردار،" وہ بولی، "جیان دائی بروگی نامی ایک شخص ہے جو کرسمس اور ایسٹر پر ہمیشہ میرے لیے تحفے لاتا ہے۔"

"آہ!" خاندانی کینے کی لہر سے مغلوب ہو کر کوسیمو دی روندو بے ساختہ بول اٹھا۔ "تب تو میرے والد ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ اوندار یوا خاندان کا مارکوئیس علاقے کے سارے ڈاکوؤں اور اسمگلروں کا محافظ ہے۔"

لڑکی جھولتی ہوئی نیچے کی طرف آئی، مگر دوبارہ بلند ہونے کے بجائے اپنے پاؤں کے ایک تیز جھٹکے سے روک لگا کر جھولے سے اتر آئی۔ خالی جھولا اپنی رسیوں پر دوبارہ ہوا میں اٹھ گیا۔ "فوراً نیچے اترو! ہماری زمین پر آنے کی تم نے جرأت کیسے کی!" لڑکے کی طرف ایک غضب ناک انگلی اٹھاتے

ہوے وہ چلائی۔

''میں تمھاری زمین پر نہیں آیا، اور نہ آؤں گا،'' کوسیمو نے برابر کے طیش سے جواب دیا۔ ''میں نے تمھاری زمین پر قدم نہیں رکھا اور ساری دنیا کی دولت کے عوض بھی نہیں رکھوں گا!''

پھر لڑکی نے بہت سکون سے، بید کی کرسی پر پڑا ہوا پنکھا اٹھایا اور حالانکہ بہت زیادہ گرمی نہیں تھی، اس نے پنکھا جھلتے ہوے آگے پیچھے ٹہلنا شروع کر دیا۔ ''اب،'' وہ ایک محکم آواز میں بولی، ''میں نوکروں کو بلاؤں گی، تمھیں پکڑواؤں گی اور پٹواؤں گی! وہ تمھیں ہماری زمین پر بلا اجازت آنے کا سبق سکھائیں گے!'' وہ اپنا لہجہ مستقل بدل رہی تھی اور یہ لڑکی ہر بار میرے بھائی کو الجھا رہی تھی۔

''جہاں میں ہوں وہ زمین نہیں ہے اور تمھاری ملکیت نہیں ہے!'' کوسیمو نے اعلان کیا اور اسے یہ کہنے کی تحریص ہوئی، ''اور میں بھی اومبروسا کا ڈیوک ہوں، اور اس سارے علاقے کا مالک،'' مگر اس نے اپنے آپ کو روک لیا کیونکہ اب، جبکہ وہ ان سے جھگڑا کر کے کھانے کی میز سے بھاگ آیا تھا، ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا تھا جو اس کے والد ہمیشہ کیا کرتے تھے؛ وہ نہیں چاہتا تھا اور ان باتوں کو درست نہیں سمجھتا تھا؛ اور نوابی کے وہ سارے دعوے بھی اسے ہمیشہ خبط لگتے تھے۔ سو اب وہ، کوسیمو، ڈیوک ہونے کی شیخی کیوں بگھارے؟ مگر وہ اپنی تردید کرنا نہیں چاہتا تھا، لہٰذا جو اس کے ذہن میں آیا کہتا چلا گیا۔ ''یہ جگہ تمھاری نہیں ہے،'' اس نے دہرایا، ''کیونکہ تمھاری ملکیت صرف زمین ہے۔ اگر میں اس پر پاؤں دھروں تو مداخلت ہوگی۔ لیکن یہاں اوپر میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں۔''

اوہ، جیسے وہاں اوپر سب کچھ تمھارا ہے...''

''ہاں! یہاں اوپر سب کچھ میرا ہے...'' اور اس نے مبہم طور سے شاخوں، دھوپ میں چمکتے پتوں اور آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاخوں پر سب کچھ میرا ہے۔ انھیں بلاؤ کہ مجھے پکڑیں، پھر دیکھنا!''

اب اس تمام لاف زنی کے بعد وہ نیم متوقع تھا کہ لڑکی کسی نہ کسی انداز میں اس پر فقرے کسے گی، لیکن اس کے بجائے وہ اچانک دلچسپی لیتی معلوم ہوئی۔ ''آہ اچھا؟ اور یہ تمھاری ملکیت کہاں تک پہنچتی ہے؟''

''جہاں تک میں درختوں پر پہنچ سکتا ہوں۔ یہاں، وہاں، دیوار کے پار، زیتونوں کے جھنڈ میں، پہاڑی کے اوپر، پہاڑی کے پرلی طرف، جنگل میں بشپ کی زمینوں میں...''

''فرانس تک؟''

''پولینڈ اور سیکسونی تک،'' کوسیمو نے کہا، جسے جغرافیے کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا مگر یہ نام اس نے ہماری والدہ سے تخت نشینی کی جنگوں کے قصوں کے دوران سن رکھے تھے۔ ''لیکن میں تمھاری طرح خودغرض نہیں ہوں۔ میں تمھیں اپنی ملکیت میں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔'' اب وہ ایک دوسرے کو تم سے مخاطب کر رہے تھے، اور اس کی ابتدا لڑکی نے کی تھی۔

''اور یہ جھولا کس کا ہے؟'' وہ بیٹھ کر اپنا پنکھا کھولتی ہوئی بولی۔

''جھولا تمھارا ہے،'' کوسیمو نے کہا۔ ''لیکن اس درخت سے بندھا ہونے کی وجہ سے اس کا انحصار مجھ پر ہے۔ سو جب تمھارے پیر زمین کو چھوتے ہیں تم اپنی ملکیت میں ہوتی ہو، اور جب تم ہوا میں ہو تو میری ملکیت میں۔''

رسیاں مضبوطی سے پکڑتے ہوے اس نے اپنے آپ کو دھکیلا اور ہوا میں بلند ہو گئی۔ کوسیمو نے میکنولیا سے اس موٹی شاخ پر چھلانگ لگائی جس سے جھولا بندھا تھا۔ اس نے رسیاں بیچ میں پکڑ لیں اور اسے خود جھکولے دینا شروع کر دیا۔ جھولا بلند سے بلندتر ہوتا گیا۔

''ڈر لگ رہا ہے؟''

''نہیں۔ مجھے نہیں لگتا۔ تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا نام کوسیمو ہے... اور تمھارا؟''

''وِیولانتے، لیکن سب مجھے وِیولا کہتے ہیں۔''

''مجھے بھی گھر والے مینو کہتے ہیں کیونکہ کوسیمو بڑی عمر والوں کا نام ہوتا ہے۔''

''مجھے اچھا نہیں لگا۔''

''کوسیمو؟''

''نہیں، مینو۔''

''آہ... تم مجھے کوسیمو کہہ سکتی ہو۔''

''سوچوں گی بھی نہیں! سنو، ہمیں سب معاملات ٹھیک طے کر لینے چاہییں۔''

''تمھارا مطلب کیا ہے؟'' کوسیمو جو اس کی ہر بات سے زچ ہو رہا تھا، بے ساختہ چلا اٹھا۔

Scanned with CamScanner

''وہی جو میں کہہ رہی ہوں! میں اوپر تمھاری ملکیت میں آ کر ایک باعزت مہمان بن سکتی ہوں، سمجھے؟ اپنی مرضی سے آ جا سکتی ہوں۔اور تم جب تک درختوں میں اپنی ملکیت پر ہو، مقدس اور ناقابل رسائی ہو، لیکن جونہی تم نے میرے باغ کی زمین پر قدم رکھا تم میرے غلام بن جاؤ گے اور میں تمھیں زنجیروں میں جکڑ لوں گی۔''

''نہیں، میں تمھارے باغ میں، بلکہ اپنے باغ میں بھی کبھی نہیں اتروں گا۔ یہ سب میرے لیے دشمن کا علاقہ ہے۔تم میرے ساتھ اوپر آ جاؤ۔ اور تمھارے پھل چرانے والے دوست، اور، غالباً میرا بھائی بیاجیو بھی، اگرچہ وہ ذرا بزدل ہے، ہم سب درختوں پر ایک فوج بنالیں گے، اور زمین اور اس پر رہنے والے لوگوں کو درست کر دیں گے۔''

''نہیں نہیں، بالکل نہیں۔ میں تمھیں سمجھاتی ہوں کہ بات کیا ہے۔ تمھیں درختوں کی بادشاہت حاصل ہے، ٹھیک ہے؟ لیکن تم اگر ایک بار بھی زمین پر پاؤں رکھو گے تو اپنی ساری بادشاہت گنوا بیٹھو گے اور حقیر ترین غلام بن جاؤ گے۔ سمجھ رہے ہو؟ اگر کوئی شاخ بھی تمھارے بوجھ سے ٹوٹی اور تم گر پڑے تو بس تمھارا خاتمہ ہے!''

''میں ساری زندگی کسی درخت سے نہیں گرا!''

''نہیں، بے شک، لیکن اگر تم گر ہی پڑے تو فوراً راکھ ہو جاؤ گے اور ہوا تمھیں اُڑا لے جائے گی۔''

''یہ سب پریوں کی کہانیاں ہیں۔ میں زمین پر اس لیے نہیں آؤں گا کیونکہ میں آنا نہیں چاہتا۔''

''اوہ، کیسے بور ہو تم!''

''نہیں نہیں، آؤ کھیلتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کیا میں تمھارے جھولے پر آ سکتا ہوں؟''

''ہاں، اگر تم زمین کو چھوئے بغیر اس پر بیٹھ سکو۔''

ویولا کے جھولے کے پاس، اسی شاخ پر ایک اور جھولا بندھا تھا مگر آپس میں ٹکرانے سے بچانے کے لیے اسے اوپر اٹھا کر رسیوں میں گرہ باندھ دی گئی تھی۔ کوسیمو ایک رسی کو پکڑتے ہوئے شاخ سے نیچے آیا— وہ اس مشق میں بہت اچھا تھا کیونکہ ہماری والدہ نے اسے بہت سارے جسمانی کرتب کروائے تھے— گرہ تک پہنچ کر اسے کھولا اور جھولے پر کھڑا ہو گیا۔ اپنے آپ کو حرکت دینے کے لیے اس نے گھٹنے موڑے اور اپنے بدن کے زور سے جھولے کو آگے پیچھے جھولے دینے لگا، اور اس طرح

Scanned with CamScanner

اونچا اور اونچا ہوتا گیا۔ آدھے راستے میں ایک دوسرے کے برابر سے گزرتے ہوئے دونوں جھولے اب یکساں بلندی پر مخالف سمتوں میں جارہے تھے۔

''لیکن اگر تم بیٹھنے کی کوشش کرو اور پیروں کی مدد سے اپنے آپ کو دھکیلو تو زیادہ بلندی تک جاؤ گے،'' ویولا نے کہا۔

کوسیمو نے اس کا منھ چڑایا۔

''اچھا اب نیچے آ کر ذرا مجھے جھلاؤ، چلو، جھلاؤ نا!'' ویولا نے شیریں مسکراہٹ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نے کہہ دیا میں کسی قیمت پر نیچے نہیں آؤں گا...'' کوسیمو اب پھر زچ ہونے لگا تھا۔

''پلیز!''

''نہیں!''

''آہا! تم قریب قریب دام میں آ ہی گئے تھے! اگر تم زمین پر پاؤں رکھ دیتے تو سب کچھ گنوا بیٹھتے!'' ویولا جھولے سے اتری اور کوسیمو کے جھولے کو چھوٹے چھوٹے ہلورے دینے لگی۔ ''اوہ!'' کوسیمو جس جھولے پر کھڑا تھا ویولا نے اچانک اس کی نشست پر جھپٹا مارا اور اسے الٹ دیا۔ خوش قسمتی سے رسیوں پر کوسیمو کی گرفت مضبوط تھی۔ ورنہ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح زمین پر آ رہتا۔

''دغاباز!'' وہ چیخا اور جھولے کی رسیوں کے سہارے دوبارہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا، مگر اوپر جانا نیچے آنے کی نسبت کہیں زیادہ مشکل تھا، خاص کر جبکہ سنہرے بالوں والی لڑکی رسیوں کو خباثت سے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

آخر کار وہ بڑی شاخ تک پہنچ گیا اور اس کے دونوں طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

''آہ! آہ! تم مجھے نہیں پکڑ سکیں!''

''بچ گئے۔''

''میں تمھیں دوست سمجھا تھا!''

''ہاں واقعی!'' اور وہ خود کو پنکھے سے دوبارہ ہوا دینے لگی۔

''ویولانتے!'' اسی لمحے ایک تیز نسوانی آواز نے مداخلت کی۔ ''کس سے باتیں کر رہی ہو؟''

بہت چوڑا اسکرٹ پہنے ایک لانبی، دبلی خاتون مکان کو جانے والے سفید زینے پر نمودار ہوئی۔ وہ ایک دستہ دار چشمے میں سے دیکھ رہی تھی۔ کوسیمو چوکنا ہو کر پیچھے پتوں میں ہٹ آیا۔

''ایک نوجوان سے خالہ جان،'' نوعمر لڑکی نے کہا، ''وہ ایک درخت کی چوٹی پر پیدا ہوا تھا۔ اس پر کسی جادو کا اثر ہے۔ وہ زمین پر پاؤں نہیں رکھ سکتا۔''

کوسیمو نے، جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا، اپنے آپ سے پوچھا: کیا ننھی لڑکی اپنی خالہ کے سامنے اس کا مذاق اُڑانے کے لیے یہ باتیں کر رہی ہے یا اس کے سامنے خالہ کا مذاق اُڑانے کے لیے، یا محض کھیل جاری رکھنے کے لیے، یا اس لیے کہ اسے کوسیمو کی ذرہ بھر پروا ہے نہ خالہ کی، اور نہ ہی کھیل کی؟ اس نے دیکھا کہ دستہ دار چشمے کے ذریعے اسے غور سے دیکھا جا رہا ہے جس کی مالکہ درخت کے قریب آ گئی تھی اور اسے یوں گھور رہی تھی گویا کہ وہ کوئی عجیب تو تا ہو۔

''میرے خیال میں یہ نوجوان پیوواسکو خاندان کا کوئی فرد ہے۔ آؤ، ویولانتے۔''

کوسیمو نے شرم سے اپنا سر جھکا۔ خالہ نے اپنے آپ سے بھی پوچھے بغیر کہ وہ وہاں اوپر کیوں موجود تھا، جس انداز سے اسے بآسانی پہچان لیا، اور جس انداز سے لڑکی کو آواز دی اور ویولا جس انداز سے اپنی خالہ کی آواز پر، پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر، فرمانبرداری سے چل پڑی، ان ساری باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے کسی اہمیت کے قابل نہیں سمجھتیں۔ ان کی نظر میں وہ مشکل ہی سے وجود رکھتا تھا اور اس طرح اس کی وہ غیر معمولی سہ پہر ایک خود ترحمی کے بادل میں گم ہوتی معلوم ہونے لگی۔

تب اچانک لڑکی نے اپنی خالہ کو اشارہ کیا۔ خالہ نے اپنا سر جھکایا اور بچی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ خالہ نے اپنے دستہ دار چشمے سے کوسیمو کی طرف اشارہ کیا۔ ''اچھا، نوجوان!'' وہ بولی۔ ''کیا تم ہمارے ساتھ چاکلیٹ کا ایک کپ پینا پسند کرو گے؟ پھر ہم بھی تم سے تعارف حاصل کر سکیں گے،'' اور یہاں اس نے ویولا پر ایک ترچھی نظر ڈالی، ''کیونکہ تم پہلے ہی اس خاندان کے دوست بن گئے ہو۔''

کوسیمو درخت پر بیٹھا خالہ اور بھانجی کو دیدے پھاڑے گھورتا رہا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ علاقے کا سب سے پُرنخوت خاندان، اوبروسا کا اوندار یوا خاندان، اسے مدعو کر رہا تھا! لمحہ بھر پہلے کی تذلیل فتح میں بدل گئی تھی۔ دشمنوں کی اس دعوت کے ذریعے وہ اپنے باپ پر، جو ہمیشہ اسے لعن طعن کرتا تھا، حاوی ہو رہا تھا۔ ویولا نے اس کی سفارش کی تھی اور وہ باضابطہ طور پر اس کا دوست تسلیم کر لیا

گیا تھا، اور وہ اس باغ میں، جو دوسرے تمام باغوں سے یکسر مختلف تھا، اس کے ساتھ کھیلے گا۔ کوسیمو نے یہ سب کچھ محسوس کیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس مخالف ہر چند کہ گڈمڈ جذبے کو بھی محسوس کیا جو شرم، غرور، تنہائی اور عزم سے عبارت تھا، اور جذبات کے اس تضاد کے درمیان، میرا بھائی اوپر والی شاخ کو پکڑ کر اس پر چڑھا اور گھنے پتوں والے حصے میں ہوتا ہوا ایک اور درخت پر جا کے غائب ہو گیا۔

۳

وہ سہ پہر بے انت تھی۔ ہم بار بار باغ میں کسی چیز کے گرنے یا سرسرانے کی آواز سنتے تو اس امید میں باہر دوڑ پڑتے کہ یہ وہی ہے اور اس نے نیچے آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ مگر نہیں۔ میں نے میکنولیا کی چوٹی پر ایک جنبش دیکھی، دیوار کی دوسری طرف سے کوسیمو نمودار ہوا اور پار کر کے ادھر آ گیا۔

میں اس سے ملنے شہتوت کے پاس گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ برہم نظر آیا۔ وہ مجھ سے ابھی تک خفا تھا۔ وہ عین میرے اوپر شہتوت کی ایک شاخ پر بیٹھ گیا اور اپنے نیمچے سے چھال کے ٹکڑے تراشنے لگا گویا کہ مجھ سے بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

''شہتوت کا درخت آسان ہے،'' میں نے محض کچھ کہنے کی خاطر بے ساختہ کہا، ''ہم کبھی پہلے اس پر نہیں چڑھے...''

وہ نیمچے کے پھل سے شاخ کو چھیلتا رہا۔ پھر تلخی سے بولا، ''تو پھر، تم نے گھونگھوں کا مزہ اڑا لیا؟''

میں نے ایک ٹوکری آگے بڑھائی۔ ''میں تمھارے لیے کچھ خشک انجیر لایا ہوں، مینو، اور میوے کا سموسہ بھی...''

''انھوں نے بھیجا ہے؟'' وہ اچانک بولا۔ وہ ابھی دور تھا مگر ٹوکری کو دیکھ کر للچا رہا تھا۔

''نہیں، مجھے اپے سے بچ کر آنا پڑا،'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''وہ چاہتے تھے میں تمام سہ پہر پڑھائی کرتا رہوں، سو میں تم سے ملنے نہیں آ سکا۔ لیکن بڑے میاں کو نیند آ گئی! اماں کو فکر ہے کہ تم گر نہ پڑو۔ وہ تمھیں تلاش کروانا چاہتی تھیں مگر چونکہ ابا نے کافی دیر سے تمھیں شاہ بلوط پر نہیں دیکھا ہے، ان کا کہنا تھا کہ تم نیچے آ گئے ہو اور کہیں چھپے ہوئے اپنے غلط کاموں پر کڑھ رہے ہو اور ہمیں تمھاری فکر نہیں

Scanned with CamScanner

کرنی چاہیے۔''

''میں بالکل بھی نیچے نہیں آیا!'' میرے بھائی نے کہا۔

''تم اوندار یوا کے باغ میں گئے تھے؟''

''ہاں، لیکن ہمیشہ ایک درخت سے دوسرے درخت پر، زمین پر پاؤں رکھے بغیر!''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اسے اپنا یہ اصول ظاہر کرتے سنا، لیکن اس نے یہ بات اس طرح کہی تھی گویا کہ یہ ہمارے درمیان پہلے سے طے ہو چکی ہو، گویا کہ وہ مجھے یقین دلانا چاہتا ہو کہ اس نے یہ اصول نہیں توڑا ہے۔ سو میں نے اپنے سوالوں پر اصرار کرنے کی جرأت نہیں کی۔

مجھے جواب دینے کے بجائے وہ بولا، ''جانتے ہو، اوندار یوا کا باغ دیکھنے میں کئی دن لگ سکتے ہیں۔ اگر تم درخت ہی دیکھنے لگو! امریکی جنگلوں سے لائے ہوئے درخت!'' پھر اسے یاد آیا کہ وہ مجھ سے خفا ہے لہٰذا اسے اپنی دریافتوں کے بارے میں مجھے نہیں بتانا چاہیے۔ اس نے اکھڑ پن سے بات ختم کر دی۔ ''بہر حال میں تمھیں وہاں نہیں لے جاؤں گا۔ آج کے بعد سے تم باتیستا یا کو الیئے کے ساتھ گھوما کرنا۔''

''نہیں، مینو، مجھے ضرور لے جانا،'' میں بے ساختہ بولا۔ ''گھونگھوں کے سلسلے میں مجھے الزام مت دو۔ وہ گندے تھے مگر میں ان سب کی لعن طعن برداشت نہیں کر سکا۔''

کوسیمو میوے کا سموسہ جلدی جلدی کھا رہا تھا۔ ''میں تمھیں آزماؤں گا،'' وہ بولا۔ ''تمھیں یہ ثابت کرنا ہوگا کہ تم میری طرف ہو، ان کی طرف نہیں۔''

''مجھے بتاؤ، تمھیں کیا چیز چاہیے۔''

''مجھے کچھ رسیاں لا دو، لمبی اور مضبوط، کیونکہ یہاں اوپر کچھ جگہیں پار کرنے کے لیے مجھے اپنی کمر میں رسی باندھنی پڑے گی، اور ہاں، ایک چپّو کا کنڈا، اور آنکڑے، اور کیلیں... بڑی والی۔''

''تم بنانا کیا چاہتے ہو؟ کرین؟''

''ہمیں بہت سی چیزیں اوپر لانے کی ضرورت ہوگی، ہم بعد میں دیکھیں گے، تختے، بانس...''

''تم درخت پر رہنے کی جگہ بنانا چاہتے ہو! کہاں؟''

''اگر ضرورت پڑی۔ جگہ ہم بعد میں طے کر لیں گے۔ اس دوران تم میری چیزیں وہاں کھو کھلے

Scanned with CamScanner

بلوط میں رکھ سکتے ہو۔ پھر میں رسّی کے ذریعے ٹوکری کو نیچے کر دوں گا اور جو کچھ مجھے چاہیے ہوگا تم اس میں رکھ دینا۔''

''لیکن کیوں؟ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے بہت دنوں تک چھپے رہو گے... تم نہیں سمجھتے کہ وہ تمھیں معاف کر دیں گے؟''

وہ میری طرف مڑا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ''مجھے کیا پروا ہے وہ مجھے معاف کریں یا نہ کریں؟ اور میں چھپ نہیں رہا ہوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا! تم اپنی کہو، میری مدد کرنے سے ڈرتے ہو؟''

اگرچہ اب میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرا بھائی فی الحال نیچے آنے سے انکار کر رہا ہے، مگر میں نے یہ بات نہ سمجھنے کا بہانہ کیا تاکہ وہ اپنے ارادے کا اعلان کرنے پر مجبور ہو اور کہے، مثلاً، ہاں، میں سہ پہر کی چائے تک درختوں میں رہنا چاہتا ہوں، یا جھٹ پٹے تک، یا شام کے کھانے تک، یا اندھیرا ہونے تک، یعنی درحقیقت کوئی ایسی بات جو اس کے احتجاج کی کسی حد، کسی تناسب کو ظاہر کرے۔ لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی اور مجھے تشویش محسوس ہونے لگی۔

نیچے سے پکارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ ہمارے ابا تھے جو ''کوسیمو! کوسیمو!'' چلّا رہے تھے، مگر پھر یہ محسوس کر کے کہ وہ جواب نہیں دے گا، ''بیاجیو! بیاجیو!'' پکارنے لگے۔ وہ مجھے بلا رہے تھے۔

''میں جا کے دیکھتا ہوں انھیں کیا چاہیے۔ پھر میں تمھیں بتانے آؤں گا،'' میں نے جلدی سے کہا۔ بھائی کو مطلع رکھنے کی یہ سرگرمی، مجھے تسلیم کرنا چاہیے، وہاں سے ہٹنے کی عجلت سے بھی مطابقت رکھتی تھی جس کا سبب اس کے ساتھ شہتوت پر بیٹھے ہوئے پکڑے جانے اور اسے یقینی طور پر ملنے والی سزا میں حصے دار بننے کا خوف تھا۔ لیکن کوسیمو میرے چہرے پر بزدلی کا یہ سایہ نہ دیکھ سکا۔ اس نے مجھے جانے دیا لیکن یہ دکھانے کے لیے کہ ابا کو جو کہنا ہے وہ اسے ذرا اہمیت نہیں دیتا، اس نے اپنے کندھے اچکائے۔

جب میں لوٹا تو وہ ابھی وہیں تھا۔ اس نے ڈیرا ڈالنے کے لیے ایک تراشیدہ شاخ پر اچھی جگہ ڈھونڈ لی تھی، وہ اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے بیٹھا تھا اور بازو پنڈلیوں کے گرد مضبوطی سے باندھ رکھے تھے۔

''مینو! مینو!'' میں نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ درخت پر چڑھتے ہوئے پکارا، ''انھوں نے تمھیں معاف کر دیا ہے! وہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں! چائے میز پر آ گئی ہے، ابا اماں بیٹھ چکے ہیں اور پلیٹوں میں کیک کے ٹکڑے رکھ رہے ہیں۔ کریم اور چاکلیٹ والا کیک ہے جو، تمھیں پتا ہے، باتیستا کا

Scanned with CamScanner

بنایا ہوا نہیں ہے۔ اس نے ضرور غصّے سے لال ہو کر خود کو کمرے میں بند کر لیا ہوگا! انھوں نے میرا سر سہلاتے ہوئے کہا: جاؤ، بے چارے مینو کو بتاؤ کہ ہم سب باتوں کی تلافی کر دیں گے اور پھر کبھی اس کا ذکر نہیں کریں گے۔ جلدی کرو، آؤ چلیں!''

کوسیمو ایک پتّا چبا رہا تھا۔ اس نے جنبش نہیں کی۔

''ارے،'' وہ بولا۔ ''ایک کمبل تو لانے کی کوشش کرو، لاؤ گے؟ کسی کے دیکھے بغیر مجھے دے جانا۔ یہاں اوپر رات کو یقیناً ٹھنڈ ہوگی۔''

''تم درختوں میں رات گزارنے جا رہے ہو!''

اس نے جواب نہیں دیا۔ ٹھوڑی گھٹنوں پر دھرے، پتا چباتے ہوئے، وہ سامنے کی سمت دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا جو سیدھی اوندار یوا کے باغ کی دیوار تک جا رہی تھی، بالکل اس جگہ جہاں میکولیا کا سفید پھول اور اس سے پرے ایک پتنگ اڑتی دکھائی دے رہی تھی۔

اس طرح ہماری شام ہوئی۔ نوکر آئے اور کھانا لگانے لگے۔ ڈائننگ روم میں شمع دان پہلے ہی روشن ہو چکے تھے۔ کوسیمو یہ سب کچھ درخت سے ضرور دیکھ سکتا ہوگا۔ بیرن آرمینیو کھڑکی کے باہر سایوں کی جانب مڑے اور پکار کر بولے، ''اگر تم اوپر ہی رہنا چاہتے ہو تو بھوکے مرو گے!''

اس شام ہم پہلی بار کوسیمو کے بغیر کھانا کھانے بیٹھے۔ وہ شاہ بلوط کی ایک اونچی شاخ پر ٹانگیں لٹکائے پہلو کے بل اس طرح بیٹھا تھا کہ ہم اس کی لٹکتی ہوئی ٹانگیں ہی دیکھ سکتے تھے، اور وہ بھی کھڑکی سے باہر جھک کر بغور دیکھنے کی صورت میں، کیونکہ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور باہر اندھیرا تھا۔

اور تو اور، کوالیئے نے بھی باہر جھک کر کچھ کہنا اپنا فرض سمجھا لیکن اس معاملے پر حسبِ معمول کسی رائے کا اظہار کرنے سے قاصر رہا۔ بس یہی کچھ کہہ پایا، ''اوہ... مضبوط لکڑی ہے۔ سو برس تو چلے گی...'' اور پھر چند الفاظ اس نے ترکی میں ادا کیے، غالباً شاہ بلوط کا کوئی مترادف۔ درحقیقت، وہ میرے بھائی کے بارے میں نہیں، درخت کے بارے میں باتیں کرتا معلوم ہوتا تھا۔

دوسری طرف ہماری بہن باتیستا، جو گھر والوں کو اپنی عجیب و غریب ترنگوں سے مخمصے میں رکھنے کی عادی تھی، کوسیمو کے لیے ایک طرح کا رشک دکھا رہی تھی، گویا اسے اپنی ہی بازی میں پیچھے چھوڑ دیا

Scanned with CamScanner

گیا ہو۔ وہ مستقل طور پر اپنے ناخن کاٹ رہی تھی (ناخن کاٹنے کے لیے وہ انگلی منھ تک نہیں لاتی تھی بلکہ اپنا سر جھکا کر کہنی بلند کیا کرتی تھی)۔

جنرلیسا کو کچھ سپاہی یاد آ گئے جنھوں نے سلاوونیا، یا شاید پومیرانیا میں کسی پڑاؤ کے گرد درختوں پر چڑھ کر پہرہ دیتے ہوئے، دشمن کو آتے دیکھ لیا تھا، اور یوں ممکنہ گھات کو ٹال دیا تھا۔ اسے یہ یاد بالکل اچانک طور پر مادرانہ انہماک سے نکال کر اس کے پسندیدہ فوجی ماحول میں لے گئی اور اب، گویا اپنے بیٹے کا رویہ سمجھنے میں آخر کار کامیاب ہو گئی ہو، وہ پرسکون بلکہ بڑی حد تک مفتخر دکھائی دینے لگی، مگر ایسے فوشیلی فلیئر کے سوا کسی نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جنرلیسا کی جنگی کہانی اور اس سے اخذ شدہ نتیجے کو بڑی سنجیدہ رضامندی سے سن رہا تھا، کیونکہ اپنے آپ کو یہ سمجھانے کے لیے کہ جو کچھ ہو رہا ہے فطری ہے، وہ کسی بھی دلیل کو اچک لینے اور یوں اپنے ذہن کو ذمے داری اور فکرمندی سے آزاد کر لینے پر آمادہ تھا۔

اس رات بھی اپنے معمول کو بدلے بغیر ہم کھانے کے بعد جلدی سونے چلے گئے۔ اس وقت تک ہمارے والدین طے کر چکے تھے کہ وہ کوسیمو کو اس کی پروا کیے جانے کی تسکین فراہم نہیں کریں گے بلکہ اسے نیچے لانے کے لیے تکان، بے آرامی اور رات کی سرد ہوا کا انتظار کریں گے۔ ہر ایک سونے کو لیٹ گیا۔ باہر سے دیکھے جانے پر شمع دان کی روشنی کھڑکیوں میں سے چمکتی سنہری آنکھوں کی طرح لگ رہی ہوگی۔ اس مکان سے، جو اتنا مانوس اور عزیز تھا، سکھ اور محبت کی کیا کیا یادیں رات کی خنکی میں سے رس کر میرے بھائی تک پہنچی ہوں گی! میں کمرے کی کھڑکی سے باہر جھکا اور اس کے سائے کو شاہ بلوط کے ایک خلا پر جھکے دیکھا۔ وہ کمبل میں لپٹا تھا اور، میرا خیال ہے، گرنے سے بچنے کے لیے رسّی سے بندھا ہوا تھا۔

دیر سے نکلنے والا چاند شاخوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ چڑیاں، اُس کی طرح گٹھری بنی، اپنے گھونسلوں میں سو رہی تھیں۔ رات، کھلی فضا اور باغ کی خاموشی، دور کی آوازوں، پتوں کی سرسراہٹ اور درختوں میں ہوا کے گزر سے ٹوٹ ٹوٹ جاتی۔ کبھی کبھار بہت فاصلے سے پانی کی سرسراہٹ سنائی دیتی۔ یہ سمندر کی آواز تھی۔ میں نے اپنی کھڑکی سے ان منتشر انفاس کو سنا اور گھر کے مانوس پس منظر کے تحفظ کے بغیر، جہاں سے وہ صرف چند گز کے فاصلے پر تھا، ان کے سنے جانے کا تصور کیا۔ اُس کے چاروں طرف فقط رات تھی اور سہارے کے لیے واحد دوستانہ شے ایک درخت کی کھردری چھال، جو لاتعداد چھوٹی چھوٹی سرنگوں سے چھلنی اور کیڑے مکوڑوں سے بھری تھی۔

Scanned with CamScanner

میں سونے کو لیٹ گیا لیکن میں نے شمع گل نہیں کی، کہ شاید اُس کے اپنے کمرے کی کھڑکی سے چھنتی یہ روشنی اس کی دمساز رہے۔ ہم ایک ہی کمرے میں رہتے تھے جس میں دو چھوٹی چارپائیاں تھیں۔ میں نے اس کے پلنگ کو دیکھا، جو اَن چھوا تھا، اور پھر کھڑکی سے باہر تاریکی پر نظر ڈالی جہاں وہ موجود تھا؛ اور ایک گرم و سپید بستر میں ننگے پیروں کے ساتھ بے لباس ہونے کے لطف کو غالباً پہلی بار محسوس کر کے، چادروں کے درمیان کروٹ لی اور ٹھیک اسی وقت اُس بے آرامی کو بھی محسوس کیا جس میں وہ اپنے کھردرے کمبل میں لپٹا، ساق پوشوں میں جکڑی ٹانگوں کے ساتھ، کروٹ بدلنے سے معذور، دکھتی ہوئی ہڈیاں لیے، وہاں اوپر رسیوں سے بندھا ہوا تھا۔ بستر، اجلی چادریں اور نرم گدا میسر ہونے پر اپنی خوش قسمتی کا احساس ایک ایسی شے ہے جو اس رات سے مستقل طور پر میرے ساتھ رہا ہے۔ اپنے ذہن میں، جو اتنی دیر سے اور اتنے مکمل طور سے اُس شخص پر مرکوز تھا جو ہم سب کے ذہنوں پر سوار تھا، یہی خیال لیے میں اونگھتے اونگھتے سو گیا۔

۴

میں نہیں جانتا کتابوں میں کہی گئی یہ کہانی کہاں تک درست ہے کہ اگلے وقتوں میں بندر، زمین کو ایک بار بھی چھوئے بغیر، ایک درخت سے دوسرے پر کودتے پھلانگتے روم سے اسپین پہنچ جایا کرتے تھے۔ میرے زمانے میں اتنے زیادہ درختوں سے بھری واحد جگہ اومبروسا کی خلیج کی پوری لمبائی، ایک سرے سے دوسرے سرے تک، اور اس کی وادی تھی، جو پہاڑ کی چوٹیوں تک چلی گئی تھی۔ اس بات کے لیے یہ علاقہ ہر جگہ مشہور تھا۔

اِن دنوں یہ علاقہ بہت بدل چکا ہے۔ لوگوں نے درخت فرانسیسیوں کی آمد کے بعد کاٹنے شروع کیے گویا کہ درخت نہ ہوئے گھاس ہوئی جو ہر سال کاٹی جاتی ہے اور پھر اُگ آتی ہے۔ درخت دوبارہ نہیں اُگے۔ پہلے پہل ہمارا خیال تھا کہ درخت کٹنے کا تعلق جنگ سے، نپولین سے، اور اس عہد سے ہے؛ لیکن درخت تراشی اس کے بعد بھی جاری رہی۔ اب پہاڑی علاقے اتنے تہی ہو چکے ہیں کہ ہم جنھوں نے انھیں پہلے دیکھا ہے، انھیں دیکھ کر صدمہ محسوس کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

بہر حال اُن دنوں ہم جہاں کہیں جاتے، ہمارے اور آسمان کے درمیان ہمیشہ پتے اور شاخیں ہوتیں۔ زمین سے نزدیک اُگنے والے درخت صرف لیموں کے تھے لیکن ان کے درمیان بھی انجیر کے درختوں کی بل کھائی ہوئی شکلیں اُبھری ہوتی تھیں اور ان کے گھنے پتوں والے گنبد پہاڑیوں تک پھیلے میوہ زاروں پر محرابیں بنائے رہتے۔ ان میں چیری، نرم بہی، شفتالو، بادام یا ناشپاتی کے چھوٹے پیڑوں کے علاوہ آلوچے کے بڑے درخت تھے بلکہ سنجد اور خرنوب کے درخت بھی تھے۔ کہیں کہیں ایک آدھ شہتوت کا پیڑ یا اخروٹ کا گانٹھ دار درخت بھی ہوتا۔ جہاں میوہ زار ختم ہوتے وہاں زیتونوں کے خاکستری نقرئی جھنڈ شروع ہو جاتے جو گچھوں کی شکل لیے ہوئے بادل کی طرح نصف دامنِ کوہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ پس منظر میں گاؤں تھا جو بندرگاہ اور پہاڑی کے درمیان اس طرح دبکا ہوا تھا کہ اس کے نشیب میں بندرگاہ اور بلندی پر پہاڑی تھی اور وہاں بھی چھتیں درختوں کی چوٹیوں سے مزین تھیں، جو چیڑ اور بلوط کے، مغرور اور الگ تھلگ منظم ہجوم کی شکل میں، اس طرف کو مڑتے ہوئے درخت تھے جہاں امرا نے اپنی حویلیاں بنا رکھی تھیں اور اپنے باغات کے گرد چار دیواریاں اٹھا رکھی تھیں۔

زیتونوں سے اوپر جنگل شروع ہوتے تھے۔ کسی زمانے میں اس سارے علاقے پر چیڑ کے پیڑوں کا غلبہ رہا ہوگا کیونکہ اکا دکا جھنڈ نشیب کے ساتھ ساتھ ساحلوں تک یہاں وہاں ابھی تک اُگے ہوئے تھے۔ اس زمانے کے بلوط، ان بلوطوں کی نسبت جو مجھے آج نظر آتے ہیں، توانا ہوتے تھے، کیونکہ وہی کٹائی کا پہلا، سب سے قیمتی شکار تھے۔ ذرا اور بلندی پر صنوبروں نے شاہ بلوطوں کے لیے جگہ خالی کر دی تھی جو اوپر ہی اوپر جہاں تک نظر جاتی تھی، دامنِ کوہ تک چلے گئے تھے۔ یہ وہ عرقِ حیات کی دنیا تھی جس کے بیچ ہم، اومبروسا کے ساکن، تقریباً اس پر توجہ دیے بغیر رہتے تھے۔

ان ساری باتوں پر سوچ بچار کرنے والا پہلا شخص کوسیمو تھا۔ اس نے ادراک کیا کہ درخت اس قدر گھنے ہیں کہ وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جاتے ہوئے زمین پر اترنے کی ضرورت سے بے نیاز رہ کر میلوں تک جا سکتا ہے۔ بعض اوقات عریاں میدان کا کوئی ٹکڑا اسے لمبے چکر کاٹنے پر مجبور کر دیتا لیکن وہ جلد ہی تمام ضروری راستے جان گیا اور اس پیچ و خم سے پُر راہ کو ہمیشہ ذہن میں رکھتے ہوئے جو اسے شاخوں پر اختیار کرنی ہوتی تھی، ہمارے اندازوں سے بالکل مختلف حساب سے فاصلوں کی پیمائش کرنے لگا، اور جہاں وہ سب سے نزدیکی شاخ پر چھلانگ کے ذریعے بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، وہاں اپنی ہی خاص

Scanned with CamScanner

ترکیبیں استعمال کرنے لگا۔ لیکن یہ سب میں بعد میں بیان کروں گا۔ ابھی ہم صرف اس پہلے سویرے تک پہنچے ہیں جب اس نے آنکھ کھلنے پر اپنے آپ کو پر پھڑ پھڑاتی میناؤں کے درمیان، ٹھنڈی اوس میں تربتر، اکڑے ہوئے منجمد بدن کے ساتھ ایک شاہ بلوط پر پایا، اس حال میں کہ اس کی ہڈیاں دُکھ رہی تھیں اور ٹانگیں اور بازو ٹیسوں سے جھنجھنا رہے تھے، اور خوشی خوشی ایک نئی دنیا دریافت کرنے کی راہ پر چل پڑا۔

وہ باغ کے آخری درخت تک پہنچا جو شیشم کا تھا۔ اس کے نیچے دھند جیسے بادلوں اور چٹانوں کے پیچھے پتھر کے ڈھیروں کی طرح چھپی جھونپڑیوں کی پتھریلی چھتوں سے اٹھتے دھوئیں بھرے آسمان تلے، دور تک وادی پھیلی ہوئی تھی۔ چیری اور انجیر کے درختوں نے پتوں کا ایک اور آسمان بنا رکھا تھا۔ اس کے نیچے آڑو اور ناشپاتی کے درختوں کی پھیلی شاخیں آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ ہر چیز واضح اور روشن تھی، حتیٰ کہ گھاس کی پتی پتی بھی، ماسوائے مٹی اور اس پر رینگتے کدو کے پتے یا نقطے دار کاہو یا فصلوں کے روئیں کے۔ وادی ''وی'' سے ملتی جلتی جس شکل میں سمندر کے ایک اونچے قیف پر پھیلی تھی، اس کے دونوں پہلوؤں پر یہی صورت تھی۔

اس ارضی منظر میں ایک طرح کی لہر مرتعش تھی جو مرئی نہیں تھی، اور کبھی کبھار کے سوا قابل سماعت بھی نہیں تھی، لیکن جو کچھ سنائی دے سکتا تھا وہ ایک بے چینی کا احساس پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک اچانک تیز چیخ، اور پھر کسی گرتی ہوئی چیز کے ٹکرانے کی مدھم آواز اور غالباً کسی ٹوٹتی شاخ کی کڑکڑاہٹ بھی، اور ناراض آوازوں کی مزید چیخیں، جو اِس بار مختلف تھیں اور اس مقام پر مرتکز ہو رہی تھیں جہاں سے چیخ پہلے سنائی دی تھی۔ پھر کچھ بھی نہیں، فقط ایک معدومیت کا احساس، گویا کہ یہ سب کچھ جنگل کے کسی بالکل مختلف حصے میں پیش آ رہا ہو؛ اور درحقیقت آوازیں اور صدائیں اب دوبارہ آنے لگی تھیں لیکن وادی کی ایک طرف یا دوسری طرف سے آتی معلوم ہو رہی تھیں، ہمیشہ وہاں سے جہاں چیری کے درختوں کے دندانے دار چھوٹے چھوٹے پتے ہوا سے جنباں تھے، اور اس طرح کوسیمو نے، جس کے ذہن کا ایک حصہ اپنے طور پر بھٹک رہا تھا جبکہ ایک اور حصہ ان سب باتوں کو قبل از وقت جانتا اور سمجھتا محسوس ہوتا تھا، اپنے ذہن میں اس خیال کو کوندتے پایا: چیری کے پیڑ بولتے ہیں۔

اس نے قریب ترین چیری کے پیڑ، یا یوں کہیے پیڑوں کی قطار، کی طرف بڑھنا شروع کیا جو اونچے اور بہت سے سبز پتوں والے تھے اور سیاہ چیریوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لیکن میرے بھائی نے

ابھی تک اپنی آنکھ کو شاخوں پر موجود اور غیر موجود کا فوری فرق دیکھ لینے کی تربیت نہیں دی تھی۔ وہ ٹھہر گیا، آوازیں اب بند ہو گئی تھیں۔ وہ زیریں ٹہنیوں پر تھا اور اوپر کی ساری چیریوں کا وزن خود پر محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کی وجہ نہیں بتا سکتا تھا مگر وہ اس پر مرتکز ہوتی معلوم ہو رہی تھیں جیسے وہ درحقیقت ایک ایسے درخت پر ہو جہاں چیریوں کے بجائے آنکھیں ہی آنکھیں ہوں۔

کوسیمو نے اپنا چہرہ اٹھایا تو ایک زیادہ پکی ہوئی چیری ٹپ سے اس کے ماتھے پر گری۔ اس نے اوپر سورج کی سمت (جو اونچا ہوتا رہا تھا) دیکھنے کے لیے اپنی آنکھوں پر زور دیا تو دیکھا کہ جس درخت پر وہ ہے اور جو درخت آس پاس ہیں، سارے کے سارے بسیرا لیے ہوئے نوعمر لڑکوں سے بھرے ہیں۔

جب انھوں نے محسوس کیا کہ انھیں دیکھ لیا گیا ہے تو اپنی خاموشی توڑی اور ایک دوسرے کو تیز، گو دبی ہوئی آواز میں کچھ بتانے لگے جو یوں سنائی پڑتا تھا: ''ذرا دیکھو تو، اس نے کیا پہن رکھا ہے!'' پھر ان میں سے ہر ایک اپنے سامنے سے پتے ہٹاتے ہوئے، جس شاخ پر تھا اس سے نچلی شاخ پر، تین کونوں والا ہیٹ لگائے ہوئے لڑکے کی طرف اتر آیا۔ وہ ننگے سر تھے یا پھٹے ہوئے تنکوں کے ہیٹ پہنے تھے۔ کچھ نے تو اپنے سر ٹاٹ میں لپیٹ رکھے تھے۔ انھوں نے پھٹی ہوئی قمیصیں اور جانگیے پہن رکھے تھے۔ جو ننگے پیر نہیں تھے انھوں نے پیروں پر چیتھڑوں کی گندی دھجیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ اور ایک دو نے تو، آسانی سے چڑھنے کے لیے، کھڑاویں اتار کے گردن میں لٹکا رکھی تھیں۔ یہ پھل چوروں کا بڑا گروہ تھا جس سے، والدین کے احکام کی فرماںبرداری میں، کوسیمو اور میں جہاں تک ممکن تھا ہمیشہ دور رہے تھے۔ مگر اس صبح میرا بھائی ان کا منتظر معلوم ہوتا تھا حالانکہ اس کے ذہن میں اس ملاقات کے ماحصل کا کوئی زیادہ واضح تصور نہیں تھا۔

اپنی جانب ان کے نیچے اترنے کے دوران وہ ساکت کھڑا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس پر اس طرح کے کرخت جملے اچھالتے ہوئے کہ ''یہ اپنے خیال میں کیا کرنے جا رہا ہے، ہونہہ؟'' اس پر چیری کی گٹھلی تھوکتے یا کیڑوں اور پرندوں کی کھائی ہوئی کوئی چیری گھما کے پھینکتے جیسے غلیل سے پتھر مار رہے ہوں۔

''اوہ!'' اچانک وہ چلائے۔ اس کے پیچھے لٹکتا نیچہ انھوں نے دیکھ لیا تھا۔ ''ذرا دیکھو تو، اس کے پاس کیا ہے؟'' اور سب ٹھٹھا مار کے ہنس پڑے۔

پھر وہ رکے اور انھوں نے اپنی ہنسی کو گھونٹ دیا جیسے کوئی بہت ہی مزیدار بات واقع ہونے والی

Scanned with CamScanner

ہو۔ چھوٹے لڑکوں میں سے دو بہت خاموشی سے کوسیمو کے عین اوپر واقع شاخ پر آ گئے تھے اور اس کے سر پر ایک کھلی بوری کا منہ اوندھا رہے تھے، جو ان غلیظ بوریوں میں سے ایک تھی جسے انھوں نے اپنا مالِ غنیمت رکھنے کے لیے استعمال کیا ہوگا اور جنھیں خالی ہونے پر وہ اپنے سر اور شانوں پر سرپوش کی طرح رکھتے تھے۔

ذرا سی دیر میں میرے بھائی نے یہ جانے بغیر کہ ایسا کیونکر ہوا، اپنے آپ کو بوری میں لپٹا ہوا، اور پھر سموسے کی طرح بندھا ہوا پایا ہوتا، کہ وہ اس کی پٹائی کر سکیں۔ کوسیمو نے خطرہ بھانپ لیا، یا ہو سکتا ہے اس نے کچھ بھی نہ بھانپا ہو۔ یہ جان کر کہ وہ اس کے نیچے کا ٹھنٹول کر رہے ہیں اس نے اسے عزت کا معاملہ سمجھ کر بے نیام کر لیا۔ اس نے تیغ لہرایا تو اس کا پھل بوری میں چبھ گیا اور اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے دونوں چھوٹے چوروں کے ہاتھوں سے کھینچ کر دور اچھال دیا۔

یہ ایک اچھی چال تھی۔ دوسروں کے منہ سے اچانک ''او!'' کی آواز نکلی جو مایوسی کے ساتھ ساتھ حیرت کی بھی غماز تھی۔ وہ اپنی خاص بولی میں اُن دونوں کو گالیاں دینے لگے جنھوں نے بوری کو چھن جانے دیا تھا۔

مگر کوسیمو کو اس کامیابی کے لیے خود کو مبارک باد دینے کی مہلت نہیں ملی۔ کیونکہ اچانک ایک نئی ہلچل پیدا ہو گئی تھی جو اس بار نیچے زمین کی جانب سے تھی؛ کتوں کے بھونکنے کا شور، پتھروں کی بوچھاڑ اور ''اس بار نہیں بچو گے، غلیظ چورو!'' کے نعرے؛ دوشاخہ بلموں کی نوکیں اوپر تک پہنچ رہی تھیں۔ درخت پر بیٹھے لڑکے ٹانگیں اور کہنیاں سمیٹ کے شاخوں سے لپٹ گئے۔ کوسیمو کے گرد مچائے جانے والے غل نے نگرانی کرتے ہوئے باغبانوں کو ہوشیار کر دیا تھا۔

بڑی نفری کے ساتھ ہونے والے اس حملے کی پہلے سے تیاری کی گئی تھی۔ اس بات سے تنگ آ کر کہ ان کے پھل پکتے ہی چرا لیے جاتے ہیں، بہت سے چھوٹے زمینداروں اور کرایہ دار کسانوں نے ایک گروہ بنایا تھا کیونکہ چھوٹے لڑکوں کی حکمتِ عملی کا، جو کسی میوہ زار میں اکٹھے گھس کر لوٹ مار کرنے کے بعد مخالف سمت میں بھاگ جانے پر مبنی تھی، جواب خود اسی حکمتِ عملی کے استعمال میں مضمر تھا، یعنی سب مل کر اس میوہ زار پر نظر رکھیں جہاں لڑکوں کا جلد یا بدیر آنا لازم تھا اور انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیں۔ اب کتے، جن کی تھوتھنیوں پر سے چھینکے ہٹا دیے گئے تھے، چیری کے درختوں سے لگے، غراتے ہوئے، اپنے

عریاں دانت کچکچا رہے تھے جب کہ بھوسا کریدنے والی ترنگلوں کے پھل ہوا میں لہرائے جا رہے تھے۔ چھوٹے چوروں میں سے تین چار، سہ شاخہ بلموں سے اپنی کمر چھدوانے اور اپنے چوتڑوں پر کتوں سے کٹوانے کے لیے، بالکل عین وقت پر زمین پر کود پڑے اور چیختے چلاّتے اور لڑکھڑاتے ہوئے انگور کی بیلوں میں بھاگ گئے۔ اوروں نے نیچے آنے کی ہمت نہیں کی۔ وہ جہاں تھے وہیں رکے کانپتے رہے۔ کوسیمو بھی انھیں میں تھا۔ پھر باغبان درختوں کے ساتھ سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھنے لگے۔ ان کے آگے آگے دو شاخہ بلموں کی نوکیں تھیں۔

کوسیمو کو یہ سمجھنے میں چند ثانیے لگے کہ محض لڑکوں کی دہشت زدگی اس کے لیے دہشت زدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس کے لیے یہ سوچنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ لڑکے چالاک ہیں اور وہ خود نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ وہ احمقوں کی طرح وہاں بیٹھے رہ گئے تھے، اس بات کا کافی ثبوت تھا۔ وہ آس پاس کے درختوں پر کیوں نہیں نکل گئے؟ میرا بھائی وہاں ایک راستے سے ہو کر پہنچا تھا، لہٰذا اسی راستے سے بھاگ بھی سکتا تھا۔ اس نے اپنے سر پہ ہیٹ نیچے کھینچ لیا اور اس شاخ کو تلاش کیا جسے پل کی طرح استعمال کیا تھا، اور چیری کے آخری درخت سے ایک خرنوب پر پہنچ گیا۔ پھر خرنوب سے لٹکتا ہوا ایک آڑو کے درخت پر اتر گیا اور اسی طرح آگے بڑھتا رہا۔ اوروں نے جب اسے شاخوں پر کسی ماہر کی طرح بڑھتے دیکھا تو محسوس کیا کہ انھیں اس کے بالکل پیچھے پیچھے جانا چاہیے ورنہ وہ اس کا راستہ کبھی نہ پا سکیں گے۔ سو وہ خاموشی سے چاروں ہاتھ پیروں پر اس کے معلق راستے پر بڑھنے لگے۔ اس دوران وہ ایک انجیر کے درخت پر چڑھ کر، ایک کھیت کے کنارے کنارے ہوتا ہوا، ایک آڑو کے درخت پر اتر آیا تھا جس کی شاخیں اتنی نازک تھیں کہ لڑکوں کو ایک ایک کر کے گزرنا پڑا۔ وہ آڑو کے درخت پر محض ایک زیتون کے بل کھائے تنے کو پکڑنے کے لیے چڑھتے تھے۔ زیتون پر سے وہ ایک بلوط پر کود گئے جس کی ایک موٹی شاخ چشمے کے اوپر بڑھی ہوئی تھی، اور اس طرح دوسرے کنارے کے درختوں پر پہنچ گئے۔

دو شاخہ بلم لیے ہوئے آدمیوں نے، جن کا خیال تھا کہ انھوں نے پھل چوروں کو آخر کار پکڑ لیا ہے، انھیں پرندوں کی طرح ہوا میں زقندیں بھر کر فرار ہوتے دیکھا۔ انھوں نے بھونکتے کتوں کے درمیان دوڑتے ہوئے ان کا پیچھا کیا، مگر انھیں باڑ کے گرد گھوم کر آنا پڑا، پھر دیوار پھاندنی پڑی، پھر چشمے

Scanned with CamScanner

کے اِدھر ایک مقام پر، جہاں پل نہیں تھا، پایاب جگہ ڈھونڈنے میں وقت گنوانا پڑا، اور جب آخرکار وہ اس پار پہنچے تو انھوں نے لڑکوں کو دور فاصلے پر بھاگتے دیکھا۔

ان کے پاؤں زمین پر تھے اور وہ انسانوں کی طرح بھاگ رہے تھے۔ صرف میرا بھائی شاخوں پر رہ گیا تھا۔ "وہ ساق پوشوں والا جھانپو کہاں گیا؟" اسے اب تک آگے نہ دیکھ کر انھوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ انھوں نے اوپر نظر دوڑائی۔ وہ زیتونوں میں اپنا راستہ بنا رہا تھا۔ "ارے، تم نیچے آؤ۔ اب ہم نے ان سے چھٹکارا پا لیا ہے!" لیکن نیچے آنے کے بجائے وہ شاخ در شاخ، ایک سے دوسرے زیتون پر پھلانگتا رہا یہاں تک گھنے نقرئی پتوں کے درمیان نظر سے اوجھل ہو گیا۔

ننھے آوارہ گردوں کی ٹولی، سروں پر بوریاں اور ہاتھوں میں بید لیے، اب وادی کے نشیب میں واقع چیری کے درختوں پر حملہ زن تھی۔ وہ ایک شاخ کے بعد دوسری شاخ کو پھلوں سے خالی کرتے ہوئے منظم طریقے سے کام کر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر ساق پوش لڑکے پر پڑی، جو سب سے اونچے درخت کے اوپری حصے پر آلتی پالتی مارے، چیری کے گچھے توڑ توڑ کر اپنی گود میں رکھے ہیٹ میں ڈال رہا تھا۔ "ارے، تم یہاں کیسے پہنچے؟" انھوں نے ہیکڑی سے پوچھا۔ مگر وہ خوش نہیں تھے کیونکہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اڑ کر وہاں آیا ہو۔

میرا بھائی اب اپنے ہیٹ سے ایک ایک کر کے چیریاں نکال کر اپنے منھ میں اس طرح رکھ رہا تھا جیسے وہ مٹھائی کی ڈلیاں ہوں۔ پھر وہ ہونٹوں سے گٹھلیاں احتیاط کے ساتھ تھوک دیتا مبادا وہ اس کی واسکٹ کو داغ دار کر دیں۔

"یہ کیک خور،" ایک لڑکا بولا، "ہم سے کیا چاہتا ہے؟ یہ ہمیں کس لیے پریشان کرنے آیا ہے؟ یہ اپنے باغ میں جا کر چیریاں کیوں نہیں کھاتا؟" لیکن وہ قدرے خجل تھے کہ درختوں پر چڑھنے میں وہ ان سب سے کہیں تیز تھا۔

"آئس کریم کھانے والوں میں،" ایک اور بولا، "کبھی کبھی غلطی سے کوئی کائیاں اتفاقاً ظاہر ہو ہی جاتا ہے، مثال کے طور سنفوروزا کو ہی لو..."

اس پراسرار نام پر کوسیمو کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ، نہ معلوم کیوں، شرما گیا۔

Scanned with CamScanner

"سنفو روزا نے ہم سے غداری کی،" ایک اور لڑکا بولا۔

"لیکن وہ تیز تھی، کیک خور ہو کر بھی تیز تھی۔ اور آج صبح اگر وہ اپنا بھونپو بجانے کو موجود ہوتی تو وہ ہمیں پکڑ نہ پاتے۔"

"بلاشبہ کیک کھانے والے بھی، اگر وہ ہماری طرف ہوں تو، ہمارے ساتھ آ سکتے ہیں۔"

(کوسیمو اب سمجھ گیا تھا کہ 'کیک کھانے والا' سے مراد کسی کوٹھی میں رہنے والا، اعلیٰ خاندان والا، یا کم از کم کوئی رتبے والا ہے۔)

"سنو بھئی،" ایک نے اس سے کہا، "صاف بات یہ ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ آنا چاہتے ہو تو ہمارے ساتھ پھل چرانے ہوں گے اور اپنے سارے گر ہمیں سکھانے ہوں گے۔"

"اور ہمیں اپنے باپ کے میوہ زاروں میں لے چلو،" ایک اور بولا۔ "وہاں ایک دفعہ مجھ پر گولی چلی تھی!"

اپنی سوچوں میں نیم منہمک کوسیمو ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر وہ بولا، "یہ تو بتاؤ یہ سنفو روزا کون ہے؟"

اس پر شاخوں میں بکھرے ہوئے سارے پھٹیچر ٹھٹھا مار کر اس زور سے ہنسے کہ ایک تو چیری کے درخت سے تقریباً گر ہی پڑا اور ایک نے ٹانگوں کے سہارے شاخ کو پکڑ کر اپنے آپ کو بمشکل سنبھالا، اور ایک اور اپنے ہاتھوں کے بل لٹک گیا۔ اس تمام وقت ان کے قہقہے آسمان کو چھو رہے تھے۔

انھوں نے ایسا غل مچایا کہ تعاقب کرنے والے دوبارہ ان کے سر پہ آ پہنچے۔ درحقیقت آدمی اور کتے پیڑ کے بالکل نیچے ہی رہے ہوں گے کیونکہ کتوں کے بھونکنے کی اونچی آواز آئی اور پھر دوشاخہ بلم دوبارہ اوپر آ گئے۔ مگر اس بار، اپنے حالیہ دھچکے سے محتاط ہو کر، انھوں نے پہلے آس پاس کے درختوں کو گھیرا اور سیڑھیوں سے ان پر چڑھ گئے، اور وہاں سے کریدنیوں اور ترنگلوں کے ذریعے ٹولی کو گھیر لیا۔ زمین پر کتے، جن کے سارے آدمی درختوں پر بکھرے ہوئے تھے، نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ کدھر کو جائیں۔ وہ ہوا میں تھوتھنیاں اٹھائے بھونکتے پھر رہے تھے۔ اس طرح ننھے چوروں کو جلدی سے زمین پر کودنے کا موقع مل گیا اور وہ بوکھلائے ہوئے کتوں کے درمیان سے مختلف سمتوں میں بھاگ نکلے۔ حالانکہ ایک آدھ کو پنڈلی پر کتوں نے کاٹ کھایا یا پتھر سے چوٹ لگی مگر زیادہ تر صحیح سلامت بچ نکلے۔

"ٹھہرو!" ایک آواز ابھری، "یہ تو چھوٹے بیرن پیوواسکو ہیں! آپ اوپر کیا کر رہے ہیں جناب؟

آپ ان رذیلوں میں کہاں آ گئے؟''

کوسیمو نے جیاد یلا واسکا کو پہچان لیا جو ہمارے والد کا ایک مزدور تھا۔ دو شاخے ہٹ گئے اور ٹولی میں بہت سوں نے اپنے ہیٹ اتار لیے۔ میرا بھائی بھی دو انگلیوں سے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے جھکا۔

''ارے تم، جو نیچے کھڑے ہو، کتوں کو باندھ تو!'' انھوں نے چلا کر کہا۔ ''چھوٹے بیرن کو نیچے آنے دو! آپ نیچے آ سکتے ہیں جناب، لیکن ذرا احتیاط کیجیے گا، یہ درخت کافی اونچا ہے! ذرا ٹھہریے۔ ہم سیڑھی لگا دیتے ہیں۔ پھر میں آپ کو واپس گھر لے چلوں گا!''

''نہیں، شکریہ، شکریہ،'' میرے بھائی نے کہا۔ ''اپنے آپ کو پریشان مت کرو۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں اپنا راستہ جانتا ہوں!''

وہ تنے کے پیچھے غائب ہو کر ایک اور شاخ پر نمودار ہوا۔ پھر تنے کے گرد تیزی سے گھومتے ہوئے ایک اور بلند شاخ پر نمودار ہوا۔ وہ اس شاخ کے پیچھے غائب ہو گیا اور پھر اوپر گھنے پتوں کی وجہ سے ایک اور بلند شاخ پر صرف اس کے پیر ہی نظر آئے۔ پھر اس کے پیر اچھلے اور وہ غائب ہو گیا۔

''کہاں چلا گیا؟'' آدمی جنھیں معلوم نہ تھا کہ اسے اوپر ڈھونڈیں یا نیچے، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

''وہ رہا!'' وہ دور ایک اور درخت کی چوٹی پر نظر آیا اور پھر غائب ہو گیا۔

''وہ رہا!'' وہ دور ایک اور درخت کی چوٹی پر جھولتے ہوئے، گویا کہ ہوا سے جنباں ہو، چھلانگ لگا رہا تھا۔

''شاید گر پڑا ہے! نہیں! وہ رہا!'' سبز موجزن رنگ کے اوپر اگر کچھ دکھائی دے رہا تھا تو اس کا ہیٹ اور گندھے ہوئے بالوں کی چوٹی۔ ''تمھیں بھی کیسا مالک ملا ہے!'' دوسروں نے جیاد یلا واسکا سے پوچھا۔ ''آدمی ہے یا وحشی جانور؟ یا بذاتِ خود شیطان ہے؟''

جیاد یلا واسکا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

پھر کوسیمو کا گیت سنائی دینے لگا جو ایک قسم کی مشتق تان تھی۔ ''اوہ، بن۔ فو۔ رو۔ زا!!!!''

۵

سنفو روزا ــــ ٹولی کی بک بک سے کوسیمو اس اہم شخصیت کے بارے میں بتدریج بہت کچھ جان گیا۔ یہ وہ نام تھا جو انھوں نے حویلی کی مکین ایک ننھی لڑکی کو دیا تھا۔ وہ ایک پستہ قد سفید ٹٹو پر گھومتی تھی اور اس نے ان لڑکوں سے دوستی کر لی تھی۔ اس نے کافی وقت تک انھیں بچایا تھا، بلکہ ان پر حاوی ہونے کے باعث، ان کی کمان بھی کی تھی۔ وہ ٹٹو پر سوار، سڑکوں اور راستوں پر گھومتی پھرتی اور جہاں کسی بے حفاظت میوہ زار میں پکے ہوئے پھل دیکھتی، انھیں بتا دیتی، اور پھر ٹٹو کی پشت سے کسی افسر کی طرح ان کے حملے پر نظر رکھتی۔ جس وقت لڑکے بادام اور ناشپاتی کے درختوں کو تاراج کر رہے ہوتے، وہ اپنی گردن میں ایک شکاری بھونپو ڈالے ڈھلوانوں پر اوپر نیچے ٹٹو دوڑاتی رہتی جہاں سے وہ سارا دیہاتی منظر دیکھ سکتی اور جونہی کوئی مشتبہ نقل و حرکت دیکھتی، جس سے ان کے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا، بھونپو بجانے لگتی۔

بھونپو کی آواز سنتے ہی لڑکے درختوں سے کود پڑتے اور چھپ جاتے۔ سو جب تک چھوٹی لڑکی ان کے ساتھ تھی وہ ایک بار بھی نہیں پکڑے گئے تھے۔

بعد میں کیا ہوا، یہ سمجھنا مشکل ہے۔ سنفو روزا کی 'بے وفائی' دُہری لگتی تھی۔ ایک تو انھیں اپنے باغ میں پھل کھانے کی دعوت دینا اور پھر اپنے نوکروں سے پٹوانا؛ پھر ان میں سے ایک کو، جس کا نام بیل لورے تھا اور جس پر اس بات کے لیے اب تک فقرے کسے جاتے تھے، اپنا منظورِ نظر بنانا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور لڑکے سے، جس کا نام اگاسو تھا، پینگیں بڑھانا، اور پھر ان دونوں کو ایک دوسرے سے بھڑا دینا۔ اور پھر یہ کھلا کہ نوکروں نے لڑکوں کو اس وقت نہیں پیٹا تھا جب وہ پھل چرا رہے تھے، بلکہ اس وقت جب سنفو روزا نے دونوں حریفوں کو رد کر دیا تھا اور وہ دونوں اس کے خلاف ایک ہو گئے تھے۔ یہ بات بھی سنی گئی تھی کہ اس نے کچھ کیک لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن انجام کار اس نے جو کیک انھیں دیے وہ ارنڈی کے تیل کے بنے تھے اور اس طرح ہفتے بھر تک ان کے پیٹوں میں مروڑ اٹھتے رہے تھے۔ ایسے ہی ایک واقعے نے، یا اس جیسے کسی واقعے نے، یا ان تمام واقعات نے مل کر، سنفو روزا اور ٹولی کے درمیان دراڑ ڈال دی تھی، اور اب وہ اس کا ذکر ایک تاسف آمیز تلخی کے ساتھ کرتے تھے۔

کوسیمو نے سر ہلاتے ہوے اشتیاق سے یہ کہانیاں سنیں گویا کہ ہر تفصیل اس کی جانی ہوئی تصویر میں ٹھیک بیٹھتی ہو۔ آخرکار اس نے یہ پوچھنے کا فیصلہ کیا، ''لیکن یہ سنفو روزا آتی کون سی حویلی سے ہے؟''

''کیا؟ تمھارا مطلب ہے تم اسے نہیں جانتے؟ تم دونوں پڑوسی ہو! اوندار یوا کی حویلی والی سنفو روزا!''

اس تصدیق کے بغیر بھی کوسیمو کو یقین تھا کہ لڑکوں کی دوست، جھولے والی لڑکی، ویولا ہی ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ویولا نے کہا تھا وہ آس پاس کے سارے پھل چوروں کو جانتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کوسیمو نے پہلے ٹولی کو ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود، اس واقعے کے بعد سے اس کے اندر کی خواہش، حالانکہ وہ ابھی تک مبہم تھی، شدید تر ہوتی گئی۔ کسی لمحے تو وہ خود کو اس خواہش سے مغلوب پاتا کہ اوندار یوا کے میوہ زاروں پر ٹولی کے حملے کی قیادت کرے۔ کبھی سوچتا کہ ٹولی کے خلاف اپنی خدمات ویولا کو پیش کرے (غالباً ویولا کو تنگ کرنے کے لیے ٹولی کو اکسانے کے بعد، تاکہ اس کا بچاؤ کرنے کے قابل ہو سکے)۔ پھر سوچتا کہ بہادری کا ایسا کارنامہ انجام دے جو ویولا تک بالواسطہ پہنچ سکے۔ اپنے سر میں ان سارے خیالات کی ہلچل لیے وہ زیادہ سے زیادہ بٹی ہوئی توجہ کے ساتھ ٹولی کا ساتھ دیتا رہا۔ جب وہ درختوں سے چلے جاتے اور وہ تنہا رہ جاتا تو اس کے چہرے پر اداسی کا سایہ یوں چھا جاتا جیسے سورج پر بادل۔

پھر اچانک وہ بلی کی سی پھرتی سے اچھلتا اور شاخوں پر سے ہوتا ہوا میوہ زاروں اور باغوں کے پار نکل جاتا۔ اس دوران وہ بھینچے ہوے دانتوں کے ساتھ کوئی کشاکش والا مختصر گیت گنگناتا رہتا اور اس کی نظر یوں ساکت رہتی جیسے کچھ بھی نہ دیکھ رہی ہو اور وہ بالکل بلی کی طرح جبلت سے اپنا توازن قائم رکھتا۔

ہم اسے مختلف وقتوں میں اپنے باغ کی شاخوں پر سے مکمل انہماک کے عالم میں گزرتے دیکھا کرتے۔ ''وہ رہا!'' ہم اچانک چلاّتے کیونکہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہوتے، وہ اب تک ہمارے ذہنوں پر سوار رہتا۔ وہ جب سے درختوں پر تھا ہم گھنٹے اور دن گنا کرتے تھے۔ ہمارے والد کہتے، ''وہ پاگل ہے! اس کے اندر کوئی شیطان حلول کر گیا ہے!'' اور پھر ایبے فوشیلی فلیئر پر حملہ کرتے۔ ''اس کا واحد علاج جھاڑ پھونک ہے! تم کس بات کا انتظار کر رہے ہو؟ میں تم سے پوچھتا ہوں، میرے ایبے، تم ہاتھ باندھے وہاں کیا کر رہے ہو؟ اس کے اندر شیطان ہے، میرے اپنے بیٹے کے اندر۔ تم سمجھتے ہو؟ خدا کی پناہ!''

Scanned with CamScanner

لگتا تھا لفظ 'شیطان' نے ایپے کے ذہن میں سوچ کے ایک باضابطہ سلسلے کو بیدار کر دیا ہے۔ وہ یکا یک اپنی سستی سے نکل آیا اور شیطان کی موجودگی کو مناسب طور پر سمجھے جانے کے بارے میں دینیات کا ایک انتہائی پیچیدہ خطبہ شروع کر دیا۔ لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ وہ میرے والد کی تردید کر رہا ہے یا محض عمومی بات کر رہا ہے۔ دراصل اس نے شیطان اور میرے بھائی کے درمیان تعلق کے ممکن ہونے یا سرے سے خارج از امکان ہونے کے بارے میں حتمی طور سے کچھ کہا ہی نہیں۔

ہمارے والد بیرن بے صبر ہو گئے، ایپے کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا، میں پہلے ہی اکتایا ہوا تھا۔ دوسری طرف ہماری والدہ کی مادرانہ تشویش کا عالم، عملی فیصلوں اور ٹھوس طریقوں اور ذریعوں کی تلاش میں مستحکم ہو گیا تھا جیسا کہ کسی جنرل کی ذہنی مصروفیت کو ہونا چاہیے۔ انھوں نے ایک لمبی جنگی دوربین ڈھونڈ نکالی تھی اور اسے آنکھوں سے لگائے رہتیں اور یوں حویلی کی بالکنی میں گھنٹوں گزار دیتیں۔ پتوں کے درمیان لڑکے کو نظر میں رکھنے کے لیے وہ عدسوں کو وقفے وقفے سے آگے پیچھے کرتی رہتیں، اس وقت بھی جب ہم حلفیہ کہہ سکتے تھے کہ وہ دوربین کی پہنچ سے باہر ہے۔

''کیا تم اسے اب بھی دیکھ سکتی ہو؟'' باغ میں درختوں کے نیچے ٹہلتے ہوئے ہمارے والد پوچھتے۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ بالکل ہی ان کے سر پر ہو، وہ خود کوسیمو کو کبھی نہ دیکھ پاتے۔ جنرلیسا اثبات میں اشارہ کرتیں اور یہ کہ ہم مخل نہ ہوں، گویا وہ کسی پہاڑی پر فوجی دستوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لے رہی ہوں۔ ظاہر ہے کہ بعض اوقات وہ اسے بالکل ہی نہ دیکھ پاتیں۔ میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا تھا مگر ان کا ایک پختہ اندازہ تھا کہ وہ کہیں اور نہیں، ایک مقررہ جگہ پر ہی ظاہر ہوگا اور وہ اپنی دوربین کو وہیں مرکوز رکھتیں۔ انھوں نے یقیناً بار بار اپنے آپ سے تسلیم کیا ہوگا کہ انھوں نے کوئی غلطی کر دی ہے، اور پھر وہ دوربین سے نظر ہٹا کر اپنے گھٹنوں پر کھلا ہوا ایک نقشہ دیکھنے لگتیں۔ ان کا ایک ہاتھ فکرمند انداز میں اپنے منھ پر ہوتا اور دوسرا نقشے کے تصویری خطوط پر، یہاں تک کہ وہ اس مقام پر ٹھہر جاتیں جہاں ان کے بیٹے کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پھر وہ زاویے کھینچتیں اور اپنی دوربین کو اس پتوں کے سمندر میں کسی درخت کی چوٹی پر پھیر دیتیں۔ وہ عدسوں کو آہستہ آہستہ فوکس میں لاتیں اور پھر ان کے ہونٹوں پر کھیلتی نرم مسکراہٹ ہمیں بتا دیتی کہ انھوں نے کوسیمو کو دیکھ لیا ہے اور وہ واقعی وہاں ہے۔

اس کے بعد وہ اسٹول پر رکھی چند رنگین جھنڈیاں اٹھاتیں اور اشاروں کی طرح باری باری حتمی

Scanned with CamScanner

متناسب انداز میں لہراتیں۔ (یہ بات مجھے قدرے ناخوش کرتی کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ہماری والدہ کے پاس یہ جھنڈیاں ہیں اور وہ ان کا استعمال جانتی ہیں، اور میں سوچتا تھا کہ اگر انھوں نے جب ہم دونوں بچے تھے ہمیں جھنڈیوں سے اشارات کا کھیل سکھا دیا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ مگر ہماری والدہ کبھی نہیں کھیلتی تھیں، اور اب بہت دیر ہو چکی تھی۔)

تاہم مجھے یہ ضرور کہنا ہے کہ اپنے تمام جنگی آلات کے باوجود، ہاتھ میں رومال دبائے، ہر وقت فکرمند، وہ ایک ماں ہی رہیں۔ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ جنرل کا کردار ادا کرنے میں سکون پاتی ہوں گی یا یہ کہ اپنے خدشات کو ایک سیدھی سادی ماں کے بجائے ایک جنرل کی طرح بھلانے سے ان کی پریشانی کم ہوتی ہوگی۔ وہ بہر حال ایک نازک خاتون تھیں جن کا واحد دفاع وہ فوجی انداز تھا جو انھیں اپنے فان کر تیوتز اجداد سے ورثے میں ملا تھا۔

وہ اپنی ایک جھنڈی ہلاتے ہوئے دوربین میں سے دیکھ رہی تھیں کہ اچانک ان کا چہرہ کھل اٹھا اور وہ ہنس پڑیں۔ ہم سمجھ گئے کہ کوسیمو نے جواب دیا ہے۔ کس طرح؟ میں نہیں کہہ سکتا، غالباً اپنا ہیٹ لہرا کر یا کسی بڑی شاخ کے سرے کو ہلا کر۔ اس لمحے کے بعد سے ہماری والدہ یقیناً بدل گئیں۔ ان کی فکرمندی ختم ہوگئی۔ اگر کوسیمو جیسے نیارے اور معمول کی شفقت سے دور بیٹے کی ماں ہونے کے ناتے ان کی تقدیر دوسروں سے مختلف تھی تو ہم میں سے ہر کسی سے پہلے کوسیمو کے اس انوکھے پن کو قبول کرنے والی بھی وہی تھیں، گویا کہ ان سلاموں نے جو اس وقت کے بعد سے وہ انھیں غیر متوقع طور پر اس خاموش تبادلے سے بار بار بھیجتا، ان کا غصہ ٹھنڈا کر دیا ہو، انھیں منا لیا ہو۔

عجیب بات یہ تھی کہ ہماری والدہ نے اپنے آپ کو کبھی اس دھوکے میں نہیں رکھا کہ کوسیمو، جو انھیں سلام و آداب بھیج چکا ہے، اپنا فرار ختم کر کے ہمارے درمیان لوٹنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ دوسری طرف ہمارے والد مستقل طور پر اسی امید میں جیتے تھے اور کوسیمو کے بارے میں معمولی سی خبر پر بھی بول اٹھتے، ''آہ، ہاں؟ تم نے اسے دیکھا ہے؟ وہ واپس آ رہا ہے؟'' لیکن ہماری والدہ ہی، جو ایک طرح سے کوسیمو سے سب سے زیادہ دور تھیں، وہ واحد فرد نظر آتی تھیں جنھوں نے کوسیمو کو جوں کا توں قبول کر لیا تھا، شاید اس لیے کہ انھوں نے اپنے آپ کو کوئی توضیح پیش کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

لیکن ہمیں اُس دن کی طرف لوٹنا چاہیے۔ اب باتیستا، جو شاذ ہی باہر جاتی تھی، ہماری والدہ کے

Scanned with CamScanner

اسکرٹ کے عقب سے جھانکتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں کوئی عجیب سی خوراک رکھی تھی۔ اس نے چمچا اوپر اٹھا کر کوکتے ہوئے انداز میں پکارا، ''کوسیمو!...تم یہ لوگے؟'' لیکن اسے ہمارے والد سے ایک تھپڑ پڑا اور وہ اندر چلی گئی۔ کون جانے اس نے کیا وحشت خیز ملغوبہ تیار کیا تھا! ہمارا بھائی غائب ہو چکا تھا۔

میں اس کے نقش قدم پر چلنے کا آرزومند تھا۔ سب سے بڑھ کر یوں کہ اب میں جانتا تھا کہ وہ ننھے بدمعاشوں کے گروہ کی مہم جوئیوں میں حصہ لے رہا ہے، اور مجھے یوں لگتا تھا کہ اس نے ایک نئی سلطنت کے دروازے کھول دیے ہیں جسے اب خوف و بداعتمادی سے نہیں بلکہ ایک مشترکہ ولولے کے ساتھ دیکھا جانا چاہیے۔ میں چبوترے اور ایک اونچے دریچے کے درمیان، جہاں سے میں درختوں کی چوٹیوں کو دیکھ سکتا تھا، آگے پیچھے دوڑتا رہتا، اور وہاں سے، آنکھوں سے زیادہ کانوں کی مدد سے، میوہ زار میں ٹولی کی لوٹ مار پر نظر رکھے رہتا۔ میں چیری کے درختوں کی چوٹیوں کو کانپتے دیکھتا اور بار بار چیریاں چنتے اور توڑتے کسی ہاتھ یا کسی ملفوف سر پر میری نظر پڑتی۔ میں آوازوں کے درمیان کوسیمو کی آواز سنتا اور اپنے آپ سے پوچھتا، ''لیکن تم وہاں پہنچے کیسے؟ لمحہ بھر پہلے تو تم باغ میں تھے۔ کیا تم گلہری سے بھی زیادہ تیز ہو؟''

مجھے یاد ہے کہ جب انھوں نے بھونپو کی آواز سنی تو وہ بالائی تالاب کے اوپر سرخ آلوچے کے درختوں پر تھے۔ آواز میں نے بھی سنی مگر اس سے لاعلم ہونے کے باعث توجہ نہیں دی۔ لیکن وہ متوجہ ہوئے۔ میرے بھائی نے مجھے بتایا کہ وہ وہیں کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور بھونپو کو دوبارہ سن کر اپنے تحیّر میں بھول گئے کہ یہ خطرے کا اشارہ ہے۔ وہ محض ایک دوسرے سے پوچھا کیے: کیا انھوں نے ٹھیک سے سنا ہے؟ کیا اپنے پستہ قد ٹٹو پر سوار سنفوروزا انھیں خطرے سے آگاہ کرنے دوبارہ آ گئی ہے؟ وہ اچانک میوہ زار سے بھاگ نکلے، بچ نکلنے کی عجلت میں نہیں بلکہ اسے ڈھونڈنے اور اس تک پہنچنے کے لیے۔

صرف کوسیمو باقی رہ گیا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح لال تھا۔ لیکن جونہی اس نے لڑکوں کو بھاگتے دیکھا اور سمجھا کہ وہ سنفوروزا کی طرف بھاگ رہے ہیں، وہ ہر حرکت پر گرنے کا خطرہ مول لیتے ہوئے خود بھی شاخ در شاخ چھلانگیں لگانے لگا۔

ویولا پگڈنڈی کے ایک بل کھاتے نشیب پر تھی۔ وہ اپنے ٹٹو پر ساکن بیٹھی تھی، اس کا ایک ہاتھ

لگام تھامے ہوئے، ٹٹو کے پٹھے پر تھا، جب کہ دوسرے ہاتھ سے وہ چابک لہرا رہی تھی۔ وہ نیچے لڑکوں کو دیکھتے ہوئے چابک کا سرا اپنے منھ تک لائی اور اسے چبانے لگی۔ اس کا لباس نیلا تھا اور بھونپو سنہرا، جو اس کی گردن میں ایک باریک زنجیر سے آویزاں تھا۔ سارے لڑکے اکٹھے رک گئے تھے اور وہ بھی آلوچے یا انگلیاں یا اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر جما کھرنڈ یا بوریوں کے کونے چبا رہے تھے۔ وہ اپنے چباتے ہوئے دہنوں سے آہستہ آہستہ سانسوں تلے کسی گیت کی طرح تال میں فقرے ادا کرنے لگے، ''تم کیا کرنے آئی... سنفورزا... واپس جاؤ... اب تم ہماری... دوست نہیں ہو... آہ، آہ، آہ... غدار۔'' ایسا تھا جیسے وہ کسی حقیقی جذبے سے نہیں بلکہ اندرونی بے سکونی پر قابو پانے کو بول رہے ہوں، جیسے اپنی بات کی تردید چاہ رہے ہوں۔

اوپر، گتھی ہوئی شاخیں الگ ہوئیں اور وہاں، انجیر کے ایک اونچے درخت پر ہانپتے ہوئے کوسیمو کا پتوں میں گھرا سر نمودار ہوا۔ نیچے کھڑی ہوئی ویولا نے، جس کے ہاتھ میں چابک تھا، اسے اور دوسروں کو اسی غلط انداز نظر سے دیکھا۔ کوسیمو، جس کی زبان ابھی تک اس کے بس میں نہ تھی، خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے چلا کر کہا، ''جانتی ہو، اُس وقت سے میں درختوں سے نیچے نہیں آیا ہوں!''

اس طرح کے کاموں کو سکوت و اسرار کے پردے میں رکھنا چاہیے، کہ اگر ان کا اعلان کیا جائے یا ان کے بارے میں شیخی بگھاری جائے تو وہ بے مقصد بلکہ ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ سو میرے بھائی کی زبان سے یہ الفاظ مشکل سے ادا ہوئے ہوں گے کہ وہ سوچنے لگا، کاش اس نے یہ الفاظ ادا نہ کیے ہوتے۔ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی اور اس نے خود کو نیچے آنے اور اس سارے ننٹے کو ختم کر دینے کا تمنائی پایا۔ اس وقت تو اور بھی زیادہ جب ویولا آہستگی سے اپنے منھ سے چابک نکال کر نرمی سے بولی، ''تم ابھی تک نہیں اترے؟ مکار کہیں کے!''

پستو بڑے لڑکے پہلے تو منھ ہی منھ میں ہنستے رہے، پھر کھلکھلا کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے، یہاں تک کہ اس چیخ پکار سے ان کے پیٹوں میں بل پڑ گئے۔ کوسیمو پر طیش نے ایسا ہیجان کیا کہ انجیر کی بے لوچ لکڑی ٹوٹ گئی۔ اس کے پاؤں تلے ایک شاخ چٹخی اور وہ پتھر کی طرح گرا۔

وہ پھیلے ہوئے بازوؤں کے ساتھ گرا اور اس نے اپنے آپ کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا بھر کے درختوں پر گزرنے والی اس کی پوری زندگی میں یہی واحد لمحہ تھا جب اس میں کسی

Scanned with CamScanner

چیز کو پکڑنے کا عزم تھا نہ جبلت۔ لیکن اس کے کوٹ کا ایک کونا ایک نچلی شاخ میں الجھا اور وہ لٹک کے رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں اس طرح لٹکا ہوا پایا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور وہ زمین سے فٹ بھر کی دوری پر تھا۔

خون اس کے سر میں اسی طاقت سے دوڑا جو اسے شرم سے سرخ کیے دے رہی تھی۔ نظر اوپر اٹھانے اور ٹھٹھے مارتے لڑکوں کو دیکھنے پر، جن پر اب قلابازیاں لگانے کا ایک عمومی جنون سوار تھا، جس میں وہ ایک ایک کر کے یوں الٹے نظر آ رہے تھے گویا تحت الثریٰ کے اوپر زمین کو پکڑ رہے ہوں، اور اپنے کلول کرتے ٹٹو کو آگے پیچھے سرپٹ دوڑاتی ہوئی سنہرے بالوں والی ننھی لڑکی کو دیکھ کر اس کی سوچ، واحد سوچ، یہ تھی کہ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے درختوں پر رہنے کی بات واقعتاً زبان سے نکالی تھی اور یہ کہ یہی آخری موقع بھی ہوگا۔

ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو پیچھے شاخ پر کھینچا اور اس پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گیا۔ ویولا نے اب اپنے ٹٹو پر قابو پالیا تھا اور جو کچھ ہوتا رہا تھا اس سے بے خبر معلوم ہوتی تھی۔ کوسیمو اپنی ابتری کو فوراً بھول گیا۔ لڑکی بھونپو کو اپنے ہونٹوں تک لائی اور خطرے کی ایک تیز آواز نکالی۔ آواز سن کر لڑکے ہزیمت میں بھاگ نکلے، جیسا کہ کوسیمو نے بعد میں تبصرہ کیا۔ وہ ویولا کی موجودگی سے چودھویں کی رات میں خرگوشوں کی طرح انتہائی مضطرب نظر آتے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ اس نے خطرے کا اشارہ محض مذاق کے طور پر دیا ہے، مگر انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح دوڑ جانے دیا گویا کہ جبلت سے مجبور ہوں۔ وہ بھونپو کی آواز کی نقلیں کرتے ہوئے نشیب میں بھاگ رہے تھے۔ ان کے آگے آگے ویولا اپنی چھوٹی ٹانگوں والے ٹٹو پر سوار سرپٹ بھاگ رہی تھی۔

وہ اس طرح اندھادھند بھاگ رہے تھے کہ ویولا بار بار ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتی۔ آخرکار اس نے راستہ بدل کے ان سے چھٹکارا پالیا۔ وہ کہاں جا رہی تھی؟ وہ زیتونوں کے جھنڈ میں نیچے وادی تک جو بتدریج نشیب میں اتر رہی تھی، سرپٹ ٹٹو دوڑاتی رہی۔ اس نے وہ درخت جس پر اس لمحے کوسیمو بیٹھا تھا، تلاش کیا، اس کے گرد چکر لگایا اور آگے بڑھ گئی۔ لمحے بھر بعد وہ ایک زیتون کے پاس تھی جس پر پتوں کے درمیان میرے بھائی کا سر نمودار تھا، اور اس طرح وہ دونوں اتنی ہی پرپیچ وخم سمتوں میں جتنی کہ خود زیتون کی شاخیں تھیں، نیچے وادی تک اکٹھے گئے۔

Scanned with CamScanner

ننھے چوروں کی جب ان پر نظر پڑی اور انھوں نے دیکھا کہ وہ دونوں شاخ سے زین تک کس طرح باہم منسلک ہیں، تو وہ سب ایک پُر عناد تضحیک سے سیٹیاں بجانے لگے اور یوں زور زور سے سیٹیاں بجاتے ہوئے پورتا کا پیری کی جانب، جو شہر کا ایک دروازہ تھا، چلے گئے۔

لڑکی اور میرا بھائی زیتونوں کے درمیان ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے اکیلے رہ گئے۔ لیکن کوسیمو کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ بھیڑ کے غائب ہونے سے کھیل میں ویولا کی لطف اندوزی پھیکی پڑتی اور بوریت قدم جماتی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ یہ سب کچھ دوسروں کو جان بوجھ کر ناراض کرنے کے لیے کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ امید نظر آئی کہ وہ یہ شغل جاری رکھے گی، خواہ خود اُس کو ناراض کرنے کے لیے سہی۔ اپنے آپ کو زیادہ بیش قیمت محسوس کرنے کے لیے وہ بلاشبہ دوسروں کے غصے کی ضرورت مند معلوم ہوتی تھی۔ (اُس وقت ان ساری باتوں کو لڑکے کوسیمو نے مشکل ہی سے محسوس کرنے کی حد سے آگے جا کے سمجھا ہوگا۔ میرا قیاس ہے کہ حقیقت میں وہ کھردری چھالوں پر کسی حقیقی ادراک کے بغیر بے وقوفوں کی طرح چڑھ رہا تھا۔)

اچانک ایک کھڑی چٹان کے گرد اُن پر بجری کی ایک تیز چھوٹی سی بوچھاڑ پڑی۔ لڑکی نے حفاظت کے لیے اپنا سر نیچے کر کے ٹٹو کی گردن کے پیچھے چھپا لیا اور بچ نکلی۔ میرا بھائی، جو اوپر ایک شاخ کے موڑ پر پورے کا پورا دکھائی دے رہا تھا، کنکروں کی زد میں رہا۔ لیکن اوپر کنکر اتنے اوچھے پڑ رہے تھے کہ اسے ماتھے یا کانوں پر ایک آدھ کے سوا، زیادہ چوٹ نہیں لگی۔ ننھے بدمعاش سیٹیاں بجا بجا کے ہنستے رہے اور ''سنفو روز اکتیا ہے!'' چلاتے ہوئے بھاگ نکلے۔

پھل چور پورتا کا پیری پہنچ گئے جس کی دیواروں پر چڑھی کریل کی بیلیں سبز آبشاروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ آس پاس کی جھونپڑیوں سے ماؤں کی اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن مائیں اپنے بچوں پر اس لیے چلا رہی تھیں کہ وہ کہیں اور سے پیٹ بھرنے کے بجائے کھانے کے لیے گھر آ گئے تھے۔ پورتا کا پیری کے اردگرد جھونپڑوں اور چھپر والے مکانوں میں، شکستہ گاڑیوں اور خیموں میں اومبروسا کے غریب ترین لوگ ہجوم کیے ہوئے تھے۔ یہ اتنے غریب تھے کہ انھیں شہر کے دروازوں سے باہر اور کھیتوں سے دور رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو وہاں دور دراز علاقوں سے آئے تھے جہاں انھیں قحط اور غربت نے، جن کی شدت ہر ریاست میں بڑھتی جا رہی تھی، دھکیل دیا تھا۔

Scanned with CamScanner

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ ژولیدہ مو عورتیں، جن کی چھاتیوں سے بچے چمٹے ہوئے تھے، دھواں دیتے چولھوں کو ہوا دے رہی تھیں۔ کھلے آسمان تلے لیٹے ہوئے کچھ بھکاری اپنے پھوڑوں پر پٹیاں باندھ رہے تھے، اور کچھ کرختگی سے چلاتے ہوئے جوا کھیل رہے تھے۔ شرارتی لڑکوں کی ٹولی اب اس شور وغل اور چکنائی بھرے دھویں میں خود اپنی اُدھم بازی کا اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اپنی ماؤں سے پٹے اور آپس میں گرد آلود زمین پر گھونسا بازی کرتے رہے۔ ان کے چیتھڑے پہلے ہی دوسرے تمام چیتھڑوں کا رنگ اختیار کر چکے تھے اور ان کی پرندوں جیسی بشاشت انسانیت کے اس گھنے غلیظ ڈھیر میں دم توڑ چکی تھی۔ لہٰذا ٹٹو دوڑاتی سنہرے بالوں والی لڑکی اور پاس کے درختوں پر کوسیمو کے نمودار ہونے پر وہ فقط خوفزدہ نظریں ہی اٹھا سکے۔ وہ خفیف ہو کر اپنے آپ کو خاک اور آگ کے دھویں میں گم کرنے کی کوشش کرنے لگے گویا کہ ان کے درمیان اچانک کوئی دیوار کھڑی ہو گئی ہو۔

ان دونوں کے لیے یہ سب کچھ فقط ایک لمحہ تھا، ایک نظر تھی۔ پھر ویولا نے جھونپڑیوں سے نکلتے دھویں کو، جو شام کے سایوں اور عورتوں اور بچوں کی چیخوں میں مدغم ہو رہا تھا، اپنے عقب میں چھوڑ دیا اور ساحلی صنوبروں میں ٹٹو دوڑانے لگی۔

پرے سمندر تھا۔ پتھروں کے باہم ٹکرانے کی مدھم کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ کھڑکھڑاہٹ ہتھوڑے کی آواز میں ڈھل گئی۔ سنگریزوں سے چنگاریاں نکالتا ٹٹو دوڑے جا رہا تھا۔ صنوبر کے ایک درخت کی خم کھائی ہوئی نیچی شاخوں سے میرا بھائی گوری لڑکی کے واضح سائے کو ساحل سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ سیاہ سمندر سے ایک کمزور جھال والی لہر اٹھی جو بل کھاتے ہوئے اونچی ہوئی، پھر بالکل سفید ہو کر ساحل کی طرف بڑھی اور ٹوٹ کر پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے ٹٹو اور لڑکی کے سائے کو چھو گئی۔ صنوبر کے درخت پر کوسیمو کا چہرہ نمکین پھوار سے نم ہو گیا۔

۶

درختوں پر کوسیمو کے وہ ابتدائی ایام کسی ہدف یا مقصد سے تہی تھے، کہ اس پر اپنی نئی سلطنت کو جاننے اور اس پر قابض ہونے کی خواہش کا مکمل غلبہ تھا۔ وہ اس کی انتہائی حدوں تک گھومنا پسند کرتا،

Scanned with CamScanner

اس میں موجود تمام امکانات کا جائزہ لیتا، اسے نبات بہ نبات اور شاخ بہ شاخ دریافت کرتا۔ گو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ ایسا کرنا پسند کرتا لیکن حقیقت میں، ہم اسے اپنے سروں پر مدام نمودار ہوتا دیکھتے۔ اس کی سرگرم تیز حرکات اس وحشی جانور کی سی تھیں جو ساکت بیٹھا ہوا بھی ہر لحظہ چھلانگ مارنے کو چوکس نظر آتا ہے۔

وہ ہمارے باغ میں کیوں لوٹتا تھا؟ ہماری والدہ کی دوربین کی حد میں، کسی شیشم یا گل خطمی کے درخت پر اسے بل کھاتے دیکھ کر آپ کہہ سکتے تھے کہ اسے اُکسانے والی ترنگ، اس کا غالب ولولہ ہمیں ڈرانا، فکرمند کرنا یا ناراض کرنا ہے۔ (''ہمیں' اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی تک اس کا ذہن پڑھنے کا اہل نہیں ہوا تھا۔ اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو لگتا تھا، اسے میرے ساتھ اپنے تعلق پر کبھی شک نہیں ہوا؛ دوسرے موقعوں پر وہ میرے سر کے اوپر سے یوں گزر جاتا جیسے اس نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔)

لیکن حقیقت میں وہ ہمارے پاس سے محض گزرتا تھا۔ اسے میکولیا کے پاس والی دیوار اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہیں ہم نے اسے بار بار غائب ہوتے دیکھا، اُس وقت بھی جب گوری لڑکی جاگی ہوئی نہیں ہو سکتی تھی، یا جب آیاؤں اور خالاؤں کی بھیڑ نے اسے سونے پر مجبور کر دیا ہوتا۔ اوندار یوا کے باغوں میں شاخیں غیر معمولی جانوروں کی سونڈوں کی طرح پھیلی تھیں، اور زمین پر پودے، رینگنے والے جانوروں کی سبز کھالوں کی طرح، ستاروں جیسے منبت کاری والے پتوں میں نمو کرتے، اور بانس کے نازک پیلے درختوں میں کاغذ جیسی سرسراہٹ کے ساتھ لہریں پیدا کرتے۔ ان بدیسی نباتات کے غیر معمولی سبز رنگوں اور ان کی مختلف روشنیوں اور ان کے مختلف سکوت سے انتہا تک لطف اندوز ہونے کی آرزو میں سب سے اونچے درخت پر بیٹھا کوسیمو اپنے سر کو اوندھا دیتا اور باغ ایک جنگل میں ڈھل جاتا، جو اس دنیا کا نہیں تھا بلکہ اپنے آپ میں ایک نئی دنیا تھا۔

پھر ویولا نمودار ہوتی۔ کوسیمو اسے اچانک جھولے میں پینگ بڑھاتے، یا ٹٹو کی زین پر بیٹھا دیکھتا، یا باغ کے سرے سے آتی بھونپو کی تیز آواز سنتا۔

اوندار یوا کے مارکوئیس اور مارکوئیزا حقیقت میں اپنی بیٹی کی ہرزہ گردیوں سے کبھی پریشان نہیں ہوئے تھے۔ جب وہ کہیں آس پاس پیدل گھوم رہی ہوتی تو اس کی سب خالائیں اس کے پیچھے پیچھے ہوتیں لیکن جونہی وہ ٹٹو پر سوار ہوتی تو ہوا کی طرح آزاد ہو جاتی۔ چونکہ خالائیں باہر سواری نہیں کرتی تھیں، اس لیے نہیں دیکھ سکتی تھیں کہ وہ کہاں جاتی ہے، اور ان شرارتی لڑکوں سے اس کی شناسائی اتنی

ناقابلِ یقین تھی کہ وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ لیکن شاخوں پر چڑھتے چھوٹے بیرن نے انھیں فوراً متوجہ کرلیا تھا اور وہ اس کی منتظر رہتیں، مگر ایک برتر احساسِ تحقیر کے ساتھ۔

دوسری طرف، ہمارے والد کوسیمو کی نافرمانی پر اپنی تلخی کو اوندار یوا خاندان کے لیے اپنی نفرت سے مربوط کرتے، گویا کہ انھیں قصوروار گردانتا چاہتے ہوں، گویا کہ وہی ان کے بیٹے کو اپنے باغ میں بلاتے ہوں، اس کی آؤ بھگت کرتے ہوں اور اس باغیانہ کھیل میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوں۔ کوسیمو پر قابو پانے کے لیے انھوں نے اچانک ایک ہانکا کرنے کا فیصلہ کیا، مگر ہماری زمین پر نہیں بلکہ اس وقت جب وہ اوندار یوا کے باغوں میں واقعی موجود ہو۔ گویا کہ وہ ہمارے پڑوسیوں پر اپنے جارحانہ عزائم جتادینا چاہتے ہوں، انھوں نے اس ہانکے کی سربراہی خود نہ کرنے کا فیصلہ کیا (کہ اس کا مطلب اوندار یوا خاندان کے سامنے خود ذاتی طور پر جانا اور اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کرنا ہوتا، جو کیسا ہی ناقابلِ جواز سہی، شرفا کے درمیان ایک باوقار رابطہ ہوتا)۔ سو انھوں نے کوالیئے اینیا سلویو کاریگا کی کمان میں نوکروں کی ایک ٹکڑی بھیج دی۔

وہ سیڑھیوں اور رسیوں سے لیس اوندار یوا ولا کے صدر دروازے پر گئے۔ ترکی ٹوپی اور عبا میں ملبوس، اضطراب میں آگے پیچھے ہوتے ہوئے کوالیئے نے معذرت چاہتے ہوئے پوچھا، کیا وہ اندر جا سکتے ہیں۔ اوندار یوا خاندان کے نوکر پہلے تو یہ سمجھے کہ ہمارے نوکر وہ شاخیں تراشنے آئے ہیں جو پھیل کر ان کے باغ میں چلی گئی تھیں۔ لیکن جب انھوں نے آگے پیچھے چلتے اور اوپر شاخوں میں کچھ دیکھتے ہوئے کوالیئے کے بے ترتیب فقرے سنے: ''ہم پکڑنا چاہتے ہیں... پکڑنا...'' تو پوچھا، ''لیکن آپ کا کھویا کیا ہے، کوئی تو بتا؟''

''بیٹا، سب سے بڑا بیٹا، وارث،'' کوالیئے نے عجلت سے جواب دیتے ہوئے ایک شاہ بلوط کے سہارے سیڑھی لگائی اور خود درخت پر چڑھنے لگا۔ شاخوں کے درمیان کوسیمو بےفکری سے اپنی لٹکتی ہوئی ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ ویولا بھی اتنی ہی بےفکری سے پگڈنڈیوں پر پہیہ گھما رہی تھی۔ نوکروں نے کوالیئے کو رسیاں پیش کیں جن سے میرے بھائی کو پکڑا جانا تھا۔ لیکن کیسے؟ یہ ان میں سے کوئی ٹھیک سے نہیں جانتا تھا۔ مگر کوالیئے نے ابھی آدھی سیڑھی بھی طے نہیں کی تھی کہ کوسیمو ایک دوسرے درخت کی چوٹی پر تھا۔ کوالیئے نے سیڑھی سرکوائی اور یہ چار یا پانچ بار ہوا۔ لیکن ہر بار کوالیئے کسی پھولوں کی کیاری میں گرا اور

Scanned with CamScanner

کوسیمو ایک دو چھلانگیں لگا کے اگلے درخت پر جا پہنچا۔ اچانک ویولا کے گرد خالائیں اور آیائیں جمع ہو گئیں اور اسے گھر کے اندر لے جا کر بند کر دیا کہ وہ اس ہلڑ کو نہ دیکھے۔ کوسیمو نے ایک شاخ توڑ کر اسے دونوں ہاتھوں میں گھمایا اور پھر سڑاک سے ہوا میں مارا۔

"لیکن صاحبان، آپ اس تلاش کا اہتمام خود اپنے وسیع باغ میں کیوں نہیں کرتے؟" اوندار یوا کے مارکوئیس نے حویلی سے آنے والی سیڑھیوں پر متانت سے ظاہر ہوتے ہوئے پوچھا۔ ڈریسنگ گاؤن اور بے حاشیہ ٹوپی میں وہ حیرت انگیز طور پر کوالیئے کی طرح لگ رہا تھا۔ "میں پیوواسکو دی روندو کے سارے خاندان سے پوچھتا ہوں!" اور اس نے ایک وسیع دائرہ نما اشارہ کیا جس نے درخت پر بیٹھے چھوٹے بیرن، اس کے ناجائز چچا، ہمارے نوکروں، غرضیکہ دیوار کے پار ہماری ہر چیز کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔

اس مرحلے پر اینیا سلویو کاریگا نے اپنا انداز بدلا۔ وہ جلدی جلدی چلتا ہوا مارکوئیس کے پاس گیا اور اضطراب میں حرکت کرتے ہوئے، گویا کہ آس پاس کچھ نہ ہو رہا ہو، اس سے قریبی حوض میں لگے فواروں کے بارے میں بات کرنے لگا کہ کس طرح اسے ایک زیادہ اونچے اور زیادہ کارگر فوارے کا خیال سوجھا ہے جس کے ذریعے، محض ایک لٹو بدلنے سے، سبزہ زاروں کو پانی بھی دیا جا سکے گا۔ ہمارے فطری چچا کی ناقابل پیش گوئی اور مغالطہ انگیز فطرت کا یہ ایک نیا ثبوت تھا۔ بیرن نے اسے ایک کڑی ہدایت کے ساتھ وہاں بھیجا تھا اور پڑوسیوں سے ثابت قدمی سے نمٹنے کا حکم دیا تھا مگر اس نے مارکوئیس سے اس طرح دوستانہ گفتگو شروع کر دی گویا اس کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ کوالیئے کی خوش گفتاری صرف اس وقت بروئے کار آتی معلوم ہوتی تھی جب وہ خود اس کے حق میں جاتی ہو، اور وہ بھی اس وقت جب لوگ اس کے کردار کے ہٹیلے پن پر تکیہ کر رہے ہوں۔ غیر معمولی بات یہ تھی کہ مارکوئیس اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس سے سوالات کرنے لگا اور آخر کار اسے تمام فواروں اور نوک دار نلکیوں کا معائنہ کرانے لے گیا۔ دونوں ایک ہی طرح سے ملبوس تھے۔ دونوں لمبی عبائیں پہنے تھے۔ دونوں کے قد بھی اس قدر ایک جیسے تھے کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہو سکتا تھا۔ ہمارے اور ان کے سارے نوکر دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ کچھ نے سیڑھیاں اٹھا رکھی تھیں، اور نہیں جانتے تھے اب ان کا کیا کریں۔

اس دوران کوسیمو، بے خلل، حویلی کی کھڑکیوں کے قریبی درختوں سے پردوں کے پار وہ کمرہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں ویولا کو بند کیا گیا تھا۔ آخر کار اس نے وہ کمرہ ڈھونڈ لیا اور کھڑکی کے

شیشے پر ایک ٹہنی کا ٹکڑا پھینکا۔
کھڑکی کھلی اور سنہرے بالوں والی چھوٹی لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔
''یہ سب تمھارا قصور ہے جو میں یہاں بند ہوں،'' ویولا نے کہا اور کھڑکی دوبارہ بند کرتے ہوئے پردے کھینچ دیے۔
کوسیمو نے اچانک خود کو بے آس محسوس کیا۔

جب میرے بھائی پر اس کی مخصوص وحشیانہ کیفیت طاری ہوتی تو وہ حقیقت میں بڑی پریشان کن ہوتی۔ ہم اسے دوڑتا دیکھتے (اگر لفظ ''دوڑنا'' زمینی سطح کے حوالے سے نہیں، بلکہ مختلف بلندیوں پر بے قاعدہ سہاروں کی ایک دنیا کے حوالے سے — جن کے درمیان محض ہوا ہو — کچھ مفہوم رکھتا ہے) اور ہر لحظہ یہ لگتا کہ اس کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ گر جائے گا۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا — وہ جست لگاتا، کسی ایک نشیبی شاخ پر چھوٹے چھوٹے تیز قدموں سے چلتا اور آگے کی طرف جھک کر کسی اونچی شاخ پر جھول جاتا، اور اس قسم کے چار پانچ خطرناک لہریوں میں وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔
وہ جاتا کہاں تھا؟ اس بار وہ دوڑتا ہی جا رہا تھا۔ گل خطمی کے درختوں سے زیتون کے درختوں تک اور زیتون کے درختوں سے ساحل تک، یہاں تک کہ وہ جنگل میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ہانپتے ہوئے توقف کیا۔ اس کے نیچے ایک چراگاہ پھیلی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا ہریالی کے لطیف رنگوں کی گھاس کے گھنے گچھوں پر کسی لہر کی طرح چل رہی تھی۔ اس کے اوپر ککروندوں کے گول روئیں دار سفید بیج اڑ رہے تھے۔ درمیان میں لمبوترے مخروطوں والا صنوبر کا ایک تنہا ناقابلِ رسائی درخت تھا۔ درختوں پر چلنے والی بھورے نقطے دار پروں والی تیز رفتار چھوٹی چڑیاں صنوبر کی آڑی ترچھی کھڑی ہوئی سوئیوں کے گھنے خوشوں پر بسیرا لیے تھیں۔ کچھ کی دُمیں اوپر اور چونچیں نیچے تھیں اور وہ جھک کر کیڑے اور بیج چگ رہی تھیں۔
فطرت کے ایک دشوار گذار عنصر میں داخل ہونے کی وہ خواہش جس نے میرے بھائی کو درختوں میں جانے پر اکسایا تھا، اس کے اندر اب تک ناآسودہ تھی اور اسے ایک زیادہ مانوس ربط پر اکسا رہی تھی، ایک ایسے رشتے کا آرزومند بنا رہی تھی جو اسے ہر پتے اور ہر ڈنٹھل اور ہر پر اور ہر پھڑپھڑاہٹ سے جوڑ دے۔ یہ وہ چاہ تھی جو شکاری کو جاندار چیزوں کی ہوتی ہے اور جس کا اظہار وہ صرف اپنی بندوق سے انھیں

نشانہ بنا کر کر سکتا ہے۔ کوسیمو اسے اب تک پہچان نہ پایا تھا اور جنگل میں اور گہرا اُتر کر اسے آسودہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جنگل گھنا اور ناقابل عبور تھا۔ کوسیمو کو اپنے نیچے سے شاخیں کاٹ کاٹ کر راستہ بنانا پڑا اور بتدریج وہ اپنی پریشانی بھول گیا۔ وہ ایک کے بعد ایک پیش آنے والی عملی مشکلات میں مکمل طور پر گھرا ہوا تھا اور مانوس جگہوں سے زیادہ دور چلے آنے کا خوف (جسے وہ اس کے ہونے کے باوجود تسلیم کرنا نہیں چاہتا تھا) اس کے علاوہ تھا۔ سو، گھنی روئیدگی میں اپنا راستہ بناتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں اس نے بالکل سامنے پتوں کے درمیان دو زرد آنکھیں خود پر مرکوز دیکھیں۔ کوسیمو نے نیچے سے ایک شاخ کو ذرا سا ہٹایا اور اسے آہستگی سے چھوڑ کر اپنی جگہ واپس جانے دیا۔ پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اس خوف پر ہنس پڑا جو اس نے محسوس کیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ زرد آنکھیں کس کی ہیں۔ وہ ایک جنگلی بلی تھی۔

لیکن بلی کا نظارہ، جو اس نے شاخ ہٹانے میں فقط جھلک بھر ہی دیکھا تھا، اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا، اور لمحہ بھر بعد اس نے دوبارہ خود کو خوف سے کانپتا ہوا پایا۔ کیونکہ وہ بلی جو ظاہری شباہت میں ہر طرح سے دوسری بلیوں جیسی تھی، خوفناک اور دہشت زدہ کرنے والی تھی۔ صرف اسے دیکھنا ہی کسی کی چیخ نکلنے کے لیے کافی تھا۔ یہ ٹھیک سے کہنا مشکل ہے کہ اس میں دہشت زدہ کرنے والی ایسی کون سی بات تھی۔ وہ ایک طرح کی دھاری دار بلی تھی اور کسی دوسری دھاری دار بلی سے بڑی تھی، مگر یہ بات بے معنی ہے؛ وہ اس لیے خوفناک تھی کہ اس کی مونچھوں کے سیدھے بال خار پشت کے کانٹوں کی طرح تھے، اور اس کا سانس، جسے آدمی سننے سے زیادہ دیکھ سکتا تھا، پنجوں جیسے تیز دانتوں کی دوہری قطار کے درمیان سے آ رہا تھا۔ اس کے کان تیکھے، نوک دار مثلثی پر چم تھے، جو مغالطہ انگیز نرم بالوں سے ڈھکے تھے۔ اس کی پشم، جس کے بال کھڑے تھے، گردن کے گرد ایک زرد حلقے کی شکل میں پھولی ہوئی تھی اور اس کے پہلوؤں پر دھاریاں یوں کپکپا رہی تھیں گویا اسے چمکارا جا رہا ہو۔ بلی کی گردن ایک ایسی غیر فطری حالت میں تھی جسے قائم رکھنا اس کے لیے ناممکن لگتا تھا۔ یہ سب، جس کی جھلک کوسیمو نے شاخ کو اپنی جگہ لوٹانے سے پہلے کے لمحے میں دیکھی، اُس کے علاوہ تھا جسے دیکھنے کا اسے وقت نہیں ملا، مگر جس کا وہ تصور کر سکتا تھا۔ یعنی نکیلے ناخنوں کی چیرنے پھاڑنے والی طاقت، جسے پنجوں کے گرد بالوں

کے بڑے بڑے پنجوں نے چھپا رکھا تھا اور جو اس پر جست کرنے کے لیے تیار تھی۔ وہ ابھی تک پتوں کے درمیان گھومتی سیاہ پتلیوں والے زرد عینیے خود پر مرکوز دیکھ سکتا تھا۔ وہ ابھی تک سانسوں کی کھردری آواز سن سکتا تھا جو ہر لحظہ مزید بھاری اور کھردری ہوتی جا رہی تھی۔ ان ساری باتوں نے اسے احساس دلایا کہ وہ جنگلوں کی انتہائی خوفناک وحشی بلی کے روبرو ہے۔

جنگل کی ساری چہچہاہٹ اور پھڑ پھڑاہٹ خاموش تھی۔ اور تب اس وحشی بلی نے جست لگائی، مگر لڑکے پر نہیں بلکہ تقریباً ایک عمودی جست، جس نے کوسیمو کو دہلانے سے زیادہ بھونچکا کر دیا۔ دہلا تو وہ بعد میں جب اس نے اس حیوان کو اپنے سر کے عین اوپر ایک شاخ پر دیکھا۔ وہ گھات لگائے بیٹھی تھی۔ کوسیمو اس کا پیٹ، جس پر سفیدی مائل لمبی پشم تھی، اس کے مستعد پنجے، جن کے ناخن لکڑی میں گڑے تھے، اور اس کی محرابی کمر دیکھ سکتا تھا۔ کسی بھی لمحہ عین اس کے اوپر گرنے کو تیار، وہ سسکارتے ہوے ''فوں فوں'' کی آوازیں نکال رہی تھی۔ ایک تیز حرکت سے، جو محض جبلی تھی، کوسیمو ایک نچلی شاخ پر اتر آیا۔ ''فوں... فوں...'' وحشی بلی سسکاری اور ہر ''فوں'' کے ساتھ ایک یا دوسری طرف جست کرتی ہوئی کوسیمو کے اوپر ایک شاخ پر دوبارہ آ گئی۔ میرے بھائی نے اپنی چال دہرائی اور اب وہ درخت کی سب سے نچلی شاخ پر تھا۔ شاخ سے نیچے زمین تک کچھ فاصلہ تھا لیکن اتنا زیادہ نہیں کہ وہ نیچے کودنے کو ترجیح دینے کے بجائے یہ دیکھنے کا انتظار کرتا کہ بلی، جس نے خرخرانے اور غرانے کے بین بین کی وہ اذیت ناک آواز نکالنا بند کر دی تھی، اب کیا کرے گی۔

کوسیمو زمین پر کودنے ہی والا تھا، مگر اس کے اندر دو جبلتیں متصادم تھیں: ایک اپنے آپ کو بچانے کی فطری جبلت، اور دوسری درخت کو کسی بھی حالت میں نہ چھوڑنے کی ہٹیلی جبلت۔ سو، اس نے شاخ کو اپنی ٹانگوں اور گھٹنوں سے جکڑ لیا۔ لڑکے کو پس و پیش میں دیکھ کر بلی نے سوچا کہ حملہ کرنے کا لمحہ آ پہنچا۔ اس کے سارے جسم کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ پنجوں سے ناخن نکال کر خرخراتی ہوئی اس کی جانب بڑھی۔ کوسیمو اپنی آنکھیں بند کرنے اور تیغچہ نکالنے سے بہتر کوئی اور بات نہ سوچ سکا۔ یہ ایک احمقانہ چال تھی جس سے بلی بآسانی بچ نکلی۔ پھر وہ اس پر آ پڑی اور کوسیمو کے گال میں ایک پنجہ گڑو دیا، لیکن گرنے کے بجائے وہ شاخ پر، جس سے وہ گھٹنوں کے ذریعے چمٹا ہوا تھا باہر کی طرف جھول گیا۔ یہ بات بلی کے لیے، جس نے بے توازن ہو کر خود کو گرتا ہوا پایا، توقع سے بالکل الٹ تھی۔ اس نے پنجے

شاخ میں گڑو کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی مگر ایسا کرنے کے لیے اسے ہوا میں بل کھانا پڑا۔ یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی مگر کوسیمو کے لیے ایک لمحہ ہی بہت تھا۔ اس نے ایک اچانک فتح مندانہ وار میں اپنا نیچہ گہرائی تک بلی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

اسے بچا لیا گیا۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا اور اس کا ایک گال آنکھ کے نیچے سے ٹھوڑی تک ایک تہری چیر سے بری طرح گھائل تھا۔ وحشی بلی اس کے نیچے میں یوں پروئی ہوئی تھی جیسے سیخ پر لگی ہوئی ہو۔ وہ ہیجان کی حالت میں شاخ سے، نیچے سے، بلی کے جسم سے چمٹا ہوا، درد اور فتح سے چلا رہا تھا۔ وہ اس بے جگری کے لمحے میں تھا جو آدمی پر پہلی فتح حاصل کرنے کے بعد آتا ہے، جب وہ فتح کا کرب محسوس کرتا ہے اور یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ اب وہ اپنے اختیار کردہ راستے پر چلتے جانے کا پابند ہے اور ناکامی کو کسی صورت اپنا حیلہ نہیں بنا سکتا۔

سو میں نے اسے درختوں پر اس طرح آتا ہوا دیکھا۔ وہ نیچے واسکٹ تک خون میں ڈوبا ہوا تھا اور مڑے تڑے ہیٹ کے نیچے اس کی چوٹی بے ترتیب تھی اور اس نے مردہ وحشی بلی کو گردن سے اٹھا رکھا تھا جو اب بالکل کسی دوسری بلی جیسی نظر آ رہی تھی۔

میں جنرلیسا کی طرف بھاگا جو چبوترے پر تھیں۔ ''والدہ محترمہ!'' میں چلایا۔ ''وہ زخمی ہو گیا ہے!''

''کیا؟ زخمی؟ کیسے؟'' وہ فوراً اپنی دوربین کا رخ درختوں کی طرف کرنے لگیں۔

''زخمی ہو گیا ہے، تو بس زخمی لگتا ہے!'' میں نے بے ساختہ کہا اور جنرلیسا میری وضاحت کو سمجھتی نظر آئیں کیونکہ کوسیمو کو اپنی دوربین سے دیکھتے ہوئے، جو ہمیشہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ چھلانگیں لگاتا آ رہا تھا، وہ بولیں، ''درست ہے۔''

وہ فوراً بچائے اور پٹیاں اور مرہم تیار کرنے بیٹھ گئیں گویا کسی پلٹن کی ایمبولینس کے لیے درکار ہوں، اور ایک لمحے کو بھی یہ سوچے بغیر کہ وہ علاج کے لیے گھر لوٹنے کا فیصلہ کر سکتا ہے، یہ سب چیزیں اس تک لے جانے کے لیے میرے حوالے کر دیں۔ اور میں پٹیوں کا بنڈل لیے دوڑ کر باغ میں گیا اور اونداریوا خاندان کی دیوار کے پاس شہتوت کے آخری درخت کے نیچے اس کا انتظار کرنے لگا کیونکہ وہ پہلے ہی میگنولیا کے درخت میں غائب ہو گیا تھا۔

وہ مردہ جانور کو اپنے ہاتھوں میں لیے فاتحانہ طریقے سے اونداریوا کے باغ میں نمودار ہوا۔ مگر

Scanned with CamScanner

حویلی کے سامنے والے حصے میں اس نے کیا دیکھا؟ ایک بگھی سفر کے لیے تیار ہے اور نوکر سامان والے خانے میں تھیلے چڑھا رہے ہیں، اور سیاہ عباؤں والی سخت گیر آیاؤں اور خالاؤں کی بھیڑ کے درمیان، سفری لباس میں ویولا مارکویس اور مارکویزا سے گلے مل رہی ہے۔

''ویولا!'' بلی کو گردن سے پکڑ کر اٹھاتے ہوے اس نے چلا کر کہا، ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

بگھی کے گرد سارے لوگوں نے اپنی نظریں شاخوں کی طرف اٹھائیں اور اسے زخمی حالت میں، جنونی کیفیت کے ساتھ مردہ جانور ہاتھوں میں لیے دیکھ کر نفرت بھرے اشارے کرنے لگے۔ ''پھر یہاں! اور اس حالت میں!'' اور سب خالائیں گویا اچانک طیش سے مغلوب ہو کر لڑکی کو بگھی کی طرف دھکیلنے لگیں۔

ویولا مڑی۔ اس کی ناک چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے انداز میں تحقیر اور اکتاہٹ تھی جو کوسیمو کے لیے بھی ہو سکتی تھی اور اس کے اپنے عزیزوں کے لیے بھی۔ اس نے تیزی سے درختوں پر ایک نظر ڈالی۔ (جو یقیناً اس کے سوال کے جواب میں تھی) اور کہا، ''مجھے اسکول بھیج رہے ہیں!'' اور وہ بگھی میں بیٹھنے کے لیے گھوم گئی۔ اس نے کوسیمو یا اس کی فتح مندی کی علامت پر نظر ڈالنا اپنے شایان نہیں سمجھا۔

بگھی کا دروازہ پہلے ہی بند ہو چکا تھا اور کوچوان نے اپنی نشست سنبھال لی تھی۔ مگر کوسیمو، جو اس روانگی کو اب تک سمجھنے سے قاصر تھا، اس کی توجہ مبذول کرانے اور اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے اپنی خوں آشام فتح اس سے منسوب کی ہے۔ وہ صرف چلا کر ہی اپنی بات واضح کر سکا، ''میں نے ایک جنگلی بلی ماری ہے!''

چابک کا ایک تڑاقا ہوا اور خالاؤں کے ہلتے رومالوں کے درمیان بگھی چل پڑی۔ دروازے سے ویولا کی آواز آئی، ''کتنے چالاک ہو تم!'' مگر یہ واضح نہیں تھا کہ اس میں گرم جوشی تھی یا تحقیر۔

یہ ان کا الوداعیہ تھا۔ کوسیمو کے اندر تناؤ، زخموں سے اٹھتا درد، اپنی فتح پر ستائش نہ ہونے کی ناامیدی، اس اچانک رخصت کی مایوسی، یہ سب کچھ طوفان کی طرح امنڈ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور دہاڑیں اور چیخیں مارتے ہوے کونپلیں اکھیڑنے لگا۔

''یہاں سے نکلو! یہاں سے نکلو! وحشی بدمعاش، باغ سے نکلو!'' خالائیں چلائیں۔ اونداریوا خاندان کے سارے نوکر لمبے لمبے ڈنڈے لیے دوڑتے ہوے آئے اور پتھر مار مار کر اسے بھگانے لگے۔

کوسیمو نے، جو ابھی تک سسکیاں لیتے ہوئے رو رہا تھا، مردہ بلی کو نیچے کھڑے ہوئے لوگوں پر پھینک دیا۔ نوکروں نے جانور کو گردن سے پکڑا اور ایک گوبر کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

جب میں نے سنا کہ ہماری ننھی پڑوسن رخصت ہو گئی ہے تو میں ایک وقت تک امید کرتا رہا کہ ہوسکتا ہے کوسیمو نیچے آجائے۔ میں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا لیکن اپنے بھائی کے درختوں پر رہنے کے فیصلے کو میں اُس سے، یا اُس سے بھی، مربوط کرتا تھا۔

لیکن کوسیمو نے نیچے آنے کا ذکر تک نہیں کیا۔ میں اسے پٹیاں اور پھائے دینے درخت پر گیا اور اس نے اپنے چہرے اور بازوؤں کی کھرونچوں کی خود دیکھ بھال کی۔ پھر اس نے مچھلی پکڑنے کی ڈنڈی اور کانٹا لانے کو کہا، اس نے اس کے ذریعے ایک زیتون کے درخت پر سے، جو اوندار یوا خاندان کے کھاد کے ڈھیر کے اوپر تھا، مردہ بلی کو اوپر کھینچ لیا۔ اس نے بلی کی کھال اتاری، پشم کو جیسا بھی سکھا سکتا تھا سکھایا اور اس سے ایک ٹوپی بنائی۔ یہ اس طرح کی ٹوپیوں میں سے پہلی ٹوپی تھی جو ہم اسے ساری زندگی پہنے ہوئے دیکھنے والے تھے۔

۷

کوسیمو پر قابو پانے کی آخری کوشش ہماری بہن باتیستا نے کی۔ یقیناً یہ اس کی اپنی پیش قدمی تھی، جو اس کی عادت کے مطابق کسی سے مشورہ کیے بغیر خفیہ طریقے سے کی گئی تھی۔ وہ ایک رات گوند سے بھرا مٹکا اور رسّی کی سیڑھی لے کر باہر گئی اور ایک خرنوب کے درخت کو اوپر سے نیچے تک گوند سے لیپ دیا۔ یہ وہ درخت تھا جس پر کوسیمو ہر صبح بیٹھا کرتا تھا۔

صبح، پر پھڑپھڑاتی سنہری چڑیوں، گوند میں لتھڑی چمگادڑوں، شبینہ تتلیوں، ہوا کے اڑائے ہوئے پتوں اور ایک گلہری کی دُم کے علاوہ کوسیمو کے کوٹ کا پھٹا ہوا پچھلا حصہ بھی خرنوب کے درخت سے چپکا ہوا تھا۔ کون جانے وہ درخت کی کسی شاخ پر بیٹھا ہو اور پھر اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب رہا ہو، یا پھر — زیادہ امکان یہی ہے، کیونکہ کچھ دن سے میں نے اسے کوٹ پہنے نہیں دیکھا تھا — اس نے ہمارا مذاق اڑانے کے لیے وہ چیتھڑا جان بوجھ کر وہاں چپکا دیا ہو۔ بہر حال وہ درخت کریہہ طور سے

Scanned with CamScanner

گوند میں لتھڑا رہا اور پھر سوکھ گیا۔

ہم سب، یہاں تک کہ ہمارے والد بھی، اس بات کے قائل ہونے لگے کہ وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ جب سے میرا بھائی سارے اومبروسا میں درختوں پر پھدکتا پھر رہا تھا، بیرن نوابی وقار مشتبہ ہو جانے کے خوف سے عوامی جگہوں پر نہیں گئے تھے۔ وہ روز بروز دبلے اور زرد ہو رہے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا اس میں کتنا دخل پدرانہ فکرمندی کا تھا اور کتنا نسلی سلسلے کی پریشانیوں کا۔ لیکن اب دونوں باتیں مل کر ایک ہو گئی تھیں کیونکہ کوسیموان کا سب سے بڑا بیٹا تھا، ان کے خطاب کا وارث تھا۔ اگر پرندوں کی طرح درختوں پر پھدکتے ہوئے بیرن کا تصور کرنا مشکل ہے، تو یہ بات ایک ڈیوک کے لیے، خواہ وہ لڑکا ہی کیوں نہ ہو، اور بھی نامناسب لگتی ہے، اور وارث کا یہ عمل مبارز طلب خطاب دوبارہ پانے کے لیے یقیناً مددگار نہیں تھا۔

بلاشبہ یہ بے کار ذہنی مشغولیتیں تھیں، کیونکہ اومبروسا کے لوگ ہمارے والد کے تفاخر پر حقش ہنستے تھے اور آس پاس رہنے والے رئیس انھیں پاگل گردانتے تھے۔ اس وقت تک ان رئیسوں نے اپنے جاگیری قلعوں کے بجائے پرفضا مقامات پر واقع حویلیوں میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور اس امر نے انھیں غیر ضروری مشکلات سے بچتے ہوئے عام شہریوں کا رویہ اپنانے پر قائل کر دیا تھا۔ کسے پڑی تھی جو اومبروسا کی قدیم جاگیر کے بارے میں سوچتا۔ اومبروسا کے بارے میں عجیب بات یہ تھی کہ یہ کسی کا نہیں تھا اور پھر بھی سب کا تھا۔ اوندار یوا خاندان کو، جو وہاں کی تقریباً ساری زمینوں کے مالک تھے، البتہ چند حقوق حاصل تھے، لیکن وہاں کچھ عرصے تک جمہوریہ جینوآ کی باجگزار ایک خود مختار پنچایت قائم رہی تھی۔ ہمیں اپنی موروثی زمینوں کی فکر نہیں تھی اور نہ ہی ان زمینوں کی جو ہم نے پنچایت سے اس وقت کوڑیوں کے مول لی تھیں جب وہ انتہائی مقروض تھی۔ آدمی اور کس چیز کی خواہش کر سکتا تھا؟ اس علاقے میں رئیسوں کا ایک چھوٹا سا حلقہ آباد تھا جن کی حویلیاں اور باغات نیچے سمندر تک چلے گئے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے ملتے ملاتے اور شکار کرتے ہوئے ایک خوشگوار زندگی بسر کرتے تھے۔ زندگی کی لاگت کم تھی۔ انھیں درباری رئیسوں پر کئی طرح سے سبقت حاصل تھی۔ انھیں خبردار رہنے کے لیے ایسی پریشانیاں، فرائض اور اخراجات لاحق نہیں تھے جو شاہی خاندان، دارالحکومت یا سیاست سے وابستہ رئیسوں کو ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو ایک معزول حکمراں محسوس کرنے کے باعث ہمارے والد اس زندگی سے ذرا لطف نہ اٹھاتے تھے۔ (غیر ملکی ہونے کی وجہ سے، کہا جا سکتا ہے، ہماری والدہ کا ملنا جلنا

کسی سے تھا ہی نہیں۔) اس کے اپنے فوائد تھے، کیونکہ کسی سے نہ ملنے سے ہم پیسہ بھی بچاتے تھے اور اپنے وسائل کی قلت بھی چھپاتے تھے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اومبروسا کے عام لوگوں سے ہمارے تعلقات اچھے تھے۔ آپ کو پتا ہی ہے عام لوگ کیسے ہوتے ہیں — قدرے اکھڑ، دھندے کی بات کے سوا کچھ اور نہ سوچنے والے۔ اس زمانے میں امیر طبقوں میں شکر والی سکنجبین پینے کا چلن بڑھنے کے ساتھ لیموں اچھے بکنے لگے تھے، اور انھوں نے ہر جگہ لیموں کے باغ لگا لیے تھے اور برسوں پہلے قزاقوں کے حملوں سے تباہ ہونے والی بندرگاہ دوبارہ بنالی تھی۔ جمہوریہ جینوآ، شاہِ ساردینیا کے تعلقوں، بادشاہتِ فرانس اور اُسقفی زمینوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے وہ سب کے ساتھ غیر قانونی کاروبار کرتے اور جینوآ کو دیے جانے والے خراج کے سوا، جو ہر بار ان کا خون چوس لیتا تھا اور ہر سال جمہوریہ کے محصول جمع کرنے والوں کے خلاف ہنگاموں کا سبب بنتا تھا، وہ کسی کی پروانہ کرتے تھے۔

جب بھی محصول کے بارے میں ہنگامے ہوتے تو بیرن دی روندو یہ تصور کرتے کہ ان سے نوابی تکٹ قبول کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ وہ عوامی چوک میں نمودار ہوتے اور خود کو اومبروسا کے لوگوں کے سامنے ان کے محافظ کے طور پر پیش کرتے، لیکن ہر بار انھیں سڑے ہوئے لیموؤں کی برسات میں تیزی سے فرار ہونا پڑتا۔ پھر وہ یہ کہتے کہ ان کے خلاف سازش کی گئی ہے، جو حسبِ معمول یسوعیوں (Jesuits) کا کام ہوتا۔ انھوں نے اپنے ذہن میں یہ بٹھا لیا تھا کہ ان کے اور یسوعیوں کے درمیان زندگی اور موت کی ایک کشمکش جاری ہے اور اُن کی انجمن صرف انھیں برباد کرنے کی تدبیریں سوچتی رہتی ہے۔ حقیقت میں ان کے درمیان ایک میوہ زار کی ملکیت کے بارے میں کچھ اختلافِ رائے رہا تھا، جس پر ہمارے خاندان اور انجمن دونوں کا دعویٰ تھا۔ کچھ کشمکش کے بعد بیرن، بشپ سے اچھے تعلقات ہونے کے باعث، علاقائی پادری کو تعلقے سے ہٹوانے میں کامیاب رہے تھے۔ اس وقت سے ہمارے والد کو یقین تھا کہ انجمن ان کی زندگی اور ملکیت پر حملوں کے لیے آدمی بھیجتی ہے۔ اپنی حد تک انھوں نے بشپ کو آزاد کرانے کے لیے، جو ان کے خیال میں یسوعیوں کا قیدی بن کے رہ گیا تھا، وفاداروں کی ایک رضاکار فوج بھرتی کرنے کی کوشش کی اور ہر اس شخص کو پناہ اور تحفظ کی پیش کش کی جس نے خود کو یسوعیوں کا ستایا ہوا قرار دیا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ہمارے روحانی باپ کے طور پر اس نیم جینسنی (Jensenist)

Scanned with CamScanner

کا انتخاب کیا جو ہمیشہ اپنے خیالوں میں گم رہتا تھا۔

صرف ایک شخص ایسا تھا جس پر ہمارے والد بھروسا کرتے تھے اور وہ تھا کوالیئے۔ بیرن اپنے اس ناجائز بھائی کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتے تھے جیسے وہ واحد بدنصیب اولاد ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا ہمیں اس کا احساس تھا یا نہیں، مگر اس امر پر کہ ہم میں سے کسی لڑکے کی نسبت ہمارے والد اپنے اس پچاس سالہ بھائی کے زیادہ دلدادہ تھے، کوالیئے کی جانب ہمارے رویے میں حسد کا شائبہ ضرور رہا ہوگا۔ بہرحال، اسے شک وشبہ سے دیکھنے والے صرف ہم ہی نہیں تھے، گو جنرلیسا اور باتیستا اس کی عزت کرنے کا ناٹک کرتی تھیں لیکن حقیقت میں وہ اسے برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ اپنے مسکین ظاہر کے پیچھے وہ ہم سب کو بےوقعت گردانتا تھا— ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سب سے، یہاں تک کہ بیرن سے بھی جن کا وہ اس قدر رہینِ منت تھا، نفرت کرتا ہو۔ کوالیئے اس قدر کم گو تھا کہ بعض اوقات اس پر یا تو گونگا اور بہرا ہونے کا گمان کیا جاسکتا تھا یا اسے ہماری زبان سمجھنے کا نااہل کہا جاسکتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس نے کبھی وکیل کی حیثیت سے کیسے کام چلایا ہوگا، یا یہ کہ ترکوں کے ساتھ گزارے ہوئے وقت سے پہلے بھی وہ اتنا ہی غائب الدماغ تھا۔ شاید وہ کبھی صاحبِ عقل تھا کہ اس نے ترکوں سے آبیات (hydraulics) کے سارے حسابات سیکھے تھے اور یہی واحد کام تھا جس پر وہ اب توجہ دینے کا اہل تھا اور جس کی تعریف ہمارے والد مبالغہ انگیزی کی حد تک کرتے تھے۔ میں اس کے ماضی کی بابت کبھی زیادہ نہیں جان سکا۔ نہ یہ کہ اس کی ماں کون تھی، نہ ہی یہ کہ جوانی میں اُس کے تعلقات ہمارے دادا سے کیسے تھے (جو یقیناً اس کے بہت دلدادہ رہے ہوں گے کیونکہ انھوں نے اسے وکیل بنوا دیا تھا اور کوالیئے کا خطاب دیا تھا)، نہ یہ کہ وہ ترکی کیسے پہنچ گیا تھا۔ یہ بات بھی یقینی نہیں تھی کہ اتنا وقت اس نے ترکی ہی میں گزارا تھا یا تیونس اور الجزائر جیسی کسی بربر ریاست میں؛ بہرحال وہ کوئی مسلمان ملک تھا، اور یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ خود بھی مسلمان ہوگیا ہے۔ اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ مثلاً یہ کہ کسی محلاتی سازش یا کسی عورت کے حسد، یا جوئے کے قرض کی بدولت قعرِ مذلت میں گرنے اور غلام بنا کر بیچے جانے سے قبل، وہ اہم عہدوں پر فائز رہا تھا، سلطان کا اعلیٰ حکومتی اہلکار، کابینہ کا مشیرِ آبیات یا ایسا ہی کوئی عہدے دار رہا تھا۔ یہ معلوم تھا کہ وہ ایک عثمانی کشتی میں، جسے وینس کے باشندوں نے پکڑا تھا، پابہ زنجیر غلاموں

کے ساتھ پچو چلاتا ہوا ملا تھا، اور انھوں نے اسے آزاد کر دیا تھا۔ وینس میں وہ کم وبیش بھکاریوں کی طرح رہا تھا تاوقتیکہ وہ کسی اور مصیبت میں پھنس گیا، میرے خیال سے کسی جھگڑے میں (حالانکہ خدا ہی جانتا ہے کہ اس جیسا ڈرپورک آدمی کس سے لڑ سکتا تھا) اور دوبارہ جیل پہنچ گیا۔ ہمارے والد نے اسے جمہوریۂ جینوآ کی مدد سے تاوان دے کر چھڑایا اور یوں سیاہ داڑھی کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک گنجا آدمی، بے حد خوفزدہ، نیم گنگ (میں بچہ تھا مگر اُس شام کا منظر میرے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ گیا ہے) اپنے جسم سے بہت زیادہ بڑے کپڑوں میں ملبوس، ہم تک لوٹا۔ ہمارے والد نے اسے ہر کسی پر ایک بااختیار شخص کی حیثیت سے مسلط کر دیا، اسے ناظم کا نام دیا اور ایک مطالعہ خانہ تفویض کر دیا، جو بے ترتیب کاغذوں سے زیادہ سے زیادہ بھرا جاتا رہا۔ اس زمانے کے زیادہ تر رئیسوں اور متوسط لوگوں کی طرح کوالیئے بھی مطالعہ خانے میں ایک لمبی عبا اور ترکی ٹوپی سے مماثل ایک بے حاشیہ ٹوپی پہنے رہتا تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے مطالعہ خانے میں شاذ ہی ہوتا تھا اور اسی لباس میں باہر دیہات میں بھی گھومتا پھرتا دیکھا جاتا تھا۔ آخر کار وہ کھانے کی میز پر بھی انھیں ترکی عباؤں میں آنے لگا اور عجیب بات یہ تھی کہ ہمارے والد، جو عام طور پر بہت اصول پسند تھے، اسے برداشت کرتے نظر آتے۔

ناظم کی حیثیت سے اپنے فرائض کے باوجود کوالیئے اپنی ڈرپوکی اور بے ربطی کی وجہ سے ناظروں یا مزارعوں یا کسانوں سے بمشکل ہی بات کر پاتا اور احکامات دینے اور لوگوں کو حد میں رکھنے کی ساری عملی ذمے داریاں حقیقت میں ہمارے والد ہی کے حصے میں آتی تھیں۔ اینیا سلویو کاریگا حساب کتاب سنبھالتا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہمارے امور میں اتنی خرابی اس کے حساب کتاب سنبھالنے کے انداز کے باعث تھی، یا اس کے حساب کتاب میں اتنی گڑبڑ ہمارے معاملات کی وجہ سے تھی۔ وہ آب پاشی کے منصوبوں کے تخمینے لگاتا اور ان کے نقشے بھی بناتا اور ایک بڑے تختۂ سیاہ کو خطوط و اعداد اور ترکی تحریر کے الفاظ سے بھر دیتا۔ اکثر ہمارے والد اور وہ گھنٹوں مطالعہ خانہ میں بند رہتے (یہ سب سے لمبے وقفے ہوتے جو کوالیئے وہاں گزارتا تھا)۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیرن کی ناراض آواز اور جھگڑے کی اونچی آوازیں آنے لگتیں لیکن کوالیئے کی آواز بمشکل ہی کبھی سنی گئی ہو گی۔ پھر دروازہ کھلتا اور اپنی عبا کی تہوں میں لپٹا، سر پر ٹوپی جمائے، کوالیئے نمودار ہوتا، اپنے چھوٹے تیز قدموں سے شیشے والے دروازے کی طرف بڑھتا اور باہر باغ میں نکل جاتا۔ ''اینیا سلویو! اینیا سلویو!'' ہمارے ابا اس کے پیچھے

Scanned with CamScanner

دوڑتے ہوئے پکارتے ،نگران کا ناجائز بھائی پہلے ہی انگور کی بیلوں کے درمیان یا لیموؤں کے کنج میں پہنچ چکا ہوتا اور پھر پتوں کے درمیان ہٹیلے پن سے ہلتی ہوئی سرخ ترکی ٹوپی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ ہمارے والد آوازیں دیتے ہوئے پیچھے پیچھے جاتے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ان دونوں کو واپس آتے دیکھتے — بیرن ہمیشہ باتیں کرتے اور اپنے بازو ہلاتے ہوئے اور پستہ قد کوا لیئے ، اپنی عبا کی جیبوں میں مٹھیاں بھینچے لنگڑا لنگڑا کے ان کے ساتھ چلتا ہوا۔

۸

اُن دنوں، جزوی طور پر خود اپنی صلاحیتیں آزمانے اور محض یہ دیکھنے کے لیے کہ اوپر درختوں پر وہ کیا کچھ کرسکتا ہے،کوسیمو نشانہ بازی کے مقابلے یا مشق کے لیے زمین پر لوگوں کو اکثر چنوتی دیتا تھا۔ وہ شرارتی لڑکوں کو چھلا پھینکنے میں چنوتی دیتا۔ ایک دن وہ پورتا کا پیری کے نزدیک خانہ بدوشوں اور پامالوں کے جھونپڑوں کے درمیان تھے۔ کوسیمو گلِ خطمی کے ایک بے برگ و بار درخت سے ان کے ساتھ چھلوں کا کھیل کھیل رہا تھا کہ اس نے ایک گھڑسوار کو آتے دیکھا۔ وہ سیاہ چوغے میں لپٹا ہوا ایک طویل القامت اور قدرے خمیدہ شخص تھا۔ بھیڑ منتشر ہوگئی جبکہ عورتیں اپنے جھونپڑوں کی دہلیزوں پر کھڑی دیکھتی رہیں۔

بیرن آرمینیو نے ٹھیک درخت کے نیچے گھوڑا روکا۔ شام لال ہو رہی تھی۔ کوسیمو برہنہ شاخوں کے درمیان ایستادہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ گھونگھوں والے کھانے کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ باپ بیٹے نے اپنے آپ کو اس طرح روبرو پایا۔ بہت سارے دن گزر چکے تھے۔ حالات بدل چکے تھے۔ دونوں جانتے تھے کہ اب یہ گھونگھوں کا معاملہ نہیں ہے، نہ ہی بیٹے کی فرمانبرداری یا باپ کی حاکمیت کا، اور یہ کہ بہت ساری منطقی و معقول باتیں جو کہی جاسکتی ہیں، اب بے محل ہوں گی۔ اس کے باوجود انھیں کچھ نہ کچھ کہنا تو تھا۔

''تم اپنے آپ کو تماشا بنا رہے ہو!'' والد نے تلخی سے آغاز کیا، ''واقعی شریفوں کے شایاں!''

(وہ اپنی انتہائی سنجیدہ سرزنشوں کی طرح اسے رسمی ''آپ'' سے مخاطب کر رہے تھے لیکن اب اس لفظ کے

Scanned with CamScanner

استعمال میں ایک مفہوم فاصلے اور بیگانگی کا بھی تھا۔)

''شریف، میرے محترم والد، شریف ہے، خواہ وہ زمین پر ہو یا درختوں کی پھننگوں پر،'' کوسیمو نے جواب دیا اور فوراً اضافہ کیا، ''اگر وہ شائستگی کا رویہ اختیار کرتا ہو۔''

''عمدہ قول!'' بیرن نے سنجیدگی سے اعتراف کیا، ''اور پھر بھی محض تھوڑی دیر پہلے تم ہمارے ایک مزارعے کے آلو بخارے چرا رہے تھے۔''

یہ بات درست تھی۔ میرے بھائی کو دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ کیا جواب دیتا؟ وہ مسکرایا مگر نخوت یا طنز سے نہیں بلکہ جھینپ کر، اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

بیرن بھی حزن سے مسکرا دیے اور کسی نہ کسی وجہ سے ان کا چہرہ بھی سرخ ہو گیا۔

''تم علاقے کے بدترین بدمعاش لڑکوں کے ساتھ مشترک مقصد اپنا رہے ہو!'' پھر وہ بولے۔

''نہیں، میرے محترم والد، میں اکیلا ہوں، اور ہر کوئی اپنے لیے کام کرتا ہے،'' کوسیمو نے ثابت قدمی سے کہا۔

''میں تم سے نیچے زمین پر آنے کا مطالبہ کرتا ہوں،'' بیرن نے ایک پرسکون بلکہ کمزور آواز میں کہا، ''اور اپنے رتبے کی ذمے داریاں سنبھالنے کو کہتا ہوں!''

''میں آپ کی فرمانبرداری کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا، میرے محترم والد،'' کوسیمو نے کہا، ''مجھے بہت افسوس ہے۔''

وہ دونوں پریشان تھے، اور اُکتائے ہوئے۔ ہر ایک جانتا تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ ''اور تمھاری پڑھائی کا کیا ہوگا؟ ایک مسیحی کی حیثیت سے تمھاری عبادت کا کیا ہوگا؟'' والد نے کہا، ''کیا تم ایک امریکی وحشی کی طرح بڑے ہونا چاہتے ہو؟''

کوسیمو خاموش تھا۔ یہ وہ سوالات تھے جو اس نے ابھی تک اپنے آپ سے نہیں کیے تھے اور نہ اس کی ایسی خواہش تھی۔ پھر وہ بے ساختہ بولا، ''محض اس لیے کہ میں چند گز اوپر ہوں، کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی تعلیم مجھ تک نہیں پہنچ سکتی؟''

یہ بھی ایک عمدہ جواب تھا، حالانکہ اس جواب نے اس کے دائرۂ عمل کو ایک طرح سے گھٹا دیا تھا، اور یہ کمزوری کی علامت تھی۔

Scanned with CamScanner

والد نے اس بات کو محسوس کر لیا اور وہ مزید مصر ہو گئے۔ ''بغاوت گزوں میں نہیں ناپی جا سکتی،'' انھوں نے کہا، ''انتہائی مختصر نظر آنے والا سفر بھی بے حاصل ہو سکتا ہے۔''

یہ وہ لمحہ تھا کہ میرا بھائی کوئی اور ارفع جواب لاتا، غالباً کوئی اور لاطینی قول بیان کرتا، مگر فوری طور پر اسے کچھ یاد ہی نہیں آیا، حالانکہ بیسیوں اقوال اسے زبانی یاد تھے۔ اس کے بجائے وہ اس تمام سنجیدگی سے اچانک اُکتا گیا اور اس نے چلّا کر کہا، ''لیکن درختوں پر سے میں زیادہ دور تک مُوت سکتا ہوں۔'' گو یہ فقرہ زیادہ بامعنی نہیں تھا مگر اس نے حجت کو تمام کر دیا۔

پورتا کا پیری کے اطراف بدحالوں کی ایک اونچی آواز اٹھی جیسے انھوں نے یہ فقرہ سن لیا ہو۔ بیرن دی روندو کا گھوڑا بدک گیا۔ انھوں نے باگیں کھینچیں اور اپنے آپ کو چوغے میں اچھی طرح لپیٹ کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر وہ گھومے، چوغے سے ایک ہاتھ باہر نکال کر آسمان کی طرف اشارہ کیا جو اچانک سیاہ بادلوں سے ڈھک گیا تھا، اور بولے، ''ہوشیار رہنا، بیٹا، کوئی ایسا بھی ہے جو ہم سب پر مُوت سکتا ہے!'' اور ان الفاظ کے ساتھ اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

دیہاتی علاقے میں دیر سے متوقع بارش موٹے موٹے بکھرے ہوئے قطروں میں برسنے لگی۔ سروں پر بوریاں ڈالے شرارتی بچے جھونپڑوں کے درمیان بھاگتے دوڑتے ہوئے مقامی بولی میں گانے لگے، ''بارش آئی! بارش آئی! ہو گئی دور شکایت بھائی!'' کوسیمو پانی سے بوجھل پتوں میں غائب ہو گیا جو ذرا سا چھو جانے پر اس کے سر پر پھواریں انڈیل رہے تھے۔

جونہی مجھے بارش ہونے کا احساس ہوا مجھے اُس کی فکر لاحق ہو گئی۔ میں نے تصور کیا کہ وہ پانی سے شرابور، بارش کی ترچھی بوچھاروں سے بچنے میں ناکام، کسی درخت کے سہارے دبکا ہوا ہے، اور میں جانتا تھا کہ طوفان اسے لوٹنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ سو میں جلدی سے ماں کی طرف گیا۔ ''بارش ہو رہی ہے! کوسیمو کیا کرے گا، والدہ محترمہ؟''

جنرلیسا نے پردہ ہٹایا اور برستی بارش کو دیکھا۔ وہ پرسکون تھیں۔ ''شدید بارش میں سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز کیچڑ ہوتی ہے۔ وہاں اوپر وہ اس سے دور ہے۔''

''لیکن درختوں میں اسے مناسب پناہ مل سکے گی؟''

''وہ اپنے خیموں میں چلا جائے گا۔''

Scanned with CamScanner

"کون سے خیمے، والدہ محترمہ؟"

"اتنی دوراندیشی تو اس میں رہی ہوگی کہ انھیں وقت پر بنالے۔"

"لیکن آپ کے خیال میں یہ بہتر نہیں کہ میں اسے جا کر ڈھونڈوں اور ایک چھتری دے آؤں؟"
لفظ چھتری نے جیسے انھیں اچانک مشاہدے کی جگہ سے کھینچ کر دوبارہ مادرانہ انہماک میں دھکیل دیا ہو، جنرلیسا نے کہنا شروع کیا، "ہاں، بالکل مناسب۔ اور شربتِ سیب کی ایک بوتل، خوب گرم، اونی موزے میں لپٹی ہوئی! اور کچھ موم جامہ، شاخوں پر پھیلانے اور نمی کی ترسیل روکنے کے لیے... لیکن وہ اس وقت کہاں ہوگا، بے چارہ بچہ...! ہمیں امید کرنی چاہیے کہ تم اسے ڈھونڈ نکالوگے..."

گٹھریوں سے لدا پھندا، بغل میں کوسیمو کے لیے ایک بند چھتری لیے، میں ایک بڑی ساری سبز چھتری تلے باہر بارش میں نکل پڑا۔

میں نے مخصوص سیٹی بجائی مگر درختوں پر بارش کی بے انت ٹپ ٹپ کے سوا کوئی جواب نہ پایا۔ اندھیرا ہو رہا تھا۔ باغ کے احاطے سے باہر نکلتے ہی میں اپنے راستے سے ناآشنا تھا اور پھسلتے پتھروں، اسفنجی گھاس اور جوہڑوں میں انکل پچو قدم رکھ رہا تھا۔ میں اس دوران سیٹی بجاتے ہوئے چھتری پیچھے کی طرف جھکا دیتا تھا کہ سیٹی کی آواز اوپر کی طرف جائے مگر ایسا کرنے میں بارش چابک کی طرح میرے چہرے پر پڑتی اور سیٹی کی آواز کو میرے لبوں سے بہالے جاتی۔ میرا ارادہ عوامی زمینوں کی طرف جانے کا تھا مگر میں اندھیرے میں کھو گیا اور گٹھریاں اور چھتریاں مضبوطی سے تھامے وہیں کھڑا رہا۔ صرف شربتِ سیب کی اونی موزے میں لپٹی بوتل مجھے کچھ حرارت پہنچا رہی تھی۔

پھر درختوں کے درمیان، اوپر اندھیرے میں، مجھے ایک روشنی نظر آئی جو نہ تو چاند کی ہو سکتی تھی نہ ستاروں کی، اور اپنی سیٹی پر مجھے ایسا لگا کہ اس نے جواب میں سیٹی بجائی ہے۔

"کوسیمو...و...و!"

"بیاجیو...و...و!" درختوں کی پھننگوں پر سے بارش میں آواز آئی۔

"تم کہاں ہو؟"

"یہاں... میں تمھاری طرف آ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔ میں بھیگ رہا ہوں!"

ہم نے ایک دوسرے کو ڈھونڈ لیا۔ کمبل میں لپٹا ہوا وہ ایک بیدِ مجنوں کے زیریں دوشاخے تک

Scanned with CamScanner

نیچے آیا اور اس کی پیچیدہ گتھی ہوئی شاخوں کے ذریعے مجھے ایک اونچے تنے والے سفیدے کے درخت تک لے گیا جہاں سے وہ روشنی آ رہی تھی۔ میں نے چھتری اور کچھ گٹھریاں اسے فوراً دے دیں۔ ہم کھلی چھتریوں کے ساتھ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے، لیکن یہ ناممکن تھا اور ہم بھیگنے سے نہ بچ سکے۔ آخر کار میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں وہ مجھے لے جا رہا تھا، لیکن ایک مدھم روشنی کے سوا کچھ نہ دیکھ پایا جو ایک خیمے کے پردوں سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔

کوسیمو نے ایک پردہ ہٹایا اور مجھے اندر لے گیا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ میں ایک طرح کے چھوٹے سے کمرے میں ہوں جو ہر طرف سے پردوں اور قالینوں سے بند اور ڈھکا ہوا ہے۔ درخت کا مرکزی حصہ کمرے کو قطع کر رہا تھا اور اس کا فرش بلّیوں سے بنا تھا جنھیں موٹی موٹی شاخوں نے سہار رکھا تھا۔ اس لمحے تو یہ کمرہ مجھے محل لگا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہونے لگا کہ یہ کس قدر غیر مستحکم ہے۔ اس کے اندر دو آدمیوں کی موجودگی سے توازن بگڑنے لگا اور کوسیمو کو فوراً درزیں بند کرنے میں جٹ جانا پڑا۔ میں جو چھتریاں لایا تھا اس نے انھیں بھی کھول کر چھت کے دو سوراخوں پر رکھا مگر اور کئی جگہوں سے بھی پانی آ رہا تھا۔ ہم دونوں تربتر ہو گئے اور ہمیں ایسی ٹھنڈ لگی جیسے ہم اتنی دیر باہر رہے ہوں۔ تاہم وہاں کمبلوں کی اتنی تعداد جمع کی گئی تھی کہ ہم نے صرف اپنے سروں کو باہر چھوڑتے ہوئے خود کو مکمل طور پر ڈھانپ لیا۔ لالٹین سے ایک غیر یقینی، بھڑکتی ہوئی روشنی آ رہی تھی اور شاخیں اور پتے اس عجیب تعمیر کے بام و دیوار پر الجھے ہوئے سائے ڈال رہے تھے۔ کوسیمو بڑے بڑے گھونٹ لے کر شربتِ سیب پی رہا تھا اور ہانپتے ہوئے ''فوہ فوہ'' کر رہا تھا۔

''بڑا اچھا گھر ہے،'' میں بولا۔

''اوہ، یہ صرف عارضی ہے،'' کوسیمو نے جلدی سے جواب دیا۔ ''مجھے اس کے بارے میں بہتر طریقے سے سوچنا ہوگا۔''

''تم نے یہ سارے کا سارا خود بنایا ہے؟''

''یقیناً، اور کون بناتا؟ یہ خفیہ ہے۔''

''کیا میں یہاں آ سکتا ہوں؟''

''نہیں، ورنہ تم کسی اور کو راستہ دکھا دو گے۔''

''ابا نے کہا ہے وہ تمھاری تلاش ختم کر رہے ہیں۔''

''اس کے باوجود اسے راز ہی رہنا چاہیے۔''

''ان لڑکوں کی وجہ سے جو چوری کرتے ہیں؟ مگر کیا وہ تمھارے دوست نہیں ہیں؟''

''بعض اوقات ہوتے ہیں اور بعض اوقات نہیں ہوتے۔''

''اور وہ ٹٹو سوار لڑکی؟''

''تمھیں اس سے کیا لینا ہے؟''

''میرا مطلب تھا وہ تمھاری دوست ہے، نہیں؟ اور تم اکٹھے کھیلتے ہو، کھیلتے ہو نا؟''

''بعض اوقات کھیلتے ہیں اور بعض اوقات نہیں کھیلتے۔''

''بعض اوقات ہی کیوں؟''

''کیونکہ ہو سکتا ہے میں نہ چاہوں، ہو سکتا ہے وہ نہ چاہے۔''

''اور اسے، کیا تم اسے یہاں اوپر آنے دو گے؟''

کوسیمو تیوری چڑھائے ایک شاخ پر چٹائی بچھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''ہاں اگر وہ آئی تو میں اسے اوپر آنے دوں گا،'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا وہ آنا نہیں چاہتی؟''

کوسیمو پھٹ پڑا۔ ''وہ چلی گئی ہے۔''

''یہ بتاؤ،'' میں نے سرگوشی کی، ''تمھاری منگنی ہو گئی ہے؟''

''نہیں،'' میرے بھائی نے جواب دیا اور اپنے آپ کو ایک طویل خاموشی میں لپیٹ لیا۔

اگلے دن موسم خوشگوار تھا اور یہ طے ہوا کہ کوسیمو، ایبے فوشیلی فلیئر سے دوبارہ پڑھنا شروع کرے گا۔ لیکن کیسے؟ یہ نہیں بتایا گیا۔ بیرن نے سادگی بلکہ اکھڑ پن کے ساتھ ایبے سے کہا، (''... محض وہاں کھڑے ہو کر مکھیوں کو دیکھنے کے بجائے...'') کہ میرا بھائی جہاں کہیں بھی ہو اسے جا کر ڈھونڈے اور ورجل کا تھوڑا سا ترجمہ کرائے۔ پھر، اس خوف سے کہ انھوں نے ایبے کو بہت دشوار صورت حال میں ڈال دیا ہے، بیرن نے اس کا کام آسان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، مجھ سے کہا، ''جاؤ اپنے بھائی

Scanned with CamScanner

سے کہو کہ اپنے لاطینی سبق کے لیے آدھے گھنٹے بعد باغ میں آجائے۔'' انھوں نے یہ بات فطری انداز کے ساتھ ایسے لہجے میں کہی جسے وہ آئندہ کے لیے بھی برقرار رکھنے کا ارادہ رکھتے تھے؛ کوسیمو کے درختوں پر چلے جانے کے بعد بھی ہر چیز حسبِ سابق ہی رہنی چاہیے تھی۔

چنانچہ پڑھائی شروع ہوئی۔ میرا بھائی اپنی لٹکتی ہوئی ٹانگوں کے ساتھ بلوط کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا اور ایبے نیچے گھاس میں ایک اسٹول پر۔ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے وہ چھ چھ ارکان والے مصرعے لحن کے ساتھ سنگت میں پڑھ رہے تھے۔ میں وہیں آس پاس کھیلتا رہا اور پھر تھوڑی دیر کے لیے ذرا آگے نکل گیا۔ جب میں لوٹا تو ایبے درخت پر تھا۔ موزوں میں لپٹی اپنی لمبی پتلی ٹانگوں کے ساتھ وہ ایک شاخ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور کوسیمو ایک کہنی کے ذریعے اس کی مدد کر رہا تھا۔ انھوں نے بوڑھے آدمی کے لیے ایک آرام دہ جگہ ڈھونڈ لی اور کتاب پر جھکتے ہوئے ایک مشکل حصے کو اکٹھے پڑھنے لگے۔ میرا بھائی بہت مستعدی دکھاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

پھر، میں نہیں کہہ سکتا کیا ہوا، شاگرد کیوں بھاگ گیا، غالباً اس لیے کہ ایبے کا ذہن بھٹک گیا تھا اور اس نے حسبِ معمول خلا میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اچانک صرف بوڑھے پادری کی سیاہ شبیہ شاخوں میں دبکی ہوئی رہ گئی۔ کتاب اس کے گھٹنوں پر تھی اور وہ پاس اڑتی ہوئی ایک سفید تتلی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا منھ کھلا تھا اور نظریں تتلی کا تعاقب کر رہی تھیں۔ جب تتلی نظر سے اوجھل ہوئی تو ایبے کو اچانک احساس ہوا کہ وہ درخت پر تنہا ہے اور وہ خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے تنے کو جکڑ لیا اور چلّانے لگا، ''بچاؤ! بچاؤ!'' یہاں تک کہ لوگ سیڑھی لے کر آ پہنچے۔ وہ رفتہ رفتہ پرسکون ہوا اور نیچے اترا۔

۹

درحقیقت، کوسیمو، اپنے اس فرار کے باوجود جس نے ہمیں خاصی حد تک پریشان کر رکھا تھا، تقریباً اسی قربت سے ہمارے ساتھ رہتا تھا جس طرح پہلے رہا کرتا تھا۔ وہ ایسا تنہا شخص تھا جسے لوگوں سے گریز نہیں تھا۔ درحقیقت ایک طرح سے وہ انھیں ہر چیز سے زیادہ پسند کرتا ہوا لگتا تھا۔ ایسی جگہوں

Scanned with CamScanner

میں جہاں کسان کھدائی کرتے ہوتے یا کھاد بناتے ہوتے یا فصل کاٹ رہے ہوتے وہ کسی درخت پر بیٹھ جاتا اور خوش خلقی سے انھیں سلام کرتا۔ وہ حیران ہو کر اپنے سر اٹھاتے اور وہ فوراً ہی انھیں دکھانے کی کوشش کرتا کہ وہ کہاں ہے۔ کیونکہ اس نے انگوٹھا نتھنے پر رکھ کر انگلیاں پھیلانے اور راہگیروں کو چڑانے کے اس شغل سے نجات حاصل کر لی تھی جس میں ہم دونوں نے، جب ہم پہلے درختوں پر اکٹھے ہوا کرتے تھے، جی بھر کے مزے لیے تھے۔ پہلے پہل، اسے شاخوں پر اتنے فاصلے طے کرتے دیکھ کر کسان بڑے پریشان ہوئے اور یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ آیا اسے ہیٹ اتار کر سلام کریں جس طرح دیگر شرفا کو کرتے ہیں، یا اس پر چلائیں جس طرح شرارتی بچوں پر چلاتے ہیں۔ پھر انھیں اپنے کام یا موسم کے بارے میں اس کے ساتھ گپ شپ کرنے کی عادت پڑ گئی اور وہ اس کھیل کو جو وہ وہاں اوپر کھیل رہا تھا، ان بہت سے کھیلوں کی نسبت جو وہ شرفا کو کھیلتے دیکھ چکے تھے، بہتر یا بدتر سمجھنے سے قاصر معلوم ہونے لگے۔

وہ ایک وقت میں پورے آدھے آدھے گھنٹے تک بیٹھا درختوں سے انھیں کام کرتے دیکھتا اور بیجوں اور کھاد کے بارے میں سوالات کرتا؛ ایسا کرنے کا خیال اسے تب کبھی نہیں آیا تھا جب وہ زمین پر تھا، کہ اس وقت اسے شرم نے دیہاتیوں یا نوکروں سے مخاطب ہونے سے روک رکھا تھا۔ بعض اوقات وہ انھیں بتاتا کہ وہ جو نالی کھود رہے ہیں سیدھی جا رہی ہے یا ٹیڑھی ہے، یا یہ کہ پڑوسی کے کھیت میں ٹماٹر پک چکے ہیں۔ بعض اوقات وہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے خود کو پیش کرتا، مثلاً درانتی چلانے والے کی بیوی سے سان لانے کے لیے کہنا، یا کسی کو میوہ زار میں پانی بند کرنے کی تنبیہ کرنا۔ اور اگر، کسانوں کے لیے ان پیغامات کے سلسلے میں گھومنے کے دوران، کسی اناج کے کھیت پر بیٹھے چڑیوں کے غول پر اس کی نظر پڑ جاتی تو وہ چلاتا اور انھیں بھگانے کے لیے اپنی ٹوپی ہلاتا۔

جنگل کے گرد آنے جانے کے دوران انسانوں سے اس کی مڈبھیڑ ہر چند کہ شاذ ہی ہوتی مگر یاد رکھنے کے قابل ہوتی کیونکہ یہ ایسے لوگوں سے ہوتی جن سے ہم جیسے لوگ کبھی نہیں مل پاتے۔ ان دنوں قسم قسم کے سیلانی جنگلوں میں پڑاؤ ڈالا کرتے تھے۔ ان میں کوئلہ گر، قلعی گر، شیشہ تراش اور ایسے خاندان ہوتے جنھیں بھوک نے ان غیر یقینی پیشوں سے روزی کمانے کے لیے اپنے گھروں سے دور دھکیل دیا تھا۔ وہ کھلے میدان میں اپنے مرمت خانے بنا لیتے اور سونے کے لیے شاخوں سے جھونپڑیاں کھڑی کر لیتے۔ پہلے پہلے وہ اس سمور پوش لڑکے کو اپنے سروں پر سے گزرتا دیکھ کر خوفزدہ ہوئے، خاص طور پر

عورتیں، جنھوں نے اسے کوئی بھتنا سمجھا، پھر وہ ان کا دوست بن گیا اور انھیں کام کرتے دیکھنے میں گھنٹوں گزارنے لگا۔ شام کو جب وہ الاؤ کے گرد بیٹھتے تو وہ کسی نزدیکی شاخ پر بیٹھ کر ان کی کہانیاں سنتا۔

سب سے زیادہ کوئلہ گر کوٹے ہوئے کوئلے سے بھری ایک کھلی جگہ پر آباد تھے۔ وہ برگاموکے رہنے والے تھے اور ان کی بولی سمجھنا ناممکن تھا۔ وہ چلاّ کر ''ہوراہوتا'' کی آواز لگاتے۔ وہ سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ الگ تھلگ، ایک منظم جماعت تھے اور خون، دوستی اور دشمنی کے رشتوں کے ساتھ سارے جنگل میں پھیلے ہوئے تھے۔ بعض اوقات کوسیمو ان کے کسی ایک اور دوسرے گروہ کے درمیان پیغامبر کا کردار ادا کرتا، خبریں پہنچاتا اور ان کے لیے سندیسوں کے متعدد سفر کرتا۔

''سرخ بلوط کے نیچے جو لوگ ہیں انھوں نے کہا ہے کہ تمھیں 'ہانفالاہاپاہوتال ہوک!' کہوں۔''

''انھیں جواب دو، 'ہین ہوبت ہودی ہوت!'''

وہ ان حلقی آواز والے پراسرار بولوں کو یاد رکھتا اور جس طرح صبح جگانے والی چڑیوں کی چہکار کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا، اسی طرح ان الفاظ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا۔

اس وقت تک یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بیرن دی روندو کا ایک بیٹا مہینوں سے درختوں پر ہے۔ اس پر بھی ہمارے والد اس بات کو اجنبیوں سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ مثال کے طور پر کاؤنٹ اور کاؤنٹس دیستومیک، فرانس جاتے ہوئے جہاں خلیج تولوز میں ان کی جائیداد تھی، ہمیں ملنے آئے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس ملاقات کے پیچھے کون سا ذاتی مفاد تھا۔ مختلف جائیدادوں پر دعوے، ان کے بیٹے کے لیے، جو پادری تھا، کسی تعلقے کی توثیق جس کے لیے انھیں بیرن دی روندو کی رضامندی درکار تھی۔ جیسا کہ تصور کیا جا سکتا ہے، ہمارے والد نے اس اتحاد پر اپنے سلسلۂ شاہی کے ان دعووں کے لیے جو انھیں اومبروسا پر تھے، منصوبوں کا ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔

ختم نہ ہونے والے آداب ورسوم اور کورنشوں کے ساتھ ایک اذیت خیز، اکتا دینے والی دعوت ہوئی۔ مہمانوں کے ساتھ ایک پستہ قد، وِگ پوش، نوجوان بیٹا تھا۔ بیرن نے اپنے بیٹوں کا تعارف کرایا، یعنی صرف میرا، اور کہا، ''میری بیٹی باتیستا، بے چاری لڑکی، ایسی گوشہ نشین زندگی گزارتی ہے، ایسی نیک ہے، میں نہیں کہہ سکتا آپ اس سے مل بھی پائیں گے۔'' اور عین اسی لمحے وہ احمق آن ٹپکی۔

اس نے منھ پر رنگ برنگی پٹیوں اور جھالروں سے مزین راہباؤں کا نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر پاؤڈر اور ہاتھوں میں دستانے تھے۔ اس بات پر زور دینا چاہیے کہ نو عمر مارکوئیس دیلا میلا والے واقعے کے بعد سے ہماری بہن نے کسی نوجوان پر کبھی نظر نہیں ڈالی تھی۔ ہاں ملازم لڑکوں اور گاؤں کے لڑکوں کی بات اور ہے۔ نوجوان کاؤنٹ دیستومیک آداب کے لیے جھکا تو وہ ہسٹیریائی انداز میں ہنسنے لگی۔ بیرن جو اپنی بیٹی کو ایک ضائع شدہ قضیہ سمجھ کر پہلے ہی اپنے ہاتھ دھو چکا تھا، اب اپنے ذہن میں نئے امکانات کا جائزہ لینے لگا۔

لیکن بوڑھے کاؤنٹ کا انداز بے اعتنائی ظاہر کر رہا تھا۔ اس نے پوچھا، ''کیا آپ کا ایک اور بیٹا نہیں تھا، موسیو آرمینیو؟''

''ہاں، بڑا بیٹا،'' ہمارے والد نے کہا، ''لیکن، محض اتفاق کی بات ہے، وہ شکار پر گیا ہوا ہے۔''

انھوں نے جھوٹ نہیں بولا تھا کیونکہ ان دنوں کوسیمو طوطیوں اور خرگوشوں کے پیچھے اپنی بندوق کے ساتھ ہر وقت جنگل ہی میں ہوتا تھا۔ یہ بندوق وہ تھی جو میں نے اسے لے جاکے دی تھی۔ یہ ہلکی بندوق تھی جو باتیستا نے چوہوں کے خلاف استعمال کی تھی اور اس خاص کھیل کو چھوڑنے کے بعد کچھ وقت سے ایک کیل پر لٹکا رکھی تھی۔

کاؤنٹ ہمارے علاقے میں پائے جانے والے شکار کے بارے میں پوچھنے لگا۔ بیرن نے اپنے جواب عمومی باتوں تک محدود رکھے کیونکہ اپنے اردگرد کی دنیا میں دلچسپی نہ لینے کے باعث وہ بندوق چلانا نہیں جانتا تھا۔ اب میں نے گفتگو میں مداخلت کی، حالانکہ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ جب بڑے بول رہے ہوں تو مجھے نہیں بولنا ہے۔

''تم جیسا چھوٹا بچہ ان باتوں کے بارے میں کیا جان سکتا ہے؟'' کاؤنٹ نے پوچھا۔

''میرا بھائی جو شکار نیچے گراتا ہے میں اٹھا کر لاتا ہوں اور پھر اسے اوپر پہنچاتا ہوں...'' ابھی میں بول ہی رہا تھا کہ ہمارے والد نے مجھے ٹوک دیا۔

''تمھیں کس نے بولنے کو کہا ہے؟ جاؤ، کھیلو۔''

ہم باغ میں تھے۔ چونکہ گرمیوں کے دن تھے لہٰذا شام ہونے کے باوجود ابھی روشنی تھی۔ اور اب چیڑ اور بلوط کے درختوں پر کوسیمو خاموشی سے نمودار ہوا۔ اس کے سر پر بلی کے سمور والی ٹوپی تھی اور ٹانگوں

Scanned with CamScanner

پر ساق پوش۔ایک کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی اور دوسرے پر بھالا۔

''ارے، ارے!'' کاؤنٹ نے کھڑے ہوتے ہوئے اور بہتر طور سے دیکھنے کے لیے اپنا سر گھماتے ہوئے، حیران ہو کر اظہار کیا۔''وہ کون ہے؟ وہ درختوں پر کون ہے؟''

''کیا، کیا؟ میں واقعی نہیں جانتا...'' ہمارے والد نے کہنا شروع کیا، اور اس سمت میں دیکھنے کے بجائے جہاں وہ اشارہ کر رہا تھا، کاؤنٹ کی آنکھوں میں دیکھنے لگے جیسے اپنے آپ کو یقین دلا رہے ہوں کہ وہ ٹھیک سے دیکھ سکتے ہیں۔

اس دوران کوسیموان کے عین اوپر ایک مقام پر آ گیا تھا اور ٹانگیں چوڑی کیے ایک دوشاخے پر کھڑا تھا۔

''آہ! یہ میرا بیٹا ہے۔ ہاں، کوسیمو۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں محض بچہ ہے۔ ہمیں حیران کرنے کے لیے اوپر چڑھ گیا ہے...''

''یہ آپ کا بڑا بیٹا ہے؟''

''ہاں، ہاں۔ دونوں لڑکوں میں بڑا یہ ہے، مگر صرف ذرا ہی بڑا۔ آپ جانتے ہیں دونوں ابھی بچے ہیں، کھیل رہے ہیں...''

''شاخوں پر اس طرح گھومنے والا بچہ یقیناً بڑا ذہین ہوگا اور وہ بھی اسلحے کے ساتھ...''

''ایہہ، محض کھیل رہا ہے!'' اور جھوٹ بولنے کی ایک زبردست کوشش کے ساتھ، جس نے انھیں تمام تر سرخ کر دیا، انھوں نے آواز دی، ''تم وہاں اوپر کیا کر رہے ہو؟ ایہہ؟ ذرا نیچے آؤ گے؟ آؤ اور ہمارے محترم کاؤنٹ کو آداب کرو!''

کوسیمو بلی کے سمور والی ٹوپی اتار کر خمیدہ ہوا۔''میری تعظیمات، محترم کاؤنٹ۔''

''ہاہاہا!'' کاؤنٹ ہنس پڑا۔''بہت خوب، بہت خوب! اسے وہاں اوپر ہی رہنے دیجیے، اسے اوپر ہی رہنے دیجیے، موسیو آرمینیو! یہ لڑکا درختوں پر چڑھنے میں بہت تیز ہے!'' اور وہ ہنسنے لگا۔

اور وہ چھوٹا بندر نما کاؤنٹ متواتر دہرائے جا رہا تھا، ''طبع زاد، بالکل طبع زاد!''

کوسیمو وہیں دوشاخے پر بیٹھ گیا۔ ہمارے والد نے موضوع بدلا اور کاؤنٹ کی توجہ ہٹانے کی امید میں بے تکان بولنے لگے۔ مگر کاؤنٹ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نظریں اٹھاتا اور میرا بھائی ہمیشہ وہاں

Scanned with CamScanner

ہوتا، اِس درخت پر یا اُس درخت پر، اپنی بندوق صاف کرتے ہوئے یا اپنے ساق پوشوں کو چکنا کرتے ہوئے یارات کی آمد آمد کے باعث، اپنی فلالین کی قمیص پہنتے ہوئے۔

''اوہ، لیکن دیکھو! وہ وہاں اوپر ہر کام کر سکتا ہے، یہ لڑکا سب کچھ کر سکتا ہے! کیسی مزے کی بات ہے! میں اس کے بارے میں اہلِ دربار کو بتاؤں گا، اسی دن جس دن پہلی بار میں اپنے پادری بیٹے کو بتاؤں گا! اور میں اپنی خالہ شہزادی کو بھی بتاؤں گا!''

اب میرے والد اپنے آپ پر بمشکل قابو رکھ پا رہے تھے۔ اور پھر ان کے ذہن پر ایک اور بوجھ بھی تھا۔ انھیں آس پاس اپنی بیٹی نظر نہیں آ رہی تھی اور نوجوان کاؤنٹ بھی غائب تھا۔

کوسیمو اپنے چھان بین کے دورے پر نکلا ہوا تھا اور اب ہانپتا ہوا واپس آ رہا تھا۔ ''باتیستا نے اسے ہچکیاں لگا دی ہیں! باتیستا نے اسے ہچکیاں لگا دی ہیں!''

کاؤنٹ فکر مند نظر آنے لگا۔ ''اوہ، یہ تو افسوس ناک بات ہے! میرے بیٹے کو ہچکیوں سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ ذرا اچھے لڑکے کی طرح جاؤ اور دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ انھیں واپس لے آؤ۔ ان سے واپس آنے کو کہو۔''

کوسیمو اچھلتا ہوا گیا اور پہلے سے زیادہ ہانپتا ہوا لوٹا۔ ''وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ وہ اس کی ہچکیاں ختم کرنے کے لیے اس کی قمیص میں زندہ چھپکلی ڈالنا چاہتی ہے! اور وہ اسے ایسا کرنے نہیں دینا چاہتا!'' اور وہ ایک بار اور دیکھنے کے لیے چھلانگیں مارنے لگا۔

اس طرح وہ شام ہم نے گھر پر گزاری، جو حقیقت میں دوسری شاموں سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی، جب کوسیمو اوپر درختوں پر سے ہماری زندگیوں کے کناروں پر دبے پاؤں چل رہا تھا۔ مگر اس بار ہمارے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ نتیجے کے طور پر میرے بھائی کے طرزِ عمل کی خبر یورپ کے سارے درباروں میں پھیل گئی جس سے میرے والد کو بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن یہ ندامت بالکل بے بنیاد تھی کیونکہ کاؤنٹ دیستومیک ہمارے خاندان کے بارے میں پسندیدہ تاثر لے کر گیا جس کے نتیجے میں ہماری بہن باتیستا نوجوان کاؤنٹ کی منگیتر بن گئی۔

Scanned with CamScanner

۱۰

زیتون کے درخت اپنی پُر پیچ شکلوں کی وجہ سے کوسیمو کے لیے آرام دہ اور آسان رہگذار تھے: موٹی شاخوں کی کمی اور اپنی مخصوص ساخت کی وجہ سے نقل و حرکت میں پیدا ہونے والی یکسانیت کے باوجود وہ کھردری، دوستانہ چھال کے ان صابر درختوں سے گزر سکتا تھا، یا ان پر دم لے سکتا تھا۔ تاہم انجیر کے درخت پر، اس احتیاط کے ساتھ کہ شاخیں اس کا وزن سہار سکیں، وہ ہمیشہ کے لیے گھوم سکتا تھا۔ کوسیمو پتوں کے شہ نشین تلے کھڑا ہو کر، ڈنٹھلوں سے پھوٹتی کونپلوں کی خوشبو سونگھتے ہوئے، شاخوں اور کونپلوں کے جال سے چھنتی ہوئی دھوپ کا نظارہ کرتا اور سبز پھلوں کی بتدریج نمو کو دیکھتا۔ انجیر کا درخت اپنی پیچیچی بناوٹ اور بھڑوں کی بھنبھناہٹ سے اسے اندر تک بھرتا، اپنے اندر جذب کرتا محسوس ہوتا تھا؛ تھوڑی دیر بعد کوسیمو کو یوں محسوس ہونے لگتا کہ وہ خود انجیر بنا جا رہا ہے، اور وہ بے چین ہو کر وہاں سے چل دیتا۔ پہاڑی دیودار یا شہتوت کے سخت درختوں پر وہ ٹھیک ٹھاک رہتا تھا، افسوس یہ ہے کہ وہ خال خال تھے۔ یا اخروٹ کا درخت... بعض اوقات اپنے بھائی کو اخروٹ کے ایک پرانے درخت کے بے انت پھیلاؤ میں، جو کسی محل کی کئی منزلوں اور لاتعداد کمروں جیسا تھا، خود کو گم کرتے دیکھ کر میں اس خواہش کو خود پر غالب آتے پاتا کہ میں بھی اس کی نقل کروں اور وہاں اوپر جا کر رہوں؛ ایسی تھی وہ قوت اور ایسا تھا وہ تیقن جو اس درخت کو اپنے درخت ہونے میں تھا، سخت اور بھاری رہنے کا اس کا عزم اس کے پتوں تک سے عیاں تھا۔

کوسیمو گل خطمی (یا شاہ بلوط، جیسا کہ میں نے غالباً اپنے والد کی پُر تصنع زبان کے زیر اثر، اپنے باغ کے درختوں کا ذکر کرتے ہوئے انھیں کہا ہے) کے لہریا پتوں میں بھی کئی کئی مسرور گھنٹے گزارتا۔ وہ اس کی اترتی چھال کو پسند کرتا تھا اور جب کسی اور خیال میں محو ہوتا تو اپنی انگلیوں سے ایک ٹکڑا توڑ لیتا، نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ درخت کو اپنی نو زائیدگی کے طویل دردِ زہ میں مدد دینے کے لیے۔ یا وہ سفیدے کے درخت سے اس کی سفید چھال اتار لیتا اور پرانی زرد پھپھوندی کی تہیں سامنے آ جاتیں۔ اسے بوقیذار جیسے گانٹھ دار تنے بھی پسند تھے جن کی نرم کونپلیں اور چھوٹے نکیلے پتوں کے خوشے اور ڈنٹھل گھیروں میں سے پھوٹتے، لیکن نقل و حرکت کے لیے یہ درخت آسان نہیں تھا کہ اس کی نرم اور گتھی

شاخیں اوپر کی طرف بڑھتیں اور ان پر پاؤں جمانے کی بہت کم جگہ ہوتی۔ جنگل میں وہ بتولا اور بلوط کے درختوں کو ترجیح دیتا تھا۔ صنوبر کے درختوں کی شاخیں بہت پاس پاس ہونے کے علاوہ آسانی سے ٹوٹ کر بکھرنے لگتی تھیں اور مخروطیوں سے بھری ہونے کی وجہ سے اس کے لیے کوئی جگہ یا سہارا نہ چھوڑتی تھیں، اور بلوط کا درخت، اپنے خاردار پتوں، چھلڑوں، چھال اور اپنی اونچی شاخوں کی وجہ سے، دور رہنے کے لیے مناسب درخت نظر آتا تھا۔

ان موافقتوں اور ناموافقتوں کو پہچاننے میں، یا شعوری طور پر پہچاننے میں، کوسیمو کو وقت لگا۔ لیکن اُن ابتدائی دنوں میں بھی وہ اس کا ایک جبلّی حصہ بننے لگی تھیں۔ اب بات یہ ہے کہ وہ ایک تمام تر مختلف دنیا تھی جو خلا میں تنگ خم دار پلوں سے بنی تھی، گانٹھوں یا چھلکے یا تنوں کو کھردرا کرتے کھرونچوں سے عبارت تھی، اُن روشنیوں سے مملو تھی جو ہوا کی پہلی جنبش کے ساتھ کونپلوں پر کپکپاتے، یا آندھی میں پیڑ کے خم کھانے سے بادبانوں کی طرح ہلتے پتوں کی دبیز یا ہلکی نقابوں کے مطابق ان کی ہریالی کے رنگوں کو تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ اس دوران ہماری دنیا نیچے چپٹی پھیلی پڑی ہوتی اور ہمارے جسم بالکل غیر متناسب نظر آتے اور ہم اس کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں سمجھتے تھے جو وہاں اوپر وہ جانتا تھا؛ وہ جو درختوں کے خلیوں میں دوڑتے عرق، تنوں کے اندر گزرتے برسوں کے نشان لگاتے دائروں، شمالی ہوا کے ہاتھوں پھپھوندی کے بڑھتے ہوئے ٹکڑوں، اپنے گھونسلوں میں سوتے اور آہستگی سے ہلتے اور پھر اپنے پروں کے نیچے سب سے نرم حصے میں دوبارہ اپنے سر رکھتے پرندوں، اور لارووں کے جاگنے اور بیوپوں کے کھلنے کو سننے میں اپنی راتیں گزارتا تھا۔ وہ لمحہ بھی آتا ہے جب دیہاتی علاقے کی خاموشی کانوں میں اکٹھی ہوتی ہے اور اَن گنت آوازوں میں ٹوٹتی ہے، جیسے کوئی کائیں کائیں اور چیں چیں، گھاس میں کوئی تیز سرسراہٹ، پانی میں کوئی غڑاپا، زمین اور سنگریزوں پر کوئی ٹپ ٹپ، اور سب سے بڑھ کر جھینگر کی چلاہٹ۔ آوازیں ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہیں مگر کان، آخرکار، ان میں سے زیادہ تر کو شناخت کر لیتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے اون کے گولے کو کھولتی ہوئی انگلیاں ہر ریشے کو پتلے اور کم قابلِ حس دھاگوں سے بُنا ہوا محسوس کر لیتی ہیں۔ پس منظر میں، آوازوں کے بہاؤ کو تبدیل کیے بغیر، مینڈک ٹراتے رہتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے روشنی، ستاروں کی مسلسل ٹمٹماہٹ سے تبدیل نہیں ہوتی۔ لیکن ہوا کے ہر مد یا جزر کے ساتھ ہر آواز بدل جاتی ہے اور پھر سے نئی ہو جاتی ہے۔ اور کانوں کے اندرونی گوشوں

میں کچھ رہ جاتا ہے تو ایک مبہم سرسراہٹ — سمندر کی آواز۔

جاڑے آئے۔ کوسیمو نے خرگوشوں، لومڑیوں، سفید نیولوں اور مارٹنوں کی سمور سے، جو اس نے شکار کیے تھے، اپنے لیے ایک جیکٹ بنالی۔ اس کے سر پر ابھی تک وہی جنگلی بلی کے سمور والی ٹوپی تھی۔ اس نے بکری کی کھالوں سے اپنے لیے کچھ برجسیں بھی بنائیں جن کے گھٹنوں پر فاضل چمڑا تھا۔ جہاں تک جوتوں کا تعلق ہے، اس نے آخر کار محسوس کیا کہ درختوں پر پہننے کے لیے بہترین جوتے سلیپر ہیں، اور اپنے لیے کسی جانور، غالباً بجو، کی کھال سے ایک جوڑا بنالیا۔ اس طرح اس نے سردی سے اپنا بچاؤ کیا۔ یہ بتا دینا چاہیے کہ اُن دنوں ہمارے علاقے میں جاڑے معتدل ہوتے تھے، ان میں آج کل جیسی جمادینے والی ٹھنڈ نہیں ہوتی تھی جسے، کہا جاتا ہے، نپولین نے روس میں اس کی قید سے رہا کیا تھا اور جو اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک چلی آئی ہے؛ لیکن، پھر بھی، باہر کھلے میں جاڑوں کی راتیں گزارنا آسان نہیں رہا ہوگا۔

کوسیمو نے، انجام کار، رات کو سونے کے لیے سمور کے تھیلے کو بہترین پایا؛ خیمہ یا جھونپڑا نہیں بلکہ شاخ سے ٹنگا سونے کا تھیلا جس کے اندرونی حصے میں سمور کا استر لگا تھا۔ اس کے اندر جاتے ہی باہر کی دنیا غائب ہو جاتی اور وہ بچے کی طرح اس میں لپٹا ہوا سوتا۔ اگر رات میں کوئی غیر معمولی آواز آتی تو تھیلے کے منھ سے سمور کی ٹوپی برآمد ہوتی، بندوق کی نال باہر آتی اور پھر اس کی گول آنکھیں۔ (کہا جاتا ہے کہ اندھیرے میں اس کی آنکھیں بھی بلی یا اُلو کی آنکھوں کی طرح روشن ہو گئی تھیں مگر میں نے اس کا مشاہدہ کبھی خود نہیں کیا۔)

اس کے برعکس صبح کے وقت جب کوا کائیں کائیں کرتا تو تھیلے سے بھنچی ہوئی مٹھیوں کا ایک جوڑا باہر آتا؛ مٹھیاں ہوا میں بلند ہوتیں اور ان کے پیچھے آہستہ آہستہ جوڑے ہوتے اور پھیلتے ہوئے دو بازو، اور اس عمل کے دوران وہ اپنا جمائیاں لیتا ہوا منھ، اپنے شانے، جن میں سے ایک پر بندوق اور دوسرے پر بارود رکھنے کا برتن ہوتا، اور اپنی قدرے مڑی ہوئی ٹانگیں باہر نکالتا۔ (ہمیشہ ہاتھ پاؤں پر چلنے یا گھات میں بیٹھنے کی عادت کے باعث اس کی ٹانگیں اپنا سیدھا پن کھونے لگی تھیں۔) وہ ٹانگیں تھیلے سے باہر آتیں، وہ بھی پھیلتیں، اور اس طرح، کمر کے ایک جھٹکے اور جیکٹ کے نیچے کھجانے کے

ساتھ، گلاب کی طرح بیدار و تازہ، کوسیمو اپنے دن کا آغاز کرنے کے لیے تیار ہوتا۔

وہ فوارے پر جاتا، کہ اس کا ایک اپنا معلق فوارہ تھا جو اس نے خود ایجاد کیا تھا، یا یہ کہیے کہ فطرت کی مدد سے بنایا تھا۔ جنگل میں ایک چشمہ تھا جو ایک خاص مقام پر ایک جھرنے میں عموداً گرتا تھا۔ قریب ہی ایک بہت اونچی شاخوں والا بلوط تھا۔ کوسیمو نے ایک کھوکھلے کیے ہوئے درختِ حور کے دو گز لمبے ٹکڑے سے ایک طرح کا پائپ بنالیا تھا، جو جھرنے سے بلوط کی شاخوں تک پانی لاتا، جہاں وہ پی سکتا تھا یا نہا دھو سکتا تھا۔ یہ بات کہ وہ نہاتا دھوتا تھا یقینی ہے، کہ میں نے اسے کئی بار ایسا کرتے دیکھا ہے؛ زیادہ نہیں، ہر روز نہیں، لیکن نہاتا دھوتا وہ ضرور تھا؛ اس کے پاس صابن بھی تھا۔ صابن سے جب اس کا جی چاہتا وہ اپنے کپڑے بھی دھوتا۔ وہ اس مقصد کے لیے بلوط کے درخت پر ایک ٹب لے گیا تھا۔ پھر وہ شاخوں سے باندھی ہوئی رسیوں پر اپنے کپڑے سوکھنے کے لیے پھیلا دیتا۔

حقیقت میں وہ درختوں پر سب کچھ کرتا تھا۔ اس نے نیچے آئے بغیر اپنے شکار کیے ہوئے پرندے سیخ پر بھوننے کا ایک طریقہ بھی دریافت کرلیا تھا۔ اس کا طریق کار یہ تھا۔ وہ چقماق سے صنوبر کا ایک مخروط جلاتا اور زمین پر ایسی جگہ پھینک دیتا جو آگ کے لیے پہلے سے طے شدہ تھی (یہ میں نے چند ہموار پتھروں سے بنائی تھی)۔ پھر وہ اس پر ڈنٹھل اور خشک شاخیں گراتا اور ایک کریدنی سے، جو ایک لمبے ڈنڈے سے اس طرح باندھی گئی تھی کہ وہ شاخوں سے معلق سیخ تک پہنچ جاتی تھی، شعلے کو اونچا نیچا کرتا رہتا تھا۔ اس سارے عمل میں بہت احتیاط درکار تھی کیونکہ جنگل میں آگ لگنا بہت آسان ہے۔ آگ کی جگہ جان بوجھ کر بلوط کے نیچے، جھرنے کے قریب رکھی گئی تھی جہاں سے خطرے کی صورت میں جس قدر پانی درکار ہو وہ لے سکتا تھا۔

اس طرح، کچھ تو وہی کچھ کھا کے جو وہ شکار کرتا تھا، اور کچھ پھلوں اور سبزیوں کے لیے کسانوں سے مبادلہ کر کے، وہ بڑے مزے میں گزار رہا تھا، اور اب ہمیں اس کے لیے گھر سے کھانا بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ایک دن ہم نے سنا کہ وہ ہر صبح تازہ دودھ پی رہا ہے۔ اس نے ایک بکری سے دوستی کرلی تھی، جو زمین سے فٹ دو فٹ بلند ایک زیتون کے دوشاخے پر چڑھ جایا کرتی تھی؛ مگر حقیقت میں بکری چڑھتی نہیں تھی، محض اپنے پچھلے کھر اوپر رکھ دیتی تھی؛ کوسیمو مٹکا لے کر نیچے دوشاخے پر آتا اور اسے دوہ لیتا۔ اسی طرح کا بندوبست اس نے ایک سرخ پادووان مرغی سے کر رکھا تھا، جو زیادہ انڈے

Scanned with CamScanner

دینے والی نسل ہے۔ اس نے ایک تنے کے سوراخ میں مرغی کے لیے خفیہ جگہ بنا دی تھی اور ایک دن چھوڑ کر اسے ایک انڈا مل جاتا تھا، جسے وہ پن سے دو سوراخ کرنے کے بعد پی لیتا تھا۔

ایک مسئلہ اور تھا: روزانہ حوائج ضروریہ کا۔ شروع شروع میں وہ جہاں کہیں ہوتا وہیں فارغ ہو لیتا: یہاں یا وہاں، کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، دنیا بہت بڑی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ یہ بہت اچھی بات نہیں ہے۔ سو اس نے مردانزو نامی نالے کے کنارے، بید کی قسم کا ایک درخت ڈھونڈ نکالا جو ایک انتہائی موزوں اور الگ تھلگ مقام پر پانی کے اوپر جھکا ہوا تھا، اور اس کے ایک دوشاخے پر وہ آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ مردانزو نالا بانسوں کے درمیان پوشیدہ ایک تیز دھارا تھا اور اس کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ آس پاس کے دیہات اس میں اپنا گندا پانی ڈالتے تھے۔ اس طرح نوعمر پیوواسکو دی روندو، اپنے پڑوس کے اور خود اپنے آدابِ شائستگی کا احترام کرتے ہوئے، ایک مہذب زندگی گزار رہا تھا۔

لیکن شکاری کی زندگی کا ایک لازمی جزو اس کے پاس نہیں تھا، یعنی کتا۔ میں موجود تھا؛ فضا میں گولی کھا کر گرنے والے کسی ترغے، چہے یا بٹیر کی تلاش میں، یا ان لومڑیوں کی تلاش میں بھی، جب رات بھر شکار کی جستجو میں پھرنے کے بعد ان میں سے کوئی دم لینے کو رک جاتی اور اس کی لمبی دم جھاڑیوں سے باہر نکلی ہوتی، میں کانٹوں اور جھاڑیوں میں درّانہ گھس جاتا۔ لیکن جنگل میں اس کا ساتھ دینے کے لیے میں شاذ ہی گھر سے نکل پاتا۔ لیے کے ساتھ اسباق، پڑھائی، عشائے ربانی میں خدمت گزاری، والدین کے ساتھ کھانے کی پابندی مجھے روکے رہتی۔ اور پھر گھریلو زندگی کے سیکڑوں فرائض جن کا میں پابند تھا، کیونکہ بہرحال وہ فقرہ جو ہمیشہ میرے اردگرد دُہرایا جاتا تھا — ''خاندان میں ایک ہی باغی کافی ہے''— کچھ نہ کچھ وزن رکھتا تھا اور مجھ پر ساری زندگی کے لیے اثر ڈال گیا۔

چنانچہ کوسیمو تقریباً ہمیشہ تنہا شکار کرتا اور شکار کی بازیابی کے لیے (ماسوائے اس طرح کی شاذ صورتوں کے جب ایک گرتے ہوئے زریں زاغ کے بازو ایک شاخ میں پھنس گئے تھے) وہ مچھلی پکڑنے کا سامان، ڈوروالی بنسیاں اور کانٹے استعمال کرتا۔ لیکن وہ ہمیشہ اس میں کامیاب نہیں رہتا تھا، اور بعض اوقات کوئی چہا گھاٹی کی تہہ میں چیونٹیوں سے سیاہ پڑا ملتا۔

اس وقت تک میں نے صرف شکار اٹھا کر لانے والے کتوں کی بات کی ہے۔ کیونکہ ان دنوں

Scanned with CamScanner

کو یسمو صرف اس طرح کا شکار کرتا تھا جس کا تقاضا شاخ پر گھات میں بیٹھے ہوئے، صبحیں اور راتیں اس انتظار میں گزارنا ہے کہ کوئی ترغا کسی عیاں کونپل پر دم لے، یا کوئی خرگوش کسی میدان کے کھلے حصے میں ظاہر ہو۔ ورنہ وہ پرندوں کے گیت کے ساتھ ساتھ، یا جانوروں کے انتہائی ممکنہ نشانات کا اندازہ کرتے ہوئے انکل پچو گھومتا تھا۔ اور جب کبھی وہ کسی خرگوش یا لومڑی کے عقب میں شکاری کتوں کی آواز سنتا تو اسے پتا ہوتا کہ اس شکار سے گریز کرنا ہے، کہ ایک تنہا اور وقتی شکاری ہونے کے ناتے یہ جانور اس کے لیے نہیں ہیں۔ چونکہ وہ اصولوں کا پابند تھا لہٰذا جب کسی ایسے جانور کو جس کے پیچھے اوروں کے شکاری کتے ہوں، یا جو اس کے نشانے کی زد میں ہو، اپنے مچان سے دیکھتا تو اس پر بندوق نہیں اٹھاتا تھا۔ وہ شکاری کا انتظار کرتا، جو راستے بھر ہانپتا ہوا کھڑے کانوں اور چندھیائی آنکھوں کے ساتھ پہنچتا، اور اسے بتاتا کہ جانور کس سمت میں گیا ہے۔

ایک دن اس نے ایک بھاگتی ہوئی لومڑی کو دیکھا۔ اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ سبز گھاس کے وسط میں محض ایک گزرتا ہوا سرخ نشان نظر آ رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کھڑی تھیں اور وہ خوف سے ہونک رہی تھی۔ اس نے میدان عبور کیا اور زیر درختی میں غائب ہو گئی۔ اس کے پیچھے شکاری کتے تھے۔

نتھنے زمین سے لگائے وہ پوری رفتار سے دوڑتے ہوئے آئے۔ انھوں نے دو بار اپنے آپ کو نتھنوں میں لومڑی کی بو سے تہی پایا اور پھر نوے درجے کے زاویے پر مڑ گئے۔

وہ کچھ دور جا چکے تھے، جب ''اوہی، اوہی!'' کی ایک چیخ کے ساتھ کتے سے زیادہ مچھلی جیسی چھلانگوں سے گھاس کو قطع کرتا ہوا ایک طرح کا ڈولفن نما حیوان نمودار ہوا۔ اس کی ناک سراغ رساں کتے سے زیادہ تیز اور کان اس سے زیادہ گرے ہوئے تھے اور وہ فضا کو سونگھتے ہوئے جیسے تیر رہا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ جسے پنکھ یا جھلی دار پنجے آگے کو دھکیل رہے تھے، بے پا اور بہت لمبا تھا، اور بالکل مچھلی جیسا تھا۔ وہ باہر کھلے میں آیا تو کو یسمو نے دیکھا کہ وہ بجو کتا ہے۔

وہ یقیناً شکاری کتوں کے پیچھے پیچھے چلا آیا ہوگا اور چونکہ وہ چھوٹا تھا، تقریباً پلا، لہٰذا پیچھے رہ گیا ہوگا۔ کتے اب ''ہو ہاہف'' کی غصیلی آواز نکال رہے تھے کیونکہ انھوں نے شکار کی بو گنوا دی تھی۔ ان کا دوڑتا غول اب ایک کھلے میدان میں چاروں طرف بکھر گیا تھا۔ وہ دوبارہ بو پانے اور شکار کی حقیقی تلاش شروع کرنے کے لیے انتہائی بے چین تھے مگر انھوں نے اپنی انگیخت گنوا دی تھی، اور ان میں سے ایک دو

پہلے ہی کسی چٹان کے ساتھ اپنی ٹانگیں اٹھانے کا موقع نکال رہے تھے۔

زور زور سے ہانپتا ہوا بجو کتا بے جواز فتح پر اکڑتا، آخر کار آہستہ آہستہ دوڑتا ہوا شکاری کتوں تک پہنچ گیا۔ وہ ابھی تک فتح مند تھا۔ اس نے ایک عیارانہ صدا بلند کی، ''او ہی یاہ! او ہی یاہ!''

کتے فوراً غرّ ائے، اور انھوں نے ایک دفعہ تو لومڑی کی بو ڈھونڈنا ترک کر دی۔ وہ منھ کھولے، کاٹنے کو تیار، بجو کتے کی طرف بڑھے۔ پھر اچانک ان کی دلچسپی ختم ہو گئی اور وہ پرے چلے گئے۔

کوسیمو بجو کتے کا تعاقب کرنے لگا جو اب اٹکل پچو چل رہا تھا۔ کتے نے، جو اپنی غیر مرکوز ناک کی وجہ سے شش و پنج میں تھا، درخت پر کوسیمو کو دیکھا اور اپنی دم ہلانے لگا۔ کوسیمو کو یقین ہو گیا کہ لومڑی کہیں قریب ہی چھپی ہوئی ہے۔ شکاری کتے دور فاصلے پر پھیلے ہوئے تھے۔ مقابل کی ڈھلان سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، شکاری گھٹی ہوئی آوازوں سے انھیں اکسا رہے تھے اور وہ بے مقصد انداز میں رک رک کر بھونک رہے تھے۔ کوسیمو نے بجو کتے سے کہا: ''جاؤ! جاؤ! اسے ڈھونڈو!''

پلا بو سونگھنے میں جٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ منھ اٹھا کر لڑکے کو دیکھ لیتا۔

''جاؤ! جاؤ!'' کوسیمو نے اسے اکسایا۔

کوسیمو کو اب کتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جھاڑیوں کے درمیان زور سے ٹکرانے کی آواز سنی اور پھر اچانک کتے کی آواز۔ بجو کتا لومڑی کو باہر نکال لایا تھا!

کوسیمو نے لومڑی کو میدان میں دوڑتے دیکھا۔ مگر کیا وہ کسی اور کے کتے کے کھدیڑے ہوئے جانور پر گولی چلا سکتا تھا؟ کوسیمو نے اسے گزر جانے دیا اور گولی نہیں چلائی۔ بجو کتے نے اپنی تھوتھنی لڑکے کی طرف کتوں کے اس انداز میں اٹھائی جب وہ سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں اور متذبذب ہوتے ہیں کہ انھیں سمجھنا چاہیے یا نہیں۔ اس نے اپنی ناک پھر سے نیچے کر لی اور لومڑی کے پیچھے دوڑ پڑا۔

لومڑی نے ایک چکر مکمل کیا۔ وہ واپس آ رہی تھی۔ وہ گولی چلا سکتا تھا یا نہیں؟ اس نے گولی نہیں چلائی۔ کتے نے اسے افسوس سے دیکھا۔ اب وہ بھونک نہیں رہا تھا اور اس کی زبان اس کے کانوں سے زیادہ لٹک رہی تھی۔ وہ تھک چکا تھا مگر اب تک دوڑ رہا تھا۔ بجو کتے نے لومڑی کو باہر نکال کر شکاری کتوں اور شکاریوں دونوں کو حیران کر دیا تھا۔ راستے کے ساتھ ساتھ ایک بوڑھا آدمی بھاری توڑے دار بندوق

Scanned with CamScanner

لیے دوڑ رہا تھا۔ ''اے!'' کوسیمو نے اسے آواز دی۔ ''کیا وہ بجو کتا تمھارا ہے؟''

''تم پر اور تمھارے سارے خاندان پر لعنت ہو!'' بوڑھا آدمی جو یقیناً قدرے سنکی رہا ہوگا، چلایا۔ ''کیا ہم لوگ بجو کتے سے شکار کرنے والے نظر آتے ہیں؟''

''پھر تو یہ جو کچھ نکال کر لائے، میں اس پر گولی چلا سکتا ہوں،'' کوسیمو نے، جو واقعی صحیح کام کرنا چاہتا تھا، اصرار کیا۔

''میری بلا سے تم اپنے محافظ فرشتے پر گولی چلاؤ!'' آدمی نے تیزی سے جاتے ہوئے جواب دیا۔

بجو کتا لومڑی کو ہانک کر پھر کوسیمو کے درخت تک لے آیا تھا۔ کوسیمو نے اس پر گولی چلائی اور اسے گرا لیا۔ بجو کتا اس کا کتا تھا؛ اس نے اس کا نام اوتیمو ماسیمو رکھا۔

اوتیمو ماسیمو کسی کا کتا نہیں تھا۔ وہ نوعمری کے جوش میں شکاری کتوں کے غول میں شامل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ آیا کہاں سے تھا؟ یہ بات معلوم کرنے کے لیے کوسیمو اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

بجو کتے نے، جس کا پیٹ زمین کو چھو رہا تھا، باڑیں اور خندقیں عبور کیں، پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ اوپر درختوں پر لڑکا اس کے نشانات پر ساتھ ساتھ آرہا ہے، وہ مڑا۔ اس کا اختیار کردہ راستہ اتنا غیر معمولی تھا کہ کوسیمو فوراً سمجھ ہی نہیں پایا کہ وہ کہاں پہنچ گئے ہیں۔ اور جب وہ سمجھا تو اس کا دل دھڑک اٹھا۔ یہ اونداریوا خاندان کا باغ تھا۔

حویلی بند تھی۔ جھلملیاں گری ہوئی تھیں۔ صرف دوچھتی کی کھڑکی پر ایک جھلملی ہوا سے شور پیدا کر رہی تھی۔ باغ، ہمیشہ سے زیادہ، کسی دوسری دنیا کا جنگل لگ رہا تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بھری روشوں اور جھاڑیوں بھرے پھولوں کے تختوں کے ساتھ ساتھ اوتیمو ماسیمو تتلیوں کے پیچھے یوں خوش خوش گھوم رہا تھا جیسے گھر پہنچ گیا ہو۔

وہ ایک جھاڑی میں غائب ہو گیا اور ایک ربن لیے واپس آیا۔ کوسیمو کا دل ایک بار اور دھڑکا۔

''یہ کیا ہے، اوتیمو ماسیمو؟ کس کا ہے؟ مجھے بتاؤ۔''

اوتیمو ماسیمو اپنی دم ہلانے لگا۔

''اسے یہاں لاؤ، اوتیمو ماسیمو!''

کوسیمو ایک زیریں شاخ پر اترا اور کتے کے منھ سے اڑی ہوئی رنگت کا ربن کا ٹکڑا لے لیا جو یقیناً

Scanned with CamScanner

ویولا کے بالوں کا ربن رہا ہوگا، بالکل اسی طرح جیسے وہ کتا یقیناً ویولا کا کتا تھا، جسے اپنی آخری روانگی میں خاندان والے بھول گئے تھے۔ درحقیقت، اب وہ کوسیمو کو پچھلی گرمیوں سے یاد لگ رہا تھا۔ اُس وقت وہ چھوٹا سا پلاّ ہی تھا اور سنہرے بالوں والی لڑکی کے بازوؤں میں ایک ٹوکری سے جھانک رہا تھا۔ غالباً وہ اسی لمحے لڑکی کے لیے تحفے کے طور پر لایا گیا تھا۔

''ڈھونڈو، اوتیمو ماسیمو!'' بجو کتا بانسوں کے درمیان گھس گیا اور اس کی کئی نشانیاں — کودنے والی رسّی، پرانی پتنگ کا ایک ٹکڑا، ایک پنکھا — نکال لایا۔

باغ میں سب سے اونچے درخت کے تنے کے آخری حصے پر میرے بھائی نے اپنے نیچے کی نوک سے ''ویولا اور کوسیمو'' کے نام کھودے، اور پھر ذرا نیچے، اس یقین کے ساتھ کہ اگر اس نے کتے کا کوئی اور نام بھی رکھا تب بھی وہ اس سے خوش ہوگی، اس نے ''اوتیمو ماسیمو، بجو کتا'' کے الفاظ کندہ کیے۔

اس وقت کے بعد سے، ہم جب کبھی لڑکے کو درختوں پر دیکھتے تو ہمیں یقین ہوتا کہ وہ بجو کتے کو ڈھونڈ رہا ہے۔ اوتیمو ماسیمو پیٹ زمین سے لگائے آہستہ آہستہ دوڑتا آتا۔ کوسیمو نے اسے شکار کی تلاش، اسے روکنا اور واپس لانا، وہ سارے کام جو شکاری کتا کرتا ہے، سکھا دیے تھے، اور جنگل کی کوئی ایسی مخلوق نہ تھی جسے وہ اکٹھے شکار نہ کرتے ہوں۔ شکار اس تک لانے کے لیے، اوتیمو ماسیمو جہاں تک بھی دو پنجے اسے اجازت دیتے، تنے پر چڑھتا۔ کوسیمو نیچے جھکتا اور اس کے منھ سے خرگوش یا تیتر لے لیتا اور اس کا سر تھپتھپاتا۔ یہی ان کی ساری قربتیں تھیں، یہی ان کی خوشیاں تھیں۔ لیکن زمین اور شاخوں پر موجود ان دونوں کے درمیان مختصر غراہٹ اور زبان چٹخارنے اور انگلیاں چٹخانے کی صورت میں ایک متواتر مکالمہ، ایک مفاہمت جاری رہتی۔ اس ضروری دُسراہت نے، جو آدمی کی شکل میں کتے کے لیے ہوتی ہے اور کتے کی شکل میں آدمی کے لیے، دونوں میں سے کسی کو مایوس نہیں کیا اور اس کے باوجود کہ وہ دنیا میں سارے آدمیوں اور سارے کتوں سے مختلف تھے، وہ آدمی اور کتے کی حیثیت سے اپنے آپ کو خوش کہہ سکتے تھے۔

۱۱

ایک طویل مدت تک، جو اس کی نوبلوغیت کے سارے عرصے پر محیط تھی، شکار کرنا ہی کوسیمو کی

دنیا تھی۔ اور مچھلیاں پکڑنا، کیونکہ وہ تالابوں اور نالوں میں ڈور ڈالے بام اور گھسیٹتی مچھلیوں کا انتظار کیا کرتا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا تھا کہ اس میں ہم سے مختلف جبلتیں اور حواس پیدا ہو گئے ہیں، گویا وہ کھالیں جنھیں اس نے لباس بنا لیا تھا، اس کی فطرت میں ایک مکمل تبدیلی سے مطابقت رکھتی ہوں۔ درختوں کی چھالوں سے لگاتار مس، کسی پَر، بال یا چھلکے کی جنبش کو بھانپنے اور اُس کی دنیا کے رنگوں کے خفیف سے فرق کو دیکھنے پر سدھی ہوئی آنکھیں، اور پھر کسی دوسری دنیا کے خون کی طرح پتوں کی رگوں میں گردش کرتے متعدد سبز رنگ، زندگی کی وہ تمام شکلیں جو انسان سے اتنی ہی دور ہیں جیسے کسی پودے کا تنا، کسی ترغے کی چونچ یا کسی مچھلی کا گلپھڑا، غیر آبادی کی وہ سرحدیں جس میں وہ اتنی شدت سے کھنچا چلا جا رہا تھا، یقیناً ان ساری باتوں نے اس کے ذہن کو متشکل کیا ہوگا، ہر انسانی مشابہت گنوانے پر مجبور کیا ہوگا۔ لیکن پودوں سے قربت اور جانوروں سے جدوجہد کے باعث خواہ اس نے کتنی بھی نئی خصوصیات حاصل کی ہوں، میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ اس کا مقام واضح طور پر ہمارے ساتھ تھا۔

لیکن اس نے بعض عادتوں کو، چاہے بغیر بھی، شاذ ہوتے پایا اور آخر کار انھیں بالکل تج دیا۔ مثلاً اومبروسا کے عشائے ربانی کی پر تکلف رسم میں شرکت۔ ابتدائی مہینوں میں اس نے ایسا کرنے کی کوشش کی۔ ہر اتوار، جب ہم اہل خانہ تقریباتی لباس میں گھر سے باہر آتے تو اسے شاخوں پر موجود پاتے۔ وہ بھی اپنے لباس کو تقریب کے شایاں بنانے کی کوشش کرتا، مثلاً سمور کی ٹوپی کے بجائے تکونا ہیٹ اور اپنا پرانا چوغہ پہنتا۔ ہم روانہ ہوتے اور وہ شاخوں پر ہمارے ساتھ ساتھ آتا۔ ہم گرجا کے دروازے پر اس طرح پہنچتے کہ اومبروسا کے سارے کے سارے لوگ ہمیں دیکھ رہے ہوتے (جلد ہی میرے والد بھی اس کے عادی ہو گئے اور ان کی خفت کم ہو گئی)۔ ہم سب بڑے وقار سے چل رہے ہوتے اور وہ ہوا میں چھلانگیں لگاتا ہوتا — یہ نظارہ، خاص کر سردیوں میں جب درخت پتوں سے تہی ہوتے، بڑا عجیب ہوتا۔

ہم کلیسا میں داخل ہوتے اور اپنی خاندانی نشستوں پر بیٹھ جاتے، جبکہ وہ کلیسا کی بغلی راہداری کے پاس، ایک بڑی کھڑکی کے بالکل برابر، ایک گل خطمی کے درخت پر گھٹنوں کے بل جھکا رہتا۔ اپنی نشستوں سے ہم کھڑکیوں کے پار شاخوں کے سائے اور ان کے درمیان، سر جھکائے، سینے پر ہیٹ سنبھالے، کوسیمو کی پرچھائیں دیکھتے۔ میرے والد اور کلیسا کے ایک داروغہ کے مابین رضامندی سے،

Scanned with CamScanner

ہر اتوار کو وہ کھڑکی نیم وا رکھی جاتی تھی تاکہ میرا بھائی درخت پر سے عشائے ربانی میں شریک ہو سکے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اس کا وہاں آنا مفقود ہوتا گیا، اور جھونکے اندر آنے کی وجہ سے کھڑکی بند کر دی گئی۔

بہت سی باتیں جو پہلے اس کے لیے اہم ہوتیں، اب نہیں تھیں۔ بہار میں ہماری بہن کی منگنی ہو گئی۔ ایک سال پہلے تک کوئی یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کاؤنٹ اور کاؤنٹس ڈیسٹومیک، نوعمر کاؤنٹ کے ہمراہ آئے۔ خوب دھوم دھڑکا ہوا۔ ہمارے گھر کا ہر کمرہ روشن تھا۔ تمام مقامی اشرافیہ مدعو تھی اور رقص کا بھی اہتمام تھا۔ تو کیا ہمیں کوسیمو کا خیال آیا؟ ہم نے، ہم میں سے ہر ایک نے، یقیناً اسے یاد کیا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ شاید وہ آ رہا ہو، میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے باہر جھانکتا۔ ہمارے والد اداس تھے۔ اس خاندانی تقریب میں وہ یقیناً اسی کے بارے میں سوچ رہے ہوں گے جس نے اپنے آپ کو اس سے الگ رکھا تھا۔ جنرلیسا، جو اس تقریب پر اس طرح نظر رکھے ہوئے تھیں جیسے وہ کسی پریڈ گراؤنڈ میں ہو، دراصل اپنے ناموجود بیٹے کے بارے میں اپنے جذبات کو محو کرنے کی کوشش میں تھیں۔ غالباً باتیستا بھی، جو اپنے پنجوں پر ناچتی پھر رہی تھی اور راہبانہ لباس ترک کرنے کے بعد پہچانی نہیں جا رہی تھی؛ جس نے ایسی وِگ پہن رکھی تھی جو بادام اور انڈوں کی مٹھائی مارزیپان کی طرح لگتی تھی، اور مونگوں سے سجے ایسے لباس میں تھی جو اس کے لیے کسی مقامی درزی نے تیار کیا تھا، وہ بھی، میں قسم کھا سکتا ہوں، اُس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

لیکن وہ وہاں موجود تھا — مجھے یہ بات بعد میں معلوم ہوئی — سایوں کے درمیان نادیدہ، ٹھنڈ میں، گل خطمی کے ایک درخت کی چوٹی سے، روشنی سے دمکتی کھڑکیوں، تقریب کے لیے گجروں سے آراستہ جانے پہچانے کمروں، وِگیں لگائے ہوئے رقاصوں کو دیکھتا ہوا۔ اس کے ذہن میں کیا خیالات آئے ہوں گے؟ کیا وہ ہماری زندگی پر تھوڑا سا متاسف تھا؟ کیا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کو اور ہماری دنیا میں واپسی کو الگ کرنے والا قدم کتنا مختصر اور کتنا آسان تھا؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا، اور وہاں اوپر بیٹھا کیا چاہ رہا تھا۔ مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ وہ تقریب ختم ہونے تک، بلکہ اس کے بعد تک، رکا رہا، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے سارے فانوس بجھا دیے گئے اور ایک بھی روشن کھڑکی باقی نہ رہی۔

Scanned with CamScanner

اس طرح خاندان سے کوسیمو کے تعلقات، اب وہ بھلے ہوں یا برے، جاری رہے۔ درحقیقت یہ تعلقات خاندان کے ایک رکن — جسے وہ واقعی اب پہچانتا تھا — یعنی کوالیئے اینیا سلویو کاریگا سے، اور زیادہ گہرے ہو گئے۔ کوسیمو نے اس کھوئے ہوئے اور گریزپا آدمی کو (کسی کو پتا ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے)، خاندان بھر میں وہ واحد فرد پایا جس کے بے شمار مشاغل تھے، اور کوئی بھی بے سود نہ تھا۔

بعض اوقات وہ سہ پہر کے گرم ترین حصے میں باہر جاتا۔ سر پہ ترکی ٹوپی دھرے، زمین پر گھسٹتی ہوئی لمبی عبا میں لڑکھڑاتا ہوا، وہ اس طرح غائب ہو جاتا جیسے زمین یا باڑی کی کسی دراڑ نے یا دیواروں میں لگے پتھروں نے اسے نگل لیا ہو۔ کوسیمو بھی، جو اپنا وقت ہمیشہ چوکسی کی حالت میں گزارتا تھا (شاید اب یہ وقت گزاری نہیں بلکہ اس کی فطری حالت تھی، گویا کہ اس کی نظروں کو، سب کچھ سمجھنے کے لیے، ایک وسیع تر افق کو اپنے دائرے میں سمیٹنا ہو)، اسے اچانک اوجھل پاتا۔ بعض اوقات وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر ہوتا ہوا اس مقام کی طرف دوڑنا شروع کر دیتا جہاں بوڑھا آدمی غائب ہوا تھا، مگر یہ جاننے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا کہ وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔ لیکن اس علاقے میں جہاں وہ آخری بار دیکھا گیا ہو، ایک علامت ہمیشہ نظر آتی، اور وہ تھی اڑتی ہوئی شہد کی مکھیاں۔ انجام کار، کوسیمو کو یقین ہو گیا کہ کوالیئے کی موجودگی شہد کی مکھیوں سے مربوط ہے، اور یہ کہ اسے ڈھونڈنے کے لیے مکھیوں کا رخ اختیار کرنا ہوگا۔ لیکن کیسے؟ مکھیوں کی ایک منتشر بھنبھناہٹ ہر اس پودے کے گرد تھی جس میں پھول لگے تھے۔ لیکن اسے الگ تھلگ اور ضمنی راستوں میں توجہ نہیں بانٹنی چاہیے بلکہ وہ غیرمرئی ہوائی راستہ اختیار کرنا چاہیے جس پر مکھیوں کی آمد ورفت ہر لحظہ گھنی ہو رہی ہے۔ آخرکار وہ ایک گھنے بادل تک پہنچ گیا جو ایک جھاڑی کے عقب سے دھوئیں کی طرح اُٹھ رہا تھا۔ جھاڑی کے عقب میں ایک میز پر الگ الگ یا قطاروں میں شہد کے چھتے دھرے تھے اور کوالیئے، جس کے چاروں طرف مکھیاں ہی مکھیاں تھیں، ان کے ساتھ مصروف تھا۔

شہد کی مکھیاں پالنا اصل میں ہمارے چچا کی ایک خفیہ سرگرمی تھی، مگر ایک حد تک ہی خفیہ، کہ وہ اکثر و بیشتر خود چھتے سے تازہ تازہ چمکتا شہد نکال کر کھانے کی میز پر لاتا تھا۔ لیکن اس کی یہ سرگرمی ہماری ملکیت کی حدود سے باہر ایسی جگہوں پر عمل پذیر ہوتی جنھیں وہ واضح طور پر ہم سے مخفی رکھنا چاہتا تھا۔ اپنی

اس محنتِ شاقہ کی منفعت کو خاندانی کھاتوں میں منتقل ہونے سے روکنے کے لیے، اس کی طرف سے یقیناً یہ ایک احتیاط رہی ہوگی۔ یا پھر — کیونکہ یہ آدمی کنجوس یقیناً نہیں تھا، اور شہد اور موم کی ایسی حقیر مقداروں سے زیادہ منافعے کی توقع بہر حال نہیں کر سکتا تھا — وہ کوئی ایسا کام کرنا چاہتا ہوگا جس میں اس کا بھائی بیرن اپنی ٹانگ نہ اڑائے، یا اس کا رہنما نہ بن بیٹھے۔ یا پھر یہ ہے کہ ان چند کاموں کو جنھیں وہ پسند کرتا تھا جیسے مکھیاں پالنا، ان بہت سے کاموں میں جنھیں وہ ناپسند کرتا تھا، جیسے انتظام سنبھالنا، گڈمڈ کرنا نہیں چاہتا ہوگا۔

بہر حال، حقیقت یہ تھی کہ ہمارے والد نے اسے گھر کے قریب مکھیاں پالنے کی اجازت کبھی نہیں دی، کہ وہ ڈنک مارے جانے کے ایک بعید از عقل خوف میں مبتلا تھے۔ باغ میں جب کبھی اتفاق سے ان کا سامنا کسی شہد کی مکھی یا بھڑ سے ہوتا تو وہ مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ اپنی وِگ میں چھپائے روشوں پر بھاگنے لگتے جیسے اپنے کو کسی عقاب کے ٹھونگوں سے بچا رہے ہوں۔ ایک بار ایسا کرتے ہوئے ان کی وِگ سرک گئی۔ مکھی، جو ان کی اچانک بل جل سے بوکھلا گئی تھی، ان کے مقابل آئی اور ان کی گنجی چاند میں اپنا ڈنک اتار دیا۔ تین دن تک وہ اپنے سر پر سرکے میں بھیگی ہوئی گریاں رکھتے رہے، کہ وہ تھے ہی ایسے، سنجیدہ معاملات میں انتہائی خوددار و مضبوط، لیکن ذرا سی خراش یا پھنسی سے بوکھلا جانے والے۔

اور یوں اینیا سلویو کاریگا نے اپنی شہد کی مکھیوں کے چھتے اومبروسا کی ساری وادی میں پھیلا دیے تھے۔ بہت سے زمینداروں نے اسے تھوڑے، بہت شہد کی عوض اپنی زمین کے ایک ٹکڑے پر ایک آدھ چھتا رکھنے کی اجازت دے رکھی تھی اور وہ ہمیشہ ان کی دیکھ بھال میں مصروفیت سے ہلتے ہاتھوں کے ساتھ، جو نیش زنی سے بچنے کے لیے لمبے سیاہ انگشت دستانوں میں ملفوف ہوتے، ایک سے دوسرے چھتے تک چکر لگاتا رہتا۔ چہرے پر، اپنی ترکی ٹوپی کے نیچے، وہ ایک سیاہ نقاب ڈالے رہتا جو ہر سانس کے ساتھ اس سے چمٹتی یا پھولتی رہتی۔ چھتوں میں شہد کی تلاش کے دوران مکھیوں کو بھگانے کے لیے وہ دھواں چھوڑنے والا ایک آلہ ہلایا کرتا تھا۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ، نقابوں اور دھویں کے بادلوں کا یہ سارا منظر، کوسیمو کو بوڑھے آدمی کا ایسا جادو ٹونا لگتا جو وہ غائب ہونے، مٹ جانے، اڑ جانے اور پھر کہیں اور، کسی اور عہد یا کسی اور جگہ پھر سے وجود میں آنے کی کوشش میں کر رہا ہو۔ لیکن وہ کوئی خاص جادوگر نہ تھا، کہ وہ ہمیشہ بالکل ویسا کا ویسا نمودار ہوتا، بس کبھی کبھی اپنا نیش زدہ انگوٹھا چوستا ہوتا۔

Scanned with CamScanner

بہار کے دن تھے۔ ایک صبح کوسیمو نے ہوا کو ایسی آواز سے مرتعش دیکھا جو اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ ایک بھنبھناہٹ تھی جو بعض دفعہ بڑھ کر تقریباً گرج میں ڈھل جاتی اور اولوں کی طرح نظر آنے والی ایک چادر، جو گرنے کے بجائے آہستگی سے گھومتی، بل کھاتی ایک افقی سمت میں متحرک تھی، لیکن ایک طرح کے ٹھوس ستون کے تعاقب میں۔ یہ شہد کی مکھیوں کا بہت بڑا دل تھا۔ چاروں طرف ہریالی اور پھول اور دھوپ تھی۔ کوسیمو نے، وہ نہیں کہہ سکتا تھا ایسا کیوں ہے، اپنے کو ایک شوریدہ سر و متشدد ولولے کی گرفت میں محسوس کیا۔ ''مکھیاں بھاگ رہی ہیں! کوالیئے! مکھیاں بھاگ رہی ہیں!'' وہ کاریگا کی تلاش میں درختوں پر دوڑتا ہوا، چلّانے لگا۔

''بھاگ نہیں رہی ہیں، جمع ہو رہی ہیں،'' کوالیئے کی آواز نے کہا اور کوسیمو نے دیکھا کہ وہ اس کے نیچے سانپ چھتری کی طرح اُگ پڑا ہے اور اسے چپ رہنے کے اشارے کر رہا ہے۔ پھر بوڑھا آدمی اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور غائب ہو گیا۔ وہ کہاں گیا تھا؟

یہ نئے چھتے بنانے کا موسم تھا۔ مکھیوں کی ایک ٹکڑی ملکہ مکھی کے پیچھے پیچھے پرانے چھتوں سے باہر آرہی تھی۔ کوسیمو نے چاروں طرف دیکھا۔ اب کوالیئے، ہاتھ میں دیگچی اور ڈوئی لیے، باورچی خانے کے دروازے سے دوبارہ ظاہر ہوا۔ اس نے ڈوئی کو دیگچی پر زور سے مار کر ایسی اونچی آواز پیدا کی جو کان کے پردوں میں گونج کر ایک طویل ارتعاش میں ختم ہوئی۔ یہ ارتعاش اتنا پریشان کن تھا کہ کوسیمو نے چاہا اپنے کان بند کر لے۔ کوالیئے ہر تیسرے قدم پر ان تانبے کی چیزوں کو بجاتا ہوا مکھیوں کے جھنڈ کا تعاقب کر رہا تھا۔ ہر آواز پر جھنڈ ایک دھچکے کی گرفت میں آتا ہوا لگتا، تیزی سے غوطہ لگاتا اور گھوم جاتا۔ اس کی بھنبھناہٹ مدھم ہو جاتی اور اس کی راہِ پرواز مزید یقینی۔ کوسیمو کو ٹھیک سے نظر نہیں آرہا تھا لیکن اسے یوں لگا کہ سارا جھنڈ جنگل میں ایک مقام پر مرتکز ہو رہا ہے اور اس سے پرے نہیں جا رہا۔ کاریگا اپنے برتن بجائے جا رہا تھا۔

''کیا ہو رہا ہے، کوالیئے؟ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' میرے بھائی نے قریب آتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''جلدی!'' وہ سسکارا۔ ''اس درخت پر جاؤ جہاں جھنڈ رُکا ہے، لیکن خبردار، اس وقت تک اسے

نہ چھیڑنا جب تک میں نہ پہنچ جاؤں!''

شہد کی مکھیاں ایک انار کے درخت کی طرف جا رہی تھیں۔ کوسیمو درخت تک پہنچا تو پہلے پہل اسے کچھ نظر نہ آیا۔ پھر اسے اچانک احساس ہوا کہ ایک شاخ سے لٹکا ہوا جو بڑا سا مخروط نظر آ رہا ہے، در حقیقت ایک دوسرے سے چمٹی ہوئی مکھیاں ہیں، جن کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اور مخروط بڑا ہوتا جا رہا ہے۔

انار کے درخت کی چوٹی پر کوسیمو اپنا سانس روکے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے مکھیوں کا دل تھا اور جوں جوں وہ بڑھ رہا تھا توں توں ہلکا ہوتا لگ رہا تھا، جیسے کسی دھاگے سے معلق ہو، یا اس سے بھی کم، کسی بوڑھی ملکہ مکھی کے پنجوں سے آویزاں ہو۔ یہ تمام تر باریک ریشہ تھا جہاں سرسراتے ہوئے پرَ شکموں کی زرد اور سیاہ پٹیوں پر نیم شفاف خاکستری رنگ پھیلا رہے تھے۔

اپنے ایک ہاتھ میں چھتا لیے کوالیئے کودتا پھاندتا پہنچا۔ اس نے چھتا مکھیوں کے ہجوم کے نیچے الٹا کر کے پکڑا۔ ''دیکھو،'' اس نے کوسیمو سے سرگوشی کی، ''شاخ کو ذرا سا ہلاؤ۔''

کوسیمو نے انار کے درخت کو محض جنبش دی۔ ہزاروں شہد کی مکھیوں کا دل پتے کی طرح ٹوٹ کر چھتے میں جا گرا، جس پر کوالیئے نے ایک تختہ ڈھانپ دیا۔ ''یہ ہوئی بات!''

اس طرح کوسیمو اور کوالیئے کے درمیان ایک مفاہمت، ایک اشتراک پیدا ہو گیا جسے تقریباً دوستی کا نام دیا جا سکتا تھا، بشرطیکہ دوستی کی اصطلاح ایسے دو افراد کے لیے جو خاصے کم آمیز تھے، بہت زیادہ متجاوز نہ لگتی ہو۔

میرا بھائی اور اینیا سلویو، آخرکار آبیات کے موضوع پر بھی اکٹھے ہو گئے۔ یہ بات غالباً عجیب معلوم ہو سکتی ہے، کہ درختوں پر رہنے والا کنوؤں اور نہروں سے کوئی واسطہ رکھنے کو یقیناً مشکل پائے گا، لیکن میں نے ایک طرح کے معلق فوارے کا ذکر کیا ہے جو کوسیمو نے سفیدے کے تنے کے ایک لمبے کھوکھلے ٹکڑے کے ذریعے آبشار سے بلوط تک پانی لانے کے لیے بنایا تھا۔ اب بات یہ ہے کہ کوالیئے، گو بظاہر وہ خاصی حد تک کھویا رہتا تھا، ساری وادی میں ہر اس چیز پر توجہ دیتا تھا جس کا تعلق چلتے پانی سے ہو۔ اس نے آبشار کے اوپر سے، ایک جنگلی زیتون کی باڑ کے پیچھے چھپ کر، کوسیمو کو بلوط کی شاخوں کے درمیان سے یہ لکڑی کا پائپ نکالتے دیکھا تھا (جہاں وہ اسے، ہر چیز چھپانے کی جنگلی جانوروں کی عادت پر چلتے ہوئے، جو اس نے فوراً اپنالی تھی، عدم استعمال کی صورت میں رکھتا تھا)، خاص طور پر یہ کہ

Scanned with CamScanner

اس نے کس طرح اسے ایک طرف سے درخت کے ایک دوشاخے پر، اور دوسری طرف سے کچھ پتھروں پر ٹکا کر پانی پیا تھا۔

اس منظر سے کوالیئے کے ذہن میں جیسے کسی شے کو پر لگ گئے۔ احساسِ مسرت کا ایک شاذ لمحہ اسے بہالے گیا۔ وہ چھلانگ لگا کر جھاڑی سے باہر آیا اور تالیاں بجانے لگا۔ دو تین دفعہ یوں کودا جیسے رسّی پھاندرہا ہو۔ پانی میں چھینٹے اڑاتا، وہ جھرنے میں تقریباً کود پڑا۔ وہ تیزی کے ساتھ کھڑی چٹان سے نیچے اترا، اور جو خیال اس کے ذہن میں آیا تھا لڑکے پر واضح کرنے لگا۔ خیال گنجلک تھا اور اس کی وضاحت مزید گنجلک۔ عام طور پر کوالیئے مقامی بولی میں بات کرتا تھا، اور ایسا زبان کی ناواقفیت سے زیادہ انکسار کے باعث کرتا تھا، لیکن اس طرح کے اچانک پر جوش لمحوں میں وہ مقامی بولی سے بالکل غیر محسوس طور پر ترکی زبان پر آجاتا اور پھر اس کا کوئی لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا۔

قصہ مختصر، اس کا منصوبہ ایک معلّق آب راہ کا تھا جس میں پانی لے جانے والی نالی درختوں کی شاخوں پر ٹکائی جاتی اور یوں پانی وادی کے مقابل ایک بنجر نشیب تک پہنچ کر اسے سیراب کرتا۔ کوسیمو نے فوراً منصوبے کی تائید کی اور اسے بہتر بنانے کی ایک تجویز بھی پیش کی۔ اس کا خیال تھا کہ فصلوں پر بارش کی طرح پانی چھڑکنے کے لیے بعض مقامات پر درختوں کے چھدے ہوے تنے استعمال کیے جائیں۔ اس تجویز نے کوالیئے کو جیسے وجد کے عالم میں پہنچادیا۔

وہ تیزی سے اپنے مطالعہ خانہ میں واپس گیا اور نقشوں سے صفحوں پر صفحے بھرنے لگا۔ کوسیمو کو بھی اس منصوبے پر کام کرنا اچھا لگا، کہ وہ ہر اس کام سے خوش ہوتا تھا جو درختوں پر کیا جاسکتا ہو۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس طرح اس کی حیثیت کو ایک نئی اہمیت اور سند ملی ہے، اور اینیا سلویو کاریگا کی صورت میں اسے جیسے ایک غیر متوقع ساتھی مل گیا ہے۔ وہ مختلف چھوٹے درختوں پر ملاقاتیں طے کرتے اور کوالیئے، جس کی بغلوں میں نقشوں کے پلندے ہوتے، ایک تکونی سیڑھی کے ذریعے اوپر آتا اور وہ گھنٹوں اپنی آبراہ کی ہمیشہ سے زیادہ پیچیدہ پیش رفتوں پر بحث کرتے۔

لیکن عملی مرحلے میں یہ آبراہ کبھی نہیں پہنچ پائی۔ اینیا سلویو اکتا گیا، کوسیمو سے اس کی بحثیں شاذ ہوتی گئیں اور ہفتے بھر بعد وہ اس کے بارے میں غالباً سب کچھ بھول گیا۔ کوسیمو کو اس کا افسوس نہیں تھا۔ اس نے جلد ہی محسوس کرلیا تھا کہ یہ کام اس کی زندگی کے لیے محض ایک تھکا دینے والی پیچیدگی کے سوا

Scanned with CamScanner

کچھ اور ثابت نہ ہوگا۔

یہ واضح ہے کہ ہمارا چچا آبیات کے میدان میں بہت کچھ حاصل کر سکتا تھا۔ اسے اس علم سے فطری مناسبت تھی۔ اس کا ذہن ایسی ساخت رکھتا تھا جو مطالعے کی اس شاخ کے لیے ضروری ہے، لیکن اپنے منصوبوں کو روبہ عمل لانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ضائع کرتا، یہاں تک کہ ہر منصوبہ خاک میں مل جاتا، بالکل اس پانی کی طرح جو خراب راستے سے لائے جانے پر تھوڑی دیر گھمیریاں کھانے کے بعد مسام دار زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اگر مکھیاں پالنے کے لیے وہ، کسی اور سے سروکار رکھے بغیر، تقریباً خفیہ طور پر، اپنی مرضی سے اپنے کو وقف کر سکتا تھا اور آئے دن شہد کا بن مانگا تحفہ پیش کر سکتا تھا، تو دوسری طرف، یہ آب پاشی کا کام الف یا ب کے مفادات کا خیال رکھنے کا متقاضی تھا؛ بیرن یا جو کوئی بھی کام تفویض کرتا اس کی آرا اور احکامات پر عمل کرنے کا نام تھا۔ ڈرپوک اور ڈھلمل ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی مرضی کے خلاف کبھی نہیں جاتا تھا بلکہ جلد ہی کام سے کنارہ کر کے اسے چھوڑ دیتا تھا۔

نوک دار بلیوں اور پھاوڑوں سے لیس آدمیوں کے درمیان، اسے ہر وقت ایک کھیت کے وسط میں دیکھا جا سکتا تھا۔ پیمانہ اور نقشے کا لپٹا ہوا کاغذ لیے وہ ایک نہر کی کھدائی کا حکم دیتا اور اپنے معمول کے قدم کو حد درجہ بڑھاتے ہوئے زمین کی پیمائش کرتا۔ وہ ایک جگہ آدمیوں سے کھدائی شروع کرواتا، پھر دوسری جگہ، پھر کام بند کروا دیتا، پھر دوبارہ پیمائش لینا شروع کر دیتا۔ رات ہو جاتی اور کام اگلے دن تک روک دیا جاتا۔ اگلے دن وہ شاذ ہی وہاں سے شروع کرتا جہاں اس نے کام چھوڑا ہوتا۔ اور پھر وہ ہفتے بھر کے لیے مفقود ہو جاتا۔ آبیات سے اس کا عشق تمناؤں، ترنگوں اور آرزوؤں پر مشتمل تھا۔ بس ایک یاد تھی جو اس کے دل میں سلطان کی اس دلکش و آبیار زمینوں، میوہ زاروں اور باغوں کی تھی، جہاں یقیناً وہ خوش رہا ہوگا، جو حقیقت میں اس کی زندگی کا واحد پُر مسرت وقت تھا۔ اور ان بربری یا ترکی کے باغوں سے وہ ہمارے اومبروسا کے دیہاتی علاقوں کا لگاتار تقابل کرتا رہتا اور یوں اسے درست کرنے کی ایک خواہش محسوس کرتا، اپنی یاد میں موجود زمینی منظر سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا اور آبیات کا ماہر ہونے کی وجہ سے اس میں اپنی آرزوئے تغیر کا ارتکاز کرتے ہوئے لگاتار ایک مختلف حقیقت کا سامنا کرتا اور مایوس ہوتا رہتا۔

Scanned with CamScanner

وہ پانی کے ذریعے غیب دانی بھی کیا کرتا تھا، گو برسرِ عام نہیں، کیونکہ ہنوز وہ زمانہ تھا کہ اس حیرت ناک فن کو جادوگری سمجھا جاسکتا تھا۔ ایک بار کوسیمو نے اسے ایک کھیت میں تیزی سے چکر لگاتے اور ایک دو شاخہ لکڑی سنبھالے دیکھا۔ یقیناً یہ بھی کوئی تجربہ ہی رہا ہوگا کیونکہ اس کا حاصل کچھ نہ نکلا۔

اینیا سلویو کاریگا کے کردار کو سمجھنا کوسیمو کے لیے مددگار ثابت ہوا، کہ اس فہم نے تنہائی کے بارے میں اسے وہ کچھ سمجھایا جو زندگی میں اس کے کام آنے والا تھا۔ میں تو کہوں گا کہ وہ کوا لیئے کا عجیب عکس اس تنبیہ کے طور پر ہمیشہ ساتھ لیے پھرتا تھا کہ دوسروں سے اپنا مقدر جدا کرنے والے آدمی کے ساتھ کیا کچھ پیش آ سکتا ہے، اور اس جیسا نہ بننے میں وہ کامیاب رہا۔

۱۲

بعض اوقات راتوں کو "مدد! ڈاکو! جلدی کرو!" کی اونچی آوازوں سے کوسیمو کو جگا دیا جاتا۔

وہ تیزی سے درختوں کے ذریعے آوازوں کی سمت میں روانہ ہوتا۔ آوازوں کا مرکز کسی کسان کی جھونپڑی نکلتی جس کے باہر نیم عریاں اہلِ خاندان اپنے بال نوچ رہے ہوتے۔

"مدد، مدد، جیان دائی بروگی ابھی آیا تھا اور ہماری فصل کی ساری کمائی لے گیا!"

لوگ اکٹھے ہو جاتے۔

"جیان دائی بروگی؟ کیا وہی تھا؟ تم نے اسے دیکھا تھا؟"

"ہاں، وہی تھا! وہی تھا! اس کے چہرے پر نقاب تھا اور ہاتھ میں ایک لمبا سا پستول۔ اس کے ساتھ دو نقاب پوش اور تھے اور وہ انھیں حکم دے رہا تھا! وہ جیان دائی بروگی ہی تھا!"

"اور وہ ہے کہاں؟ کہاں گیا؟"

"اوہ، جیان دائی بروگی کو پکڑو گے؟ اس وقت تک وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے!"

یا وہ آوازیں کسی راہ گیر کی ہو سکتی تھیں جسے اس کے گھوڑے، بٹوے، چوغے اور سامان سمیت ہر چیز سے محروم کر کے بیچ سڑک میں چھوڑ دیا گیا ہوتا۔ "مدد! چور! جیان دائی بروگی!"

"وہ کس طرف کو گیا تھا؟ مجھے بتاؤ!"

Scanned with CamScanner

"وہ وہاں سے کودا تھا! کالا بھجنگ، داڑھی والا، بھری ہوئی بندوق لیے، میں خوش قسمت ہوں کہ جان بچ گئی!"

"جلدی! آؤ اس کا پیچھا کریں! وہ کس طرف کو گیا تھا؟"

"اِس طرف! نہیں، شاید اُس طرف! وہ ہوا کی طرح بھاگ رہا تھا!"

کوسیمو، جیان دائی بروگی سے ملنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اپنے بجو کتے کو اکساتے ہوئے خرگوشوں اور پرندوں کے پیچھے پیچھے وہ جنگل کے طول وعرض کو کھنگالتا۔ "اُدھر جاؤ، اوتیمو ما سیمو!" اسے حسرت تھی کہ ذاتی طور پر ڈاکو کا کھوج لگائے، اسے کچھ کرنے یا کہنے کے لیے نہیں بلکہ محض کسی مشہور آدمی کو پاس دیکھنے کے لیے۔ لیکن رات رات بھر تلاش میں پھرنے کے باوجود وہ اس سے ملنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ "اس کا مطلب ہے وہ آج رات باہر نہیں نکلا،" کوسیمو اپنے سے کہتا، لیکن صبح کو، وادی کی ایک یا دوسری سمت میں، لوگوں کی ٹکڑیوں کو اپنی دہلیزوں، یا سڑک کے موڑ پر نئی ڈکیتی پر تبصرہ کرتے پاتا۔ کوسیمو عجلت سے قریب جاتا اور رکے ہوئے سانس کے ساتھ ان کہانیوں کو سنتا۔

"لیکن تم تو ہمیشہ جنگل میں درختوں پر ہوتے ہو،" کوئی اس سے بولا۔ "تم نے یقیناً جیان دائی بروگی کو دیکھا ہوگا؟"

کوسیمو نے بہت ندامت محسوس کی۔ "لیکن... میرے خیال میں نہیں..."

"یہ اسے کیسے دیکھ سکتا تھا؟" ایک اور نے پوچھا۔ "جیان دائی بروگی کی پناہ گاہوں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ایسی پگڈنڈیاں استعمال کرتا ہے جن کے بارے میں کوئی ذی روح نہیں جانتا۔"

"اس کے سر پر اتنا بڑا انعام ہے کہ اسے پکڑوانے والا اپنی باقی زندگی آرام سے گزار سکتا ہے!"

"ہاں، واقعی! لیکن جنھیں اس کا ٹھکانا معلوم ہے، انصاف ان سے حساب لینے کو بھی اتنا ہی بے تاب ہے جتنا اس سے۔ سو اگر وہ ایک لفظ بھی بولیں تو خود سیدھے سولی پر لٹکا دیے جائیں!"

"جیان دائی بروگی! جیان دائی بروگی! لیکن تمھارے خیال میں یہ سارے جرائم واقعی وہ خود کرتا ہے؟"

"اس میں کیا شک ہے! اس پر اتنے الزام ہیں کہ اگر وہ دس چوریوں سے بھی بچ نکلا تو بھی گیارہویں کے لیے لٹکا دیا جائے گا!"

Scanned with CamScanner

''وہ ساحل کے ساتھ ساتھ سارے جنگلوں میں ڈکیتیاں کرتا پھرا ہے!''

''اس نے تو جوانی میں اپنے سردار کو بھی قتل کیا ہے!''

''اسے تو ڈاکوؤں نے خود نکال رکھا ہے!''

''جبھی تو اس نے ہمارے علاقے میں پناہ لے رکھی ہے!''

کوسیمو کوئلہ گروں کے ہاں جاتا اور ہر نئی واردات پر ان سے بات کرتا۔ جنگل میں جن لوگوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا، ان میں کوئلہ گروں، قلعی گروں اور شیشہ تراشوں کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو کرسیوں میں بھوسا بھرا کرتے تھے، یا کاٹھ کباڑ کا دھندا کرتے تھے۔ یہ لوگ گھروں میں آیا جایا کرتے تھے اور ہر صبح اس چوری کی منصوبہ بندی کرتے جو انھیں اس رات کرنی ہوتی۔ وہ چوری کا مال جنگل میں ایک خفیہ جگہ چھپاتے تھے، جو ان کے کارخانے کا بھی کام دیتی تھی۔

''جانتے ہو رات جیان دائی بروگی نے ایک بگھی پر حملہ کیا ہے؟''

''آہاں؟ اچھا، ہو سکتا ہے...''

''اس نے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کو لگام کے دہانوں سے پکڑ کر روک دیا!''

''ہوں، یا تو وہ جیان دائی بروگی نہیں ہوگا، یا وہ گھوڑے ٹڈے ہوں گے...''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمھیں یقین نہیں ہے کہ وہ جیان دائی بروگی تھا؟''

''ہاہاہا!''

جب کوسیمو نے انھیں جیان دائی بروگی کے بارے میں اس طرح باتیں کرتے سنا، تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سر کے بل کھڑا ہے یا ایڑیوں کے۔ وہ جنگل میں پھرا اور آوارہ گردوں کے ایک اور پڑاؤ میں جا کر پوچھا:

''یہ بتاؤ، کیا تمھارے خیال میں کل رات گاڑی والی واردات جیان دائی بروگی نے کی تھی؟''

''ہر واردات جیان دائی بروگی کی ہوتی ہے، بشرطیکہ کامیاب ہو۔ کیا تمھیں نہیں معلوم؟''

''بشرطیکہ کامیاب ہو؟''

''اس لیے کہ اگر کامیاب نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ حقیقت میں جیان دائی بروگی کی ہے!''

''ہاہا! اناڑی!''

کوسیمو کچھ بھی نہ سمجھ پایا۔ ''تمھارا مطلب ہے جیان دائی بروگی اناڑی ہے؟''

دوسروں نے جلدی سے اپنا لہجہ بدل لیا۔ ''نہیں، نہیں، یقیناً نہیں، وہ تو ایسا ڈاکو ہے جس سے ہر کوئی خوف کھاتا ہے!''

''تم نے اسے خود دیکھا ہے؟''

''ہم نے؟ کیا اسے کسی نے بھی دیکھا ہے؟''

''لیکن کیا تمھیں یقین ہے کہ اس کا وجود ہے؟''

''یہ بھی کہنے کی کوئی بات ہے! یقین ہے کہ اس کا وجود ہے؟ اگر اس کا وجود نہ بھی ہو...''

''اگر اس کا وجود نہ ہو؟''

''...تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہاہاہا!''

''لیکن، ہر کوئی کہتا ہے...''

''یقیناً، انھیں کیا کہنا چاہیے، یہی کہ ہر جگہ چوری اور ڈاکا زنی کرنے والا جیان دائی بروگی ہی ہے۔ وہی خوفناک ڈاکو! جس کو اس بات میں شک ہوا سے ہمارے سامنے لاؤ!''

''اور تم، لڑکے، تمھیں تو اس میں شک نہیں ہے، کیوں؟''

کوسیمو کو احساس ہونے لگا کہ جیان دائی بروگی کا خوف نیچے وادی میں زیادہ ہے لیکن جنگل میں جتنا آگے جائیں اتنا ہی یہ رویہ تشکیکی بلکہ کھلا تضحیکی ہو جاتا ہے۔

سو یہ محسوس کرتے ہی کہ اصلی استاد جیان دائی بروگی کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے، اس کی ڈاکو سے ملنے کی خواہش دم توڑ گئی۔ اور یہی وقت تھا جب کوسیمو کو اس کا سامنا کرنے کا اتفاق ہوا۔

اس سہ پہر کوسیمو اخروٹ کے درخت پر پڑھ رہا تھا۔ حال ہی میں اسے کتابیں پڑھنے کا دوبارہ شوق ہوا تھا۔ ہاتھ میں بندوق لیے سارا دن کسی وُج کا انتظار آخر کار بور کر دیتا ہے۔

ہاں، تو وہ لیساژ (Lesage) کی کتاب *Gil Blas* پڑھ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کتاب اور دوسرے میں بندوق تھی۔ اوتیمو ماسیمو، جو اپنے مالک کو پڑھتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا تھا، دائروں میں چکر لگاتے ہوئے اسے مخل کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ مثال کے طور پر، ایک تتلی پر یہ دیکھنے کے

Scanned with CamScanner

لیے بھونک کر کہ آیا یہ بات اسے تتلی پر بندوق اٹھانے کے لیے مجبور کرے گی یا نہیں۔

اور تب پہاڑ سے آنے والے راستے پر ایک داڑھی والا، بدحال، غیر مسلح شخص دوڑتا اور ہانپتا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے تلواریں لہراتے اور چلاتے ہوئے دو سپاہی تھے۔

''اسے روکو! اسے روکو! وہ جیان دائی بروگی ہے! آخر کار ہم نے اسے پکڑ لیا۔''

اب ڈاکو سپاہیوں سے تھوڑا سا آگے نکل آیا تھا لیکن وہ قدرے عجیب انداز سے چل رہا تھا جیسے غلط راستے پر پڑنے یا کسی دام میں آنے اور یوں سپاہیوں کو دوبارہ اپنے سر پر پانے سے ڈر رہا ہو۔ اخروٹ کے درخت پر جہاں کوسیمو تھا، کسی کے اوپر آنے کا زیادہ امکان نہیں تھا۔ لیکن اس کی شاخ پر ایک رسّی تھی جسے وہ مشکل حصوں کے لیے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اس نے ایک سرا زمین پر پھینکتے ہوئے دوسرا شاخ سے باندھ دیا۔ ڈاکو نے رسّی تقریباً اپنی ناک پر گرتے دیکھی۔ وہ لمحہ بھر کو لڑکھڑایا اور پھر، اپنے کو وہ ڈانواں ڈول ترنگی یا ترنگی ڈانواں ڈول ظاہر کرتے ہوئے جو ہمیشہ درست لمحے کو گرفت کرنے کے نااہل نظر آتے ہیں اور اس کے باوجود ہر بار درست لمحے کو پکڑ لیتے ہیں، جلدی سے اوپر آ گیا۔

سپاہی موقعے پر پہنچے۔ تب تک رسّی اوپر کھینچ لی گئی تھی اور جیان دائی بروگی اخروٹ کے درخت پر پتوں کے درمیان کوسیمو کے برابر بیٹھا تھا۔ راستے میں آگے ایک دوراہا تھا۔ دونوں سپاہی ایک ایک راستے پر چل پڑے، پھر دوبارہ ملے اور اپنے اگلے اقدام کے بارے میں شش و پنج میں پڑ گئے۔ اور تب ان کی مڈبھیڑ اوتیمو ماسیمو سے ہوئی جو وہاں ہوا کو سونگھتا پھر رہا تھا۔

''دیکھنا،'' ایک سپاہی دوسرے سے بولا، ''کیا یہ کتا بیرن کے بیٹے کا نہیں ہے، وہی جو ہمیشہ درختوں پر ہوتا ہے؟ اگر وہ لڑکا یہیں کہیں ہے تو ہوسکتا ہے وہ ہمیں کچھ بتا سکے۔''

''میں یہاں اوپر ہوں!'' کوسیمو نے آواز دی، مگر آواز اس نے اخروٹ کے درخت سے نہیں لگائی جہاں وہ پہلے تھا اور جہاں اس نے ڈاکو کو چھپایا تھا، بلکہ سفیدے کے ایک درخت سے، جو مقابل تھا اور جس پر وہ جلدی سے چلا گیا تھا۔ سپاہیوں نے آس پاس کے درختوں پر تلاش شروع کیے بغیر فوراً اسی سمت میں دیکھا۔

''روز بخیر، حضور والا!'' انھوں نے پوچھا۔ ''آپ کو ڈاکو جیان دائی بروگی کو دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا؟''

Scanned with CamScanner

''میں نہیں جانتا وہ کون ہے،'' کوسیمو نے جواب دیا۔ ''لیکن اگر تم ایک ٹھنگنے آدمی کو ڈھونڈ رہے ہو، تو وہ دوڑتا ہوا وہاں چشمے کے پاس والی سڑک پر گیا ہے...''

''ٹھنگنا آدمی؟ وہ تو بہت لمبا چوڑا ہے۔ اس سے ہر ایک کو خوف آتا ہے...''

''ہونہہ، یہاں اوپر سے تو ہر کوئی بالکل چھوٹا لگتا ہے...''

''شکریہ، حضور والا!'' اور وہ چشمے کی طرف چل پڑے۔

کوسیمو اخروٹ کے درخت پر واپس گیا اور دوبارہ کتاب پڑھنے لگا۔ جیان دائی بروگی ابھی تک شاخ سے چمٹا ہوا تھا۔ سرخ بالوں کے درمیان اس کا چہرہ زرد تھا اور داڑھی منتشر۔ اس کے سارے کپڑوں پر خشک پتے، شاہ بلوط کے جوز اور صنوبر کی سوئیاں چپکی ہوئی تھیں۔ وہ کوسیمو کو اپنی سبز، گول اور متحیر آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا بدشکل تھا وہ!

''کیا وہ چلے گئے؟'' اس نے پوچھنے کا فیصلہ کیا۔

''ہاں، ہاں،'' کوسیمو نے خوش خلقی سے کہا۔ ''کیا تم ڈاکو جیان دائی بروگی ہو؟''

''تم مجھے کیسے جانتے ہو؟''

''اوہ، صرف تمھاری شہرت سے۔''

''کیا تم وہ ہو جو درختوں سے کبھی نیچے نہیں آتے؟''

''ہاں۔ تم یہ بات کیسے جانتے ہو؟''

''شہرتیں مجھ تک بھی پہنچتی رہتی ہیں۔''

اتفاقاً ملنے والے دو معزز افراد کی طرح جو یہ جان کر خوش ہوتے ہیں کہ وہ آپس میں اجنبی نہیں ہیں، انھوں نے ایک دوسرے کو نرمی سے دیکھا۔

کوسیمو کو آگے کوئی اور بات نہ سوجھی، سو دوبارہ پڑھنے لگا۔

''تم کیا پڑھ رہے ہو؟''

''لیساژ کی گل بلاس۔''

''اچھی ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا ابھی بہت باقی ہے؟''

''کیوں؟ کوئی بیس ایک صفحے۔''

''اس لیے کہ جب تم اسے ختم کر لو گے تو میں یہ درخواست کروں گا کہ آیا میں اسے ادھار لے سکتا ہوں۔'' وہ قدرے گھبراہٹ سے مسکرایا۔ ''تم جانتے ہو، میں اپنا وقت چھپ کر گزارتا ہوں اور میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ میں سوچتا ہوں، کاش میرے پاس کبھی کبھار کوئی کتاب ہو۔ ایک دفعہ میں نے ایک گاڑی کو روکا۔ اس میں بہت کم مال تھا، سوائے ایک کتاب کے۔ میں نے وہ کتاب لے لی اور اپنی جیکٹ کے نیچے چھپا کر ساتھ لے آیا۔ وہ کتاب اپنے پاس رکھنے کے بدلے میں لوٹ کا باقی سارا مال دے سکتا تھا۔ شام کو لالٹین جلا کر میں اسے پڑھنے بیٹھا... وہ لاطینی میں تھی! میری سمجھ میں ایک لفظ بھی نہ آیا...'' اس نے اپنا سر ہلایا۔ ''بات یہ ہے، میں لاطینی نہیں جانتا...''

''ہاں، لاطینی زبان مشکل ہے'' کوسیمو نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نہ چاہنے کے باوجود وہ ایک حفاظتی رویہ اختیار کر رہا ہے، جواب دیا۔

''یہ کتاب فرانسیسی میں ہے...''

''فرانسیسی، تسکینی، پراونیسی، ہسپانوی — میں یہ ساری زبانیں سمجھ سکتا ہوں،'' جیان دائی بروگی نے کہا، ''اور کسی قدر قشتالی بھی: روز بخیر! شب بخیر! سمندر بہت متلاطم ہے!''

کوسیمو نے آدھے گھنٹے میں کتاب ختم کر لی اور جیان دائی بروگی کو عاریتاً دے دی۔ اور یوں میرے بھائی اور ڈاکو کی دوستی کا آغاز ہوا۔ جیان دائی بروگی جونہی کوئی کتاب ختم کرتا، کوسیمو کو جلدی سے لوٹا دیتا۔ عاریتاً ایک اور لے لیتا، پھر جلدی سے اپنی خفیہ پناہ گاہ میں چھپنے کو چلا جاتا اور مطالعے میں ڈوب جاتا۔

پہلے میں گھر کے کتب خانے سے کوسیمو کو کتابیں پہنچایا کرتا تھا اور جب وہ انھیں پڑھ لیتا تو مجھے واپس کر دیتا تھا۔ اب وہ انھیں تادیر رکھنے لگا تھا کیونکہ خود پڑھنے کے بعد وہ انھیں جیان دائی بروگی کو دے دیتا تھا۔ اکثر و بیشتر وہ اس شکل میں واپس آتیں کہ ان کی جلدیں نمی کے نشانات اور گھونگھوں کی آلائشوں سے داغ دار ہوتیں۔

کوسیمو اور جیان دائی بروگی طے شدہ دنوں میں ایک خاص درخت پر ملاقات کرتے، کتابوں کا

Scanned with CamScanner

تبادلہ کرتے اور اپنی اپنی راہ لیتے کیونکہ پولیس ہمیشہ جنگل کو کھنگالتی رہتی تھی۔ یہ سادہ سی کارروائی ان دونوں کے لیے بہت خطرناک تھی، میرے بھائی کے لیے بھی جو اس مجرم سے اپنی دوستی کی توجیہہ کرنے میں یقیناً ناکام رہتا! لیکن جیان دائی بروگی پر پڑھنے کا ایسا جنون طاری تھا کہ وہ ناول کے بعد ناول ہضم کر جاتا۔ سارا سارا دن پڑھنے میں گزارنے کے باعث وہ کئی ضخیم کتابیں، جن پر میرا بھائی ایک ہفتہ صرف کرتا، محض ایک دن میں پڑھ لیتا، اور پھر اسے فوری طور پر ایک اور کتاب درکار ہوتی، اور اگر یہ ان کی ملاقات کا دن نہ ہوتا، تو پورے دیہاتی علاقے میں ساری جھونپڑیوں میں خاندانوں کو دہشت زدہ کرتا اور اومبروسا کی ساری پولیس نفری کو حرکت میں لاتا ہوا، وہ کوسیمو کو ڈھونڈتا پھرتا۔

کوسیمو جس پر ہمیشہ ڈاکو کے مطالبوں کا دباؤ رہتا تھا، اب محسوس کرنے لگا کہ جو کتابیں وہ اسے دیتا ہے، کافی نہیں ہیں۔ سوا سے جا کر دوسرے ذخیرے ڈھونڈنے پڑے۔ وہ ایک یہودی کتب فروش کو جانتا تھا جس کا نام اور بیچی تھا۔ اور اس نے کوسیمو کو کئی کئی جلدوں والی کتابیں بھی دی تھیں۔ کوسیمو اس کے گھر جاتا اور ایک خرنوب کے درخت کی شاخوں سے اس کی کھڑکی پر دستک دیتا۔ وہ اسے اپنے شکار کردہ خرگوش، ترغے اور تیتر پہنچاتا اور ان کے عوض کتابیں لے جاتا۔

لیکن جیان دائی بروگی کا خاص اپنا ذوق تھا؛ آپ اسے کوئی بھی کتاب نہیں تھما سکتے تھے، کہ وہ اگلے ہی دن اسے بدلنے کے لیے کوسیمو کو لوٹا دیتا تھا۔ میرا بھائی عمر کی اس منزل میں تھا جہاں لوگ زیادہ سنجیدہ تحریروں سے لطف اٹھانے لگتے ہیں لیکن وہ آہستہ روی پر مجبور تھا کیونکہ جیان دائی بروگی "تیلی ماخوس کے کارنامے" نامی کتاب واپس کر گیا تھا اور اسے متنبہ کیا تھا اگر اس نے آئندہ ایسی گھٹیا کتاب دی تو وہ جس درخت پر بیٹھا ہے اسے چیر دے گا۔

اس مرحلے پر کوسیمو ایسی کتابیں جنھیں وہ اطمینان سے خود پڑھنا چاہتا تھا، ان کتابوں سے الگ کرنا پسند کرتا جنھیں وہ محض ڈاکو کو دینے کے لیے حاصل کرتا تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا، کہ اسے ان کتابوں کو بھی پڑھنا تھا، کیونکہ جیان دائی بروگی زیادہ سخت گیر اور بدگمان ہو گیا تھا اور کوئی کتاب لینے سے پہلے کوسیمو سے کہانی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا اور کوسیمو کی غلط بیانی پر ہنگامہ کھڑا کر دیتا تھا۔ میرے بھائی نے اسے کچھ ہلکے ناول دینے کی کوشش کی لیکن وہ سخت برہمی سے یہ پوچھتا ہوا لوٹ آیا، "کیا تم نے مجھے عورت سمجھ رکھا ہے؟" کوسیمو یہ اندازہ لگانے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا کہ وہ کیا پڑھنا پسند کرے گا۔

Scanned with CamScanner

سچ تو یہ ہے کہ جیان دائی بروگی کے مستقل دباؤ کی وجہ سے کوسیمو کے لیے مطالعہ، محض آدھ گھنٹے کی تفریح کے بجائے، اس کی سب سے بڑی مصروفیت اور اس کے سارے دن کا مقصد بن گیا۔ کچھ تو کتابیں سنبھالنے، ان کا اندازہ لگانے اور انھیں حاصل کرنے اور نئی کتابوں کو جاننے کے باعث، اور کچھ جیان دائی بروگی کے لیے پڑھنے کے علاوہ خود بھی پڑھنے کی بڑھتی ہوئی ضرورت کی وجہ سے، کوسیمو کو مطالعے اور تمام تر انسانی علم کی تحصیل کا ایسا اشتیاق ہوا کہ جو کچھ وہ پڑھنا پسند کرتا اس کے لیے نور کے تڑکے سے جھٹ پٹے تک کا سارا وقت ناکافی تھا اور وہ لالٹین کی روشنی میں پڑھنا جاری رکھتا۔

آخرکار رچرڈسن کے ناول اس کے ہاتھ لگے۔ جیان دائی بروگی نے انھیں پسند کیا۔ ایک ختم کرنے کے بعد وہ فوراً دوسرا طلب کرتا۔ اور بیچی نے جلدوں کا ایک پورا ڈھیر کوسیمو کو دے دیا۔ اب ڈاکو کے پاس مہینے بھر تک پڑھنے کے لیے کافی مسالہ تھا۔ کوسیمو، دوبارہ یکسوئی میسر آنے پر، پلوٹارک کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں میں ڈوب گیا۔

اس دوران اپنی پناہ گاہ میں لیٹا جیان دائی بروگی، جس کے خشک پتوں سے بھرے کھردرے لال بال اس کی پرشکن پیشانی پر لٹکے ہوتے اور جس کی سبز آنکھیں پڑھنے کی کوشش میں لال ہوئی جاتیں، ہجے کرنے کی ہیجانی حرکت میں اپنے جبڑے ہلاتا ہوا، صفحہ الٹنے کے لیے تھوک سے نم ایک انگلی اٹھائے، لگاتار پڑھے جاتا۔ رچرڈسن کو پڑھنے سے اس کے اندر مدت سے پنہاں ایک میلان جیسے باہر آ گیا۔ یہ ایک آرزو تھی جو گھریلو زندگی کی آرام دہ عادتوں کی تھی، عزیزوں اور ماضی میں جانے ہوئے جذبات کی تھی، ایک احساس تھا جو نیکی کا تھا، برے اور غلط سے نفرت کا تھا۔ اب اسے اپنے آس پاس کچھ نہ بھاتا تھا، یا ہر چیز اسے تنفر سے بھر دیتی تھی۔ اب صرف کتاب بدلنے کے لیے کوسیمو تک دوڑ لگانے کے سوا، خاص کر اگر وہ کتاب کئی جلدوں والا ناول ہو اور وہ کہانی کے وسط تک پہنچ گیا ہو، وہ اپنی آماج گاہ سے کبھی باہر نہیں آتا تھا۔ اور یوں آزردگی کے اس طوفان کو محسوس کیے بغیر جو اس کے گرد اکٹھا ہو رہا تھا، وہ تنہائی میں جی رہا تھا۔ جنگل کے باسیوں میں بھی، جو کبھی اس کے رازدار اور شریکِ جرم رہ چکے تھے، اس کے خلاف ناراضگی تھی، کہ اب وہ ایک غیر فعال ڈاکو سے، جس کے پیچھے ابھی تک ساری مقامی پولیس لگی ہوئی تھی، تنگ آ چکے تھے۔

ماضی میں سارے ایسے مقامی جو پولیس کی نظروں میں تھے، اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان

میں آوارہ گردوں اور قلعی گروں جیسے چھوٹے چور بھی تھے اور اس کے ڈاکو ساتھیوں جیسے اصل جرائم پیشہ بھی۔ یہ لوگ اپنی ہر چوری یا دھاوے کے لیے نہ صرف اس کے تسلط اور تجربے سے فائدہ اٹھاتے بلکہ اس کا نام بھی آڑ کے طور پر استعمال کرتے، کہ اس کا نام زبان در زبان چلتا جاتا اور یوں وہ خود نامعلوم رہتے تھے۔ ان کی کامیابی سے وہ بھی فائدہ حاصل کرتے جو ان کاموں میں حصہ نہیں لیتے تھے کیونکہ جنگل مالِ مسروقہ اور ہر طرح کی اشیائے ناجائز سے بھر جاتا جنھیں ٹھکانے لگانا یا دوبارہ بیچنا ہوتا تھا، اور وہ سب جو وہاں ناجائز دھندا کرتے تھے خوب مال بناتے۔ اور پھر جو کوئی بھی اپنے طور پر چوری کرتا اور جس کی جیان دائی بروگی کے فرشتوں تک کو خبر نہ ہوتی اس کے دہشت ناک نام کو، اپنے شکاروں کو ڈرانے اور ان سے مزید مال بٹورنے کے لیے استعمال کرتا۔ لوگ دہشت کے عالم میں رہتے اور یہ سوچتے کہ ہر سامنے آنے والے بدمعاش میں انھوں نے جیان دائی بروگی یا اس کے کسی آدمی کو دیکھا ہے، اور یوں اپنے بٹوؤں کی ڈوریاں ڈھیلی کر دیتے۔

یہ اچھا دور کافی عرصے رہا تھا۔ پھر جیان دائی بروگی پر بتدریج آشکار ہوا کہ وہ مفت کی آمدنی پر گذارا کر سکتا ہے اور دور سے دورتر ہوتا چلا گیا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ ہمیشہ اسی طرح چلتا رہے گا مگر اس کے بجائے حالات بدل گئے، اور اب اس کا نام اس احترام سے تہی ہو چکا تھا جو کبھی اس سے منسوب تھا۔

اب وہ، جیان دائی بروگی، کس کام کا تھا؟ کچھ اس چندھی آنکھوں والے کی وجہ سے، جو کہیں خود کو لپیٹے پڑا ناول پڑھتا رہتا، کبھی کوئی واردات نہ کرتا، نہ کوئی مال اٹھاتا، اور کچھ پولیس کے خوف سے جو ہمیشہ اس کی تلاش میں رہتی اور ذرا سے بھی شبے پر کسی کو بھی گرفتار کر لیتی، لوگ اب اپنا دھندا خاموشی سے نہیں کر سکتے تھے۔ اس پر مستزاد، اس انعام کی تحریص جو اس کے سر پر مقرر تھا... ظاہر ہے کہ بیچارے ڈاکو کے دن اب گنے چنے تھے۔

دو اور ڈاکوؤں نے، جو نوجوان اور اس کے سکھائے ہوئے تھے اور ایسے عمدہ رہنما سے ہاتھ دھونے پر راضی نہ تھے، اسے دوبارہ پاؤں جمانے کا موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ ان کے نام اگاسو اور بیل لورے تھے، اور وہ بچپن میں پھل چوروں کے گروہ میں شامل تھے۔ اب نوعمری میں وہ نوآموز ڈاکو بن گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

سو وہ جیان دائی بروگی سے ملنے اس کے غار میں گئے۔ وہ بھوسے پر لیٹا تھا۔ "ہاں، کون ہے؟" اپنی نظریں صفحے سے ہٹائے بغیر وہ بڑبڑایا۔

"ہم ایک منصوبے پر بات کرنے آئے ہیں، جیان دائی بروگی۔"

"مم... کیسا منصوبہ؟" اور اس نے پڑھنا جاری رکھا۔

"کیا تمھیں کوستانزو، افسر آب کاری کا گھر معلوم ہے؟"

"آں... ہاں... ہوں؟ کون؟ سا افسر آب کاری؟"

بیل لورے اور اگاسو نے ایک دوسرے کو برافروختگی سے دیکھا۔ اگر ڈاکو نے یہ منحوس کتاب اپنی نظروں کے نیچے سے نہیں ہٹائی تو وہ ان کا کہا ایک لفظ نہیں سمجھے گا۔ "ذرا دیر کے لیے یہ کتاب بند کرو، جیان دائی بروگی، اور ہماری بات سنو۔"

جیان دائی بروگی نے دونوں ہاتھوں سے کتاب تھام لی۔ وہ اپنے گھٹنوں پر اٹھا اور یوں ظاہر کیا جیسے کتاب کو نشان پر کھلی رکھتے ہوئے اپنے سینے کے سہارے سنبھال رہا ہو۔ لیکن پڑھتے رہنے کی خواہش بہت قوی تھی۔ سو کتاب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے اسی قدر اوپر اٹھایا کہ اس کی ناک دوبارہ اندر جا سکے۔

بیل لورے کو ایک خیال سوجھا۔ اس نے ایک جالا دیکھا جس میں بڑی سی مکڑی تھی۔ بیل لورے نے مکڑی سمیت جالا اٹھایا اور اسے جیان دائی بروگی پر، اس کی کتاب اور اس کی ناک کے درمیان، پھینک دیا۔ غریب جیان دائی بروگی اتنا نرم خو ہو گیا تھا کہ وہ مکڑی سے بھی خائف تھا۔ اس نے مکڑی کی ٹانگوں کو گدگداتے اور جالے کو اپنی ناک سے چمٹتے محسوس کیا اور یہ سمجھے بغیر کہ یہ کیا ہے، ایک کراہت بھری آواز نکالی۔ اس نے کتاب گرا دی اور حواس باختہ آنکھوں اور رال ٹپکاتے منھ کے ساتھ اپنے چہرے کے سامنے پنکھے کی طرح ہاتھ ہلانے لگا۔

اگاسو نے نیچے جھپٹا مارا اور اس سے قبل کہ جیان دائی بروگی اس پر پاؤں رکھ سکتا، وہ کتاب ہتھیانے میں کامیاب رہا۔

"یہ کتاب مجھے دے دو!" ایک ہاتھ سے مکڑی اور جالے سے چھٹکارا پانے اور دوسرے ہاتھ سے کتاب چھیننے کی کوشش کرتے ہوئے جیان دائی بروگی نے کہا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں، پہلے ہماری بات سنو!'' اگاسو نے کتاب اپنی پشت کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی 'کلاریسا' پڑھ رہا تھا۔ یہ مجھے واپس دے دو! میں مشکل سے ذرا...''

''ہماری بات سنو۔ آج رات ہمیں افسرِ آبکاری کے گھر لکڑی لے جانی ہے۔ لکڑی کے بجائے بوری میں تم ہوگے۔ جب اندھیرا ہو جائے گا، تم بوری سے باہر آ جاؤ گے...''

''لیکن میں 'کلاریسا' ختم کرنا چاہتا ہوں!'' اس نے جالے کے بچے کھچے ٹکڑوں سے اپنے ہاتھ چھڑا لیے تھے اور دونوں نوجوانوں کے ساتھ کشاکش میں لگا ہوا تھا۔

''ہماری بات سنو... جب اندھیرا ہوگا، تم پستولوں سے مسلح بوری سے باہر آؤ گے، افسرِ آبکاری کو قابو میں کرو گے کہ وہ ہفتے بھر کی ساری یافت، جو وہ اپنے پلنگ کے سرہانے تجوری میں رکھتا ہے، تمھارے حوالے کر دے...''

''ذرا مجھے یہ باب تو ختم کرنے دو...''

دونوں نوجوانوں نے اُن دنوں کے بارے میں سوچا جب جیان دائی بروگی ہر اس شخص کے پیٹ میں جو اس کی تردید کرنے کی جرأت کرتا، پستول کی دو گولیاں اتار دیتا تھا۔ یہ خیال ان کے دلوں کو یادِ ایام کی ایک ٹیس دے گیا۔ ''تم رقم کے تھیلے لوگے، سمجھ رہے ہو نا؟'' انھوں نے اداسی سے بات جاری رکھی۔ ''وہ تھیلے ہمارے پاس لاؤ گے اور ہم تمھیں تمھاری کتاب لوٹا دیں گے تا کہ تم جی بھر کے پڑھ سکو۔ ٹھیک ہے؟ تم چل رہے ہو نا؟''

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں چل رہا!''

''آہ! نہیں چل رہے؟ کیا تم... سو، تم نہیں چل رہے؟... اچھا، ہم ابھی دیکھیں گے!'' اگاسو نے کتاب کے آخر سے ایک صفحہ کھولا (''نہیں!'' جیان دائی بروگی چلّایا)، اسے پھاڑا (''نہیں، ٹھہرو!'') اور مروڑ کر آگ میں جھونک دیا۔

''آہ! سؤر! تم ایسا نہیں کر سکتے! میں اس کا انجام نہیں جان پاؤں گا!'' اور وہ کتاب چھیننے کے لیے اگاسو کے پیچھے دوڑا۔

پھر تم افسرِ آبکاری کے ہاں چل رہے ہو؟''

''نہیں... میں نہیں چل رہا!''

اگاسو نے دو اور صفحے پھاڑ دیے۔

''ٹھہرو! میں ابھی یہاں تک نہیں پہنچا ہوں! تم انھیں نہیں جلا سکتے!''

تب تک اگاسو انھیں آگ میں جھونک چکا تھا۔

''سوٗر! کلاریسا! نہیں!''

''ہاں، تو تم چل رہے ہو؟''

''میں...''

اگاسو نے تین اور صفحے پھاڑے اور انھیں شعلوں کے حوالے کر دیا۔

جیان دائی بروگی دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کے نیچے گر پڑا۔ ''میں چلوں گا،'' اس نے کہا، ''لیکن وعدہ کرو کہ تم کتاب کے ساتھ گھر کے باہر انتظار کرو گے۔''

یوں ڈاکو کو ایک بوری میں ٹھونس کر اوپر سے شاخیں رکھ دی گئیں۔ بیل لورے نے بوری اپنے کاندھوں پر دھر لی۔ اگاسو کتاب لیے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ہر بار جب بوری میں بند جیان دائی بروگی ایک جھٹکے یا آہ کے ذریعے اپنے سودے پر متاسف لگتا، تو اگاسو اسے ایک صفحہ پھٹنے کی آواز سناتا، اور جیان دائی بروگی فوراً چپ ہو جاتا۔

اس طریق سے وہ، کوئلہ گروں کا بھیس بدلے، اسے افسرِ آبکاری کے گھر تک لے گئے اور اسے وہاں چھوڑ دیا۔ پھر وہ چلے گئے اور اس کی ڈاکازنی کے انتظار میں تھوڑی دوری پر ایک زیتون کے درخت کے پیچھے چھپ گئے۔

لیکن جیان دائی بروگی بہت زیادہ عجلت میں تھا۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے بوری سے باہر آ گیا جبکہ وہ جگہ ابھی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔

''اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ!'' وہ للکارا۔ لیکن وہ پہلے جیسا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو باہر سے دیکھتا ہوا لگ رہا تھا اور قدرے مضحکہ خیز محسوس کر رہا تھا۔ ''میں نے کہا ہے، اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔ دیوار کی طرف منھ کرو، تم سب...''

سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ محض اداکاری کر رہا تھا۔ ''کیا سب لوگ یہی ہیں؟'' اس نے نہیں دیکھا تھا کہ ایک بچہ نکل بھاگا ہے۔

Scanned with CamScanner

اس طرح کے کام میں ایک منٹ بھی گنوانے کی گنجائش نہیں تھی، لیکن وہ اسے طول دیتا رہا۔ افسرِ آبکاری نے بے وقوف ہونے اور چابیاں نہ ڈھونڈھ سکنے کا بہانہ کیا۔ جیان دائی بروگی کو احساس ہو گیا کہ وہ لوگ اسے سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں، اور اس بات پر اپنے اندرون میں اس نے قدرے خوشی محسوس کی۔

آخرکار، بازوؤں میں سکوں کے تھیلے دبائے، وہ باہر آیا اور تقریباً آنکھیں موندے زیتون کے درخت کی طرف دوڑ پڑا جہاں ملنا طے ہوا تھا۔

''یہ رہا سارا مال! اب 'کلاریسا' مجھے لوٹا دو!''

چار... سات... دس بازو اس کے گرد لپٹ گئے اور اسے شانے سے ٹخنے تک جکڑ لیا۔ اسے اٹھا کر سموسے کی طرح باندھ دیا گیا۔ ''کلاریسا تمھیں سلاخوں کے پیچھے ملے گی!'' اور وہ اسے جیل خانے لے گئے۔

جیل خانہ سمندر کے ساتھ ایک چھوٹے منارے میں تھا۔ قریب ہی صنوبر کے درختوں کا ایک جھنڈ اگ رہا تھا۔ کوسیمو ایک صنوبر کے درخت کی چوٹی سے جیان دائی بروگی کی کوٹھری کے بالکل قریب پہنچ سکتا تھا اور یوں جنگلے میں سے اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔

ڈاکو کو اپنی تفتیش یا مقدمے کی فکر نہیں تھی۔ اس کے ساتھ جو بھی کچھ پیش آتا، اسے اگر تشویش تھی تو قید خانے کے ان خالی دنوں کے بارے میں جب وہ مطالعہ کرنے کا اہل نہ ہوگا۔ اور پھر وہ ناول بھی ادھورا رہ گیا تھا۔ کوسیمو نے ''کلاریسا'' کے ایک اور نسخے کا بندوبست کیا اور اسے صنوبر کے درخت پر لے گیا۔

''تم کون سے حصے تک پہنچے تھے؟''

''وہ حصہ جہاں کلاریسا چکلے سے بھاگ رہی ہے!'' کوسیمو نے چند صفحے پلٹے۔ ''آہ، ہاں، یہ رہی کلاریسا۔ اچھا...'' اور جنگلے کی طرف منہ کرتے ہوئے، جس پر وہ جیان دائی بروگی کے کسے ہوئے ہاتھ دیکھ سکتا تھا، بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

استغاثہ نے مقدمے کی تیاری میں بہت وقت لیا۔ ڈاکو نے شکنجے پر اعتراف کرنے میں مزاحمت کی۔ اس کے جرائم لاتعداد تھے اور ایک ایک جرم قبول کروانے میں کئی کئی دن لگے۔ وہ تفتیش سے قبل اور بعد روزانہ کوسیمو کو پڑھتے ہوئے سنتا۔ ''کلاریسا'' ختم ہوئی تو کوسیمو نے دیکھا کہ جیان دائی بروگی

قدرے اداس ہے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس طرح قید شخص کے لیے رچرڈسن کے ناول کسی حد تک ملال انگیز ہو سکتے ہیں۔ سو اس نے فیلڈنگ کا ایک ناول شروع کرنے کا فیصلہ کیا جس کی کہانی اور بہاؤ اسے اپنی کھوئی ہوئی آزادی کا احساس لوٹا سکتے تھے۔ یہ بات مقدمے کے دوران کی ہے، اور جیان دائی بروگی جوناتھن وائلڈ کے کارناموں کے سوا کچھ اور سوچنے سے قاصر تھا۔

ناول ختم ہونے سے پہلے پھانسی کا دن آ پہنچا۔ جیان دائی بروگی نے زندوں کے درمیان اپنا آخری سفر ایک راہب کی معیت میں ایک چھکڑے پر طے کیا۔ اومبروسا میں پھانسی چوک کے درمیان ایک اونچے بلوط پر دی جاتی تھی۔ تمام آبادی اس کے گرد ایک دائرہ بنائے کھڑی تھی۔

جب اس کا سر پھندے میں تھا تو جیان دائی بروگی نے شاخوں کے درمیان ایک سیٹی سنی۔ اس نے اپنا چہرہ اٹھایا۔ وہ کوسیمو تھا جس کے ہاتھ میں ایک بند کتاب تھی۔

''مجھے بتاؤ اس کا انجام کیا ہے،'' سزا یافتہ شخص نے کہا۔

''مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہے، جیان،'' کوسیمو نے جواب دیا، ''کہ جوناتھن کا خاتمہ پھانسی پر ہوتا ہے۔''

''شکریہ... میری طرح! الوداع!'' اور اس نے خود ٹھوکر مار کے سیڑھی کو گرا دیا اور اس کا گلا گھٹ گیا۔

جب اس کے جسم کا پھڑکنا ختم ہوا تو مجمع چھٹ گیا۔ کوسیمو شام گئے تک اس شاخ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا رہا جس سے سولی پر لٹکا آدمی جھول رہا تھا۔ ہر بار جب کوئی کوا لاش کی آنکھوں یا ناک پر ٹھونگا مارنے آتا، کوسیمو اپنی ٹوپی ہلا کر اسے بھگا دیتا۔

۱۴

ڈاکو کی صحبت میں گزرے ہوئے اس وقت کی بدولت کوسیمو نے پڑھنے اور غور و خوض کرنے کی ایسی لگن پیدا کر لی تھی جو اس کی ساری بقیہ زندگی اس کے ساتھ رہی۔ اب عام طور پر ہم اسے اس وضع میں دیکھتے کہ وہ ہاتھ میں کھلی کتاب لیے کسی آرام دہ شاخ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوتا یا پھر کسی پیڑ کے

Scanned with CamScanner

دوشاخے پر یوں جھکا ہوتا جیسے کسی اسکول کی بیچ پر ہو۔ ایک تختے پر کاغذ اور درخت کے ایک سوراخ میں قلم دان رکھے وہ ایک لمبے پَر کے قلم سے لکھنے میں مگن ہوتا۔

اب وہ تھا جو ایبے فوشیلی فلیئر کو ڈھونڈتا پھرتا کہ وہ اسے اسباق دے، ٹیسی ٹس (Tacitus) یا اووِڈ (Ovid) اور اجرامِ فلکی اور قوانینِ کیمیا کی وضاحت کرے۔ لیکن وہ بوڑھا راہب، تھوڑی بہت صرف ونحو اور تھوڑی بہت دینیات کو چھوڑ کر، شکوک وعدم آگہی کے ایک سمندر میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اپنے شاگرد کے سوالوں پر وہ اپنے باز و کھولتا اور اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا دیتا۔

''اچھے ایبے... ، ایران میں آدمی کتنی بیویاں رکھ سکتا ہے؟ اچھے ایبے... ساووِیارڈ وِکار کون ہے؟ اچھے ایبے... کیا آپ لینے لیس کے نظام کی وضاحت کر سکتے ہیں؟''

''... اچھا... اب... دیکھتے ہیں...'' ایبے آغاز کرتا ہے، پھر جھجکتا اور چپ ہو جاتا۔

لیکن کوسیمو، جو ہر طرح کی کتابیں چاٹ رہا تھا اور اپنا آدھا وقت پڑھنے اور آدھا کتب فروش کے بل ادا کرنے کے لیے، شکار کرنے میں لگاتا تھا، اسے سنانے کو ہمیشہ کوئی نئی کہانی لیے ہوتا۔ روسو کی، جو سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں میں چہل قدمی کے دوران مطالعے کے لیے پودے تلاش کرتا، یا بنجمن فرینکلن کی، جو پتنگ کے ذریعے آسمانی بجلی کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا، بیرن دی لا ہونتان کی، جو امریکہ کے انڈین لوگوں میں خوشی خوشی رہتا تھا۔

بوڑھا فوشیلی فلیئر یہ ساری باتیں حیرت زدہ توجہ کے ساتھ سنتا ہوا لگتا، آیا حقیقی دلچسپی کے باعث یا محض اس تسکین سے کہ اسے خود پڑھانا نہیں پڑ رہا، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اور جب کوسیمو اس کی طرف مڑ کے پوچھتا: ''کیا آپ جانتے ہیں کہ...؟'' تو وہ بیچ میں ہی ''نہیں! مجھے بتاؤ!...'' کہہ کر اپنی معذوری ظاہر کر دیتا۔ یا جب کوسیمو اسے جواب دیتا تو وہ ''واہ! یہ تو حیران کن بات ہے!...'' سے اپنا استعجاب ظاہر کیے بغیر نہ رہتا، اور بعض اوقات تو ''اوہ میرے خدا!...'' سے، جس کا باعث یا تو خدا کی عظمت کے اس تازہ انکشاف کا پیدا کردہ کیف ہو سکتا تھا یا پھر دنیا میں اَن گنت صورتوں میں بدی کی ہر جا موجودگی پر افسوس۔

میں ابھی محض لڑکا ہی تھا اور کوسیمو کے دوست محض اَن پڑھ، لہٰذا جو معلومات وہ کتابوں سے حاصل کرتا رہتا تھا ان پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نے اپنا راستہ بوڑھے استاد سے پوچھے گئے سوالوں اور

اسے دیے گئے جوابوں کے ایک سیل میں ڈھونڈا۔ اپے بلاشبہ ایسے دوستانہ، صلح جو نقطۂ نظر کا حامل تھا جو اوروں کی خود پسندی کی اعلیٰ فہم سے پیدا ہوتا ہے، اور کوسیمو اس سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ یوں ان دونوں کے درمیان شاگرد و استاد کا رشتہ پلٹ گیا۔ اب استاد کوسیمو تھا اور شاگرد فوشیلی فلیئر۔ میرا بھائی ایسا تسلط حاصل کر رہا تھا کہ وہ کانپتے ہوئے بوڑھے شخص کو اپنے پیچھے پیچھے درختوں پر لے جانے میں بھی کامیاب رہا۔ ایک بار تو اس نے اوندار یوا کے باغات میں اسے اپنی پتلی لٹکتی ٹانگوں کے ساتھ ایک شاہ بلوط پر پوری سہ پہر بٹھائے رکھا، اور وہ دونوں نادر پودوں اور فواروں کے پیالوں میں منعکس ہوتی شام کی لالی پر غور کرتے ہوئے، بادشاہتوں اور جمہوریتوں، مختلف مذاہب میں حق و صداقت، چینی رسومات، لزبن کے زلزلے، لیڈن کی بوتل اور حسیت پسندی کے فلسفے پر بحث کرتے رہے۔

مجھ سے توقع کی جاتی تھی کہ میں اپے سے عبرانی کے اسباق لیتا، مگر وہ میرے ہاتھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ سارا خاندان چوکنا ہو گیا۔ دیہاتی علاقہ چھانا گیا اور مچھلی پکڑنے کے تالاب تک کھنگالے گئے، مبادا وہ کسی غیر محتاط لمحے میں اُن میں گر کے ڈوب گیا ہو۔ لیکن اس شام وہ دردِ کمر کی شکایت لیے واپس آیا، جو اتنے غیر آرام دہ طور پر گھنٹوں شاخ پر بیٹھے رہنے کا نتیجہ تھا۔

تاہم یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیے کہ بوڑھے جیسنی کی مجہول قبولیت کی یہ عمومی حالت، روحانی سختی کے لیے اس کی قدیم طلب کی لمحاتی واپسیوں سے مبادلہ کرتی رہتی تھی۔ اور اگر کسی غیر محتاط اور مان جانے والی کیفیت کے دوران وہ قانون کے آگے تمام انسانوں کی برابری، یا توہمات کے برے اثرات، یا قدیم لوگوں کی دیانت داری جیسے نئے اور آزادہ رو خیالات کو کسی مزاحمت کے بغیر قبول کرتا تو چوتھائی گھنٹے بعد ہی کٹرپن اور مطلقیت کی افراط کا شکار ہو کر اپنی پیوستگی اور اخلاقی سخت گیری کی ساری شدت کے ساتھ ان خیالات پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دیتا جنھیں اس نے ابھی ابھی اتنی خوش دلی سے قبول کیا تھا۔ تب اس کے لبوں پر آزاد و مساوی شہریوں کی ذمے داریاں یا فطری مذہب کی خوبیاں، کٹر جامد اصول اور متشدد عقیدے کے ارکان بن جاتیں، جس کے پرے وہ بگاڑ کی ایک سیاہ تصویر ہی دیکھ سکتا تھا۔ تب اسے تمام نئے فلسفوں میں بدی کی مذمت بہت زیادہ خوش خلق اور سطحی معلوم ہوتی، کیونکہ تکمیل کے مشقت طلب طریقے میں سمجھوتوں اور ادھورے اقدام کی گنجائش نہیں ہوتی۔

کوسیمو اپنی بے ربطی اور کٹرپن کے فقدان پر تنقید کے خوف سے اپے کے اس اچانک معکوس

سمت میں پلٹ پڑنے پر ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہ کرتا اور جو فراواں دنیا وہ تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا، جیسے سنگِ مرمر کی قبر میں دفن ہو جاتی۔ خوش قسمتی سے اپنی اس دیر سے جاری ذہنی کاوش سے جلد ہی اکتا جاتا اور یوں تھک کر بیٹھ جاتا جیسے ہر تصور کی اس کے خالص جوہر تک تراش خراش نے اسے غیر محسوس سایوں کا شکار بننے کو چھوڑ دیا ہو۔ وہ پلکیں جھپکاتا، آہ بھرتا، آہ کو جماہی میں بدلتا اور اپنے نروان میں لوٹ جاتا۔

لیکن اپنی ان ذہنی عادتوں کے درمیان اب وہ اپنے سارے دن کو کوسیمو کے جاری رکھے ہوئے مطالعوں کی پیروی میں گزار رہا تھا، اور وہ ان درختوں جن پر کوسیمو کا بسیرا تھا، اور اوربیچی کتب فروش کی دکان کے درمیان ایمسٹرڈیم یا پیرس سے کتابیں منگوانے یا نئی آئی ہوئی کتابیں لینے کے لیے چکر لگاتا رہتا۔ اور یوں اس نے اپنے زوال کا راستہ خود تیار کیا، کیونکہ کلیسائی عدالت تک افواہ پہنچ گئی کہ اومبروسا کا ایک پادری وہ ساری کتابیں پڑھتا ہے جو یورپ میں سب سے زیادہ ممنوع ہیں۔ ایک سہ پہر، اس کے حجرے کے معائنے کے احکامات کے ساتھ پولیس ہمارے گھر آ گئی۔ اس کے اوراد و وظائف کے مجموعوں میں انھیں بیلی (Bayle) کی کتابیں ملیں جن کے ورق ابھی تک نہیں کٹے تھے، لیکن اسے ساتھ لے جانے کو ان کے لیے یہ بات ہی کافی تھی۔

اُس دھندلی سہ پہر میں، وہ ایک اداس چھوٹا سا منظر تھا۔ مجھے وہ مایوسی یاد ہے جس کے جلو میں میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا، اور یونانی افعال کی گردانیں یاد کرنی بند کر دیں کیونکہ اب مزید پڑھائی ہی نہیں ہونی تھی۔ دو مسلح بدمعاشوں کے درمیان بوڑھا ابے فوشیلی فلیئر اپنی نظریں درختوں کی طرف اٹھاتا ہوا گلی میں چل پڑا۔ ایک خاص مقام پر وہ لڑکھڑایا جیسے ایک بوتیذار کے درخت کی طرف دوڑنا اور اس پر چڑھنا چاہتا ہو، مگر اس میں دم نہیں تھا۔ کوسیمو اس دن جنگل میں شکار کر رہا تھا، اور اسے اس واقعے کا کچھ پتا نہ تھا، سو وہ ایک دوسرے کو الوداع بھی نہ کہہ سکے۔

ہم اس کی مدد کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ ہمارے والد اپنے کمرے میں بند ہو گئے اور یسوعیوں کے ہاتھوں زہر دیے جانے کے ڈر سے کھانے پینے سے انکار کر دیا۔ ابے نے اپنے باقی ماندہ دن تیاگ کے لگاتار عمل میں زنداں اور خانقاہ کے درمیان آنے جانے میں گزارے، یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ حالانکہ اس کی ساری زندگی عقیدے کے لیے وقف تھی مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کس چیز پر اعتقاد ہے۔

Scanned with CamScanner

اس کے باوجود آخری سانس تک مستقل مزاجی سے یقین لانے کی کوشش کرتا رہا۔

بہر حال ایبے کی گرفتاری سے کوسیمو کی رفتار تعلیم پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور اسی زمانے میں یورپ کے بڑے فلسفیوں اور سائنس دانوں سے اس کی مراسلت شروع ہوئی جنھیں وہ اس امید پر خط لکھتا تھا کہ اس کے سوالات واعتراضات کا حل پیش کریں گے، یا شاید اس کا محرک ارفع ذہنوں سے مباحثے کا اشتیاق اور غیر ملکی زبانوں کی مشق کرنا تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے تمام کاغذات، جنھیں وہ ایسے کھوکھلے درخت کے تنے میں رکھتا تھا جس کے بارے میں صرف اس کو علم تھا، کبھی نہیں ملے۔ انھیں اب تک یقیناً پھپھوندی لگ چکی ہوگی یا انھیں گلہریوں نے کتر لیا ہوگا۔ ان میں یقیناً صدی کے نامور ترین عالموں کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوط رہے ہوں گے۔

اپنی کتابیں رکھنے کے لیے کوسیمو نے ایک طرح کا معلق کتاب دان بنایا تھا جو برسات اور کترنے والے دہنوں سے، جس حد تک اس کے بس میں تھا، محفوظ تھا۔ لیکن وہ اپنے مطالعے اور اس وقت کے ذوق کے مطابق کتابوں کی جگہ متواتر تبدیل کرتا رہتا کہ وہ کتابوں کو پرندوں کی طرح سمجھتا تھا اور انھیں مقید یا ساکت دیکھ کر اداس ہو جاتا تھا۔

ان کتاب دانوں میں سب سے مضبوط کتاب دان پر دیدرو (Diderot) اور دالمبر (D'Alembert) کے انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں ترتیب سے رکھی تھیں جو لیگ ہارن کے ایک کتب فروش سے اسے موصول ہوئی تھیں۔ اور اگرچہ حال ہی میں کتابوں کو اوڑھنا بچھونا بنانے نے اسے اپنے ہی خیالوں میں غرق اور اپنے اردگرد کی دنیا میں کم سے کم دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا، مگر اب دوسری طرف انسائیکلوپیڈیا کے مطالعے اور شہد کی مکھی، آزاد، جنگل، باغ جیسے خوبصورت الفاظ نے اسے اپنے اطراف کی ہر چیز کو، گویا وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو، نئے سرے سے دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب جو کتابیں وہ منگواتا تھا، ان میں چھوٹی عملی کتابیں بھی شامل ہونے لگیں، مثال کے طور پر ''درختوں کی پرورش کے بارے میں'' اور وہ اپنے کو اس لمحے کا مشتاق پاتا جب اپنے نئے علم کو تجربے میں لا سکے۔

انسانی محنت نے کوسیمو کو ہمیشہ گرویدہ رکھا تھا۔ لیکن اس وقت تک کسی پرندے کی طرح درختوں میں اس کی زندگی، اس کی مستقل نقل و حرکت اور اس کی شکار بازی، اس کی نادر و بے محل خواہشات کی تکمیل کو کافی رہی تھیں۔ لیکن اب اس نے اپنے پر اپنے پڑوسی کے لیے کارآمد ہونے کی ضرورت کا غلبہ محسوس

کیا، اور یہ بھی — اگر آپ اس کا تجزیہ کریں — ایسی بات تھی جو اس نے ڈاکو کی دوستی سے سیکھی تھی، یعنی اپنے آپ کو کارآمد بنانے اور دوسرے لوگوں کے لیے کوئی ضروری خدمت بجالانے کی مسرت۔

اس نے درختوں کو چھانٹنے کا فن سیکھا اور سردیوں میں، جب درخت ٹہنیوں کی ناہموار بھول بھلیوں میں اٹکے، اپنے آپ کو پھول پتیوں اور پھلوں سے ڈھانپنے کے لیے زیادہ منظم شکلوں میں ڈھلنے کی خواہش کرتے ہوئے لگتے، وہ پھل اگانے والوں کو اپنی مدد پیش کرتا۔ وہ چھانٹنے میں ماہر تھا اور کم اجرت لیتا تھا، سو آس پاس کے ہر میوہ زار کا مالک یا مزارع اس کی مدد کا طالب ہوتا۔ اور ان ابتدائی صبحوں کی بلوریں فضا میں، اسے نیچی برہنہ شاخوں پر ٹانگیں چوڑی کیے ہوئے ایستادہ دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کی گردن کانوں تک رومال میں لپٹی ہوتی۔ وہ اپنی قینچی بلند کرتا اور اس کے یقینی رابطے کے تحت ضمنی شاخیں اور کونپلیں کلپ کلپ کی آواز کے ساتھ اڑ کر دور جا گرتیں۔ یہی کچھ وہ باغوں میں سائے یا سجاوٹ کے لیے لگے درختوں کے ساتھ کرتا جنھیں وہ ایک چھوٹے آرے سے تراشتا۔ اور جنگل میں جہاں لکڑہارے کی کلھاڑی کے بجائے، جس کا واحد استعمال کسی پرانے تنے کو مکمل طور سے کاٹنا تھا، وہ اپنے تیز تبر سے صرف پھننگیں اور بالا شاخیں تراشتا۔

درحقیقت اس شجری عنصر سے وابستگی نے، تمام سچی وابستگیوں کی طرح، اسے اس حد تک بے رحم بننے پر مجبور کر دیا کہ وہ بڑھوتری میں مدد اور شکل و شباہت دینے کے خیال سے درختوں کو آزار پہنچانے، زخمی کرنے اور تراشنے لگا۔ بلاشبہ چھانٹتے اور تراش خراش کرتے وقت وہ نہ صرف مالک کے مفادات کا خیال رکھنے کی احتیاط کرتا بلکہ سفری کی حیثیت سے اپنے راستوں کو زیادہ قابل عمل بنانے کی ضرورت کو بھی نظر میں رکھتا۔ اس طرح وہ اس امر کو یقینی بناتا کہ جن شاخوں کو ایک سے دوسرے درخت پر جانے کے لیے پل کی طرح استعمال کیا جاتا ہے ہمیشہ محفوظ رہیں اور دوسری شاخوں کی نشوونما روک کر مزید مضبوط بنائی جائیں، اور یوں اومبروسا کے یہ درخت جو اس کے لیے پہلے ہی سے بانہیں کھولے تھے، اس نے بیک وقت اپنے پڑوسی، فطرت اور خود اپنا دوست رہتے ہوئے اپنی نئی حاصل کردہ مہارت سے انھیں مددگار بنالیا۔ اپنے اس دانش مندانہ اقدام کے فوائد کو وہ سب سے زیادہ بہت بعد میں سراہنے والا تھا جب ان درختوں کی بناوٹ نے اس کی توانائی کی کمی کی زیادہ سے زیادہ تلافی کی۔ پھر زیادہ لاپروا نسلوں، ناعاقبت اندیش لالچ، اور کسی سے بھی، بلکہ اپنے آپ سے بھی، محبت نہ کرنے والے لوگوں کی آمد کے

ساتھ سب کچھ بدل جانے والا تھا اور کسی اور کوسیمو کو درختوں پر نہیں چلنا تھا۔

۱۴

اگر کوسیمو کے دوستوں کی تعداد بڑھی تو اسی طرح اس کے دشمنوں میں بھی اضافہ ہوا۔ درحقیقت جیان دائی بروگی میں پیدا ہونے والے ادب سے لگاؤ کے تغیر اور آگے چل کر اس کے زوال کے بعد سے، جنگل کے سارے لفنگے کوسیمو کے خلاف ہو گئے تھے۔ ایک رات میرا بھائی جنگل میں ایک دیودار سے لٹکے اپنے چرمی تھیلے میں سو رہا تھا کہ بجو کتے کے بھونکنے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے روشنی دکھائی دی جو نیچے سے آ رہی تھی۔ درخت کے عین نچلے حصے میں آگ لگی ہوئی تھی اور اس وقت تک شعلے تنے کو چاٹنے لگے تھے۔

جنگل میں آگ! یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟ کوسیمو کو پورا یقین تھا کہ اس رات اس نے اپنے چقماق کو چھوا تک نہیں تھا۔ سو یقیناً یہ انھیں بدمعاشوں کا کام تھا! وہ سوختنی لکڑیاں حاصل کرنے کے لیے جنگل کو جلانا اور بیک وقت کوسیمو پر الزام لگانا اور اسے زندہ جلانا چاہتے تھے۔

کوسیمو نے اس خطرے کے بارے میں، جو اس سے اس قدر قریب تھا، فوراً نہیں سوچا۔ اس کی واحد سوچ یہ تھی کہ راستوں اور پناہ گاہوں کی وسیع و عریض سلطنت، جو صرف اس کی ہے، تباہ ہو جائے گی، اور یہی اس کی واحد دہشت تھی۔ بار بار مڑتا اور خوف سے بھونکتا ہوا اوتیمو ماسیمو جلنے سے بچنے کے لیے ہی بھاگ رہا تھا۔ آگ زیر درختی میں پھیل رہی تھی۔

کوسیمو نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ دیودار کے درخت پر، جو اس وقت اس کا ٹھکانا تھا، بہت ساری مختلف چیزیں لے گیا تھا اور ان میں گرمیوں کی پیاس بجھانے کے لیے جَو کے پانی سے بھری ہوئی ایک بوتل بھی تھی۔ وہ درخت کی اونچائی پر چڑھ کر بوتل تک پہنچا۔ خوف زدہ گلہریاں اور چمگادڑیں دیودار کی شاخوں پر بھاگ رہی تھیں اور پرندے اپنے آشیانوں سے اڑ کر دور جا رہے تھے۔ اس نے بوتل کو دبوچا اور دیودار کے جلتے ہوئے تنے پر انڈیلنے کے لیے اسے کھولنے ہی والا تھا کہ اسے احساس ہوا آگ تو پہلے ہی سے زیر درختی کی گھاس، خشک پتوں اور جھاڑیوں تک پھیل چکی ہے اور جلد ہی اردگرد کے سارے

درختوں کو جلا دے گی۔ اس نے ایک خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا: ''دیودار کو جلنے دو! اگر میں آس پاس کی ساری زمین کو، جہاں ابھی تک شعلے نہیں پہنچے ہیں تر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو آگ کا راستہ رک جائے گا!'' اور اس نے بوتل کا منہ کھولتے ہوئے ایک بل کھاتی مدوّر حرکت کے ساتھ اسے آگ کے دور ترین سروں تک نیچے انڈیل دیا اور یوں زیرِ درختی کی آگ نم گھاس اور پتوں کے ایک دائرے میں محدود ہو کر مزید نہ بڑھ سکی۔

کوسیمو دیودار کی چوٹی سے سفیدے کے ایک نزدیکی درخت پر کود گیا۔ اس کا یہ اقدام عین بروقت تھا۔ دیودار کا تنا جس کی بنیاد کو آگ چاٹ گئی تھی، گلہریوں کی رائیگاں چیخوں کے درمیان، کسی بڑی ساری چِتا کی طرح زوردار دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گرا۔

کیا آگ اسی جگہ تک محدود رہے گی؟ سیکڑوں چنگاریاں اور ننھے شعلے پہلے ہی چاروں طرف اڑ رہے تھے۔ بلاشبہ گیلے پتوں کی پھسلواں رکاوٹ اس کے پھیلنے کو نہیں روک سکے گی۔ ''آگ! آگ!'' کوسیمو نے اپنی پوری آواز سے چلانا شروع کر دیا۔ ''آگ!''

''کون ہے، کون چلا رہا ہے؟'' آوازوں نے جواب دیا۔ اس مقام سے قریب کوئلہ گروں کی ایک جگہ تھی، اور برگامو کے رہنے والے لوگ، جو اس کے دوست تھے، پاس کے ایک جھونپڑے میں سو رہے تھے۔

''آگ! آگ!''

جلد ہی سارا پہاڑی علاقہ اس آواز سے گونج رہا تھا۔ جنگل میں بکھرے ہوئے کوئلہ گروں نے اپنی ناقابلِ فہم بولی میں چلا چلا کر ایک دوسرے کو خبردار کیا۔ وہ ہر سمت سے دوڑتے ہوئے آئے اور آگ پر قابو پا لیا گیا۔

آتش زنی کی اس پہلی کوشش اور اپنی زندگی پر حملے سے کوسیمو کو جنگل سے دور رہنے کی تنبیہ حاصل کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے بجائے اس نے آگ پر قابو پانے کے سارے معاملے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ وہ ایک گرم و خشک سال کی گرمیاں تھیں۔ پرووانس کی جانب ساحلی جنگلوں میں ہفتے بھر سے بہت بڑی آگ لگی ہوئی تھی۔ رات میں اس کی چمک غروبِ آفتاب کے آخر کی طرح پہاڑی علاقے پر منعکس ہوتی۔ ہوا خشک تھی، اور درخت اور جھاڑیاں خشک سالی میں سوختہ لکڑی کی طرح تھیں۔

Scanned with CamScanner

ہوا شعلوں کو ہماری جانب اکساتی ہوئی لگتی تھی، جہاں کبھی کبھار آگ اتفاقاً یا قصداً بھڑک اٹھتی اور شعلے کی ایک واحد پٹی میں باقی آگ سے مل کر سارے ساحل کے ساتھ ساتھ پھیل جاتی۔ اومبروسا خطرے سے حواس باختہ تھا جیسے وہ تنکوں کی چھت والا ایسا قلعہ ہو جس پر دشمن کے آتش زنوں نے حملہ کر دیا ہو۔ آسمان خود آگ سے بھرا تھا۔ ہر رات ٹوٹتے ستارے تمام افلاک پر اڑتے پھرتے اور ہم عین اپنے اوپر ان کے گرنے کا انتظار کرتے۔

عمومی مایوسی کے ان دنوں میں کوسیمو نے بہت سارے پیپے خریدے اور انھیں پانی سے بھر کر اہم جگہوں پر بلند ترین درختوں کی چوٹیوں پر چڑھا دیا۔ ''کوئی نہیں کہہ سکتا، مگر یہ طریقہ ایک بار کارآمد رہا ہے۔'' اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے اس نے جنگلوں کو قطع کرتے نیم خشک چشموں کے راستوں کا مطالعہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ ان کے منبعوں سے پانی کی صرف پتلی سی دھار آ رہی ہے۔ پھر وہ کوالیئے سے مشورہ کرنے گیا۔

''ارے، ہاں!'' اینیا سلویو کاریگا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے اعلان کیا۔ ''تالاب! پشتے! ہمیں منصوبہ بندی کرنی چاہیے!'' اپنے ذہن میں بے شمار خیالات کا ہجوم لیے وہ جوش و خروش سے اچھلتے ہوئے چلانے لگا۔ اوپر بیٹھے ہوئے کوسیمو نے اسے تخمینوں اور نقشوں کے کام پر لگا دیا اور اس دوران اس نے نجی جنگلوں کے مالکوں، سرکاری جنگلوں کے کرایہ داروں اور کوئلہ گروں سے رابطہ کیا۔ کوالیئے کی سربراہی اور اوپر بیٹھے ہوئے کوسیمو کی نگرانی میں (حالانکہ وہ کوالیئے کی بات سمجھنے سے قاصر تھے اور وہ انھیں ہدایات دینے اور ساتھ ہی اپنے خیالات کو مجتمع رکھنے پر مجبور تھا)، ان سب نے مل کر اس انداز میں پانی کے ذخیرے اکٹھے کیے کہ آگ لگنے کی صورت میں وہ کسی بھی جگہ پمپ پہنچا سکتے تھے۔

لیکن یہ کافی نہیں تھا۔ آگ بجھانے کے لیے آدمیوں کی جماعتیں تشکیل دینی پڑیں؛ ایسے گروہ بنانے پڑے جو خطرے کی صورت میں فوراً منظم ہو سکیں اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ تک پانی کی بالٹیاں دینے کے لیے ایک زنجیر بن جائیں اور آگ کو پھیلنے سے پیشتر روک دیں۔ یوں ایک طرح کی ملیشیا وجود میں آ گئی جو پہرے اور شبینہ معائنے کے لیے باریاں مقرر کرتی تھی۔ کوسیمو نے اومبروسا کے کسانوں اور دستکاروں میں سے آدمی بھرتی کیے، اور فوراً ہی، جیسا کہ ہر جماعت میں ہوتا ہے، ان میں ایک اجتماعی جذبے نے جنم لیا، اور گروہوں کے درمیان احساسِ مسابقت پیدا ہو گیا۔ ہر ایک اپنے کو

Scanned with CamScanner

بڑے کاموں کا اہل محسوس کرنے لگا۔ خود کو سیمو نے ایک نئی توانائی اور اطمینان محسوس کیا۔ اس نے لوگوں کو اکٹھا کرنے اور ان کا سربراہ بننے کی اپنی صلاحیت دریافت کر لی تھی۔ یہ ایسا رجحان تھا جس کا، خوش قسمتی سے، اسے کبھی غلط استعمال نہیں کرنا پڑا اور جسے اس نے زندگی میں دو چار بار ہی، اور ہمیشہ انتہائی کامیابی کے ساتھ، استعمال کیا، اور وہ بھی اس وقت جب اہم نتائج پر عمل درآمد مقصود تھا۔

وہ یہ بات سمجھتا تھا کہ شرکت انسانوں کو طاقتور بناتی ہے، ہر ایک کی بہترین صلاحیتوں کو بروے کار لا کر ایسی مسرت عطا کرتی ہے جو اپنے آپ میں رہنے والوں کو شاذ ہی میسر آتی ہے، اور اس احساس سے روشناس کراتی ہے کہ دنیا میں کتنے ہی ایماندار، نفیس اور باصلاحیت لوگ ہیں جن کے لیے آپ سب کچھ کر سکتے ہیں (جبکہ محض اپنے لیے جینے میں اکثر بالکل اُلٹ پیش آتا ہے: آپ صرف لوگوں کا دوسرا رخ ہی دیکھتے ہیں، وہ رخ جو آپ کو ہمیشہ اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھے رہنے پر مجبور کرتا ہے۔)

سو، گرمیوں کا وہ موسم آگ لگنے کا موسم تھا۔ ایک مشترکہ مسئلہ تھا جسے ہر کوئی تہِ دل سے حل کرنا چاہتا تھا اور اسے اپنے دیگر مفاد سے بالاتر رکھے ہوئے تھا؛ ہر ایک اپنے آپ کو اوروں سے ہم آہنگ اور باہمی احترام میں منسلک پانے کی مسرت سے سرشار تھا۔

بعد ازاں کوسیمو کو یہ احساس ہوا کہ جب مشترکہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو جماعتیں اتنی کارآمد نہیں رہتیں جتنی کہ شروع میں ہوتی ہیں۔ اُس وقت تنہا ہونا بہتر ہوتا ہے، سربراہ ہونا نہیں۔ لیکن اس دوران وہ سربراہ ہونے کی حیثیت سے، ایک درخت پر سے نگرانی کرتے ہوئے جنگل میں یکہ و تنہا راتیں گزار رہا تھا، جس طرح ہمیشہ گزارتا آیا تھا۔

اس نے ایک درخت کی چوٹی پر ایک گھنٹی لٹکائی جس کی آواز دور سے سنی جا سکتی تھی اور ابتدائی آگ کی پہلی چمک پر ہی ہوشیار کر دیتی تھی۔ اس نظام کی بدولت وہ تین چار بار آگ بھڑکتے ہی عین وقت پر اسے بجھانے اور جنگل کو بچانے میں کامیاب رہے۔ ہر آگ آتش زنی کی کوشش تھی اور مجرم وہی دو ڈاکو، اگاسو اور بیل لورے، تھے جو پنچایت کی حدود سے بے دخل تھے۔ اگست کے آخر میں بارش آ گئی۔ آگ کا خطرہ ٹل چکا تھا۔

ان دنوں اومبروسا میں میرے بھائی کے لیے صرف کلماتِ خیر ہی سنائی دیتے تھے۔ یہ مہربان آوازیں ہمارے گھر بھی پہنچتیں۔ ”کتنا اچھا ہے وہ!“ ”کچھ باتوں کے بارے میں تو وہ یقیناً جانتا

Scanned with CamScanner

ہے!'' لوگوں کا لہجہ ایسا ہوتا جیسے وہ کسی مختلف مذہب یا دیگر سیاسی جماعت سے تعلق رکھنے والے کو معروضی انداز سے پرکھنا چاہتے ہوں اور اپنے کو اتنا فراخ دل دکھانا چاہتے ہوں کہ وہ ان خیالات کی بھی قدر کر سکتے ہیں جو ان کے اپنے خیالات سے بعید ہیں۔

اس خبر پر جنرلیسا کا ردعمل درشت اور سرسری تھا۔ ''کیا وہ مسلح ہیں؟'' لوگ جب آگ بجھانے کے لیے کوسیمو کے بنائے ہوئے نگراں دستوں کی بات کرتے تو وہ پوچھتیں۔ ''کیا وہ جنگی مشقیں کرتے ہیں؟'' کیونکہ وہ ایسی مسلح ملیشیا تشکیل دینے کے بارے میں سوچ رہی تھیں جو بہ صورتِ جنگ فوجی کارروائیوں میں حصہ لے سکے۔

دوسری طرف ہمارے والد، سر ہلاتے ہوئے، خاموشی کے ساتھ سنا کرتے، اور یہ سمجھنا مشکل تھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں یہ ساری خبریں ان کے لیے تکلیف دہ تھیں یا انھیں بور کرتی تھیں، یا کسی طور انھیں خوش کرتی تھیں، گویا کہ ان کی ایک خواہش اس سے دوبارہ امید لگانے کا ایک موقع ہو۔ صحیح توجیہہ یقیناً آخری بات رہی ہوگی کیونکہ چند دن بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔

جہاں وہ دونوں ملے، وہ ایک کھلی جگہ تھی جس کے گرد پودوں کی ایک قطار تھی۔ بیرن اپنے بیٹے پر نظر کیے بغیر، حالانکہ وہ اسے دیکھ چکے تھے، دو تین بار قطار کے ساتھ ساتھ گھوڑے کو آگے پیچھے چلاتے رہے۔ لڑکا آخری درخت سے جست در جست نیچے کی طرف آیا یہاں تک کہ وہ قریب سے قریب تر ہو گیا۔ باپ کے مقابل آ کر اس نے اپنا تنکوں والا ہیٹ اتارا (جسے وہ گرمیوں میں جنگلی بلی کے سمور والی ٹوپی کی جگہ پہنتا تھا) اور کہا، ''روز بخیر، میرے محترم والد۔''

''روز بخیر، بیٹے۔''

''آپ خیریت سے ہیں؟''

''ہاں، اپنی عمر اور دکھوں کو دیکھتے ہوئے۔''

''آپ کو صحت مند دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔''

''میں بھی تم سے یہی کہنا چاہتا ہوں، کوسیمو۔ میں نے سنا ہے کہ تم مشترکہ بھلائی کے کاموں میں مصروف ہو۔''

''یہ جنگل جس میں میں رہتا ہوں مجھے عزیز ہے، محترم والد۔''

"کیا تم جانتے ہو کہ اس جنگل کا ایک حصہ ہماری ملکیت ہے، جو تمھاری بے چاری دادی مرحومہ لیڈی ایلزبتھ سے ورثے میں آیا ہے؟"

"جی، محترم والد، بیلر یو کے علاقے میں تیس شاہ بلوط، بائیس دیودار، آٹھ صنوبر اور ایک میپل کا درخت ہے۔ میرے پاس سرویئر کے تمام نقشوں کی نقول ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جنگل کی ملکیت رکھنے والے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے میں نے ان سب لوگوں کو جنگل کی حفاظت کرنے کے مشترکہ مفاد کے ساتھ اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔"

"اوہ، ہاں،" بیرن نے یہ موافق جواب پا کر کہا۔ "لیکن..." انھوں نے اضافہ کیا، "مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ نانبائیوں، مالیوں اور لوہاروں کی تنظیم ہے۔"

"وہ بھی ہیں، محترم والد۔ ایسے سارے ایماندارانہ پیشوں والے لوگ۔"

"کیا تمھیں احساس ہے کہ تم ڈیوک کے خطاب کے ساتھ عالی نسب منصب داروں کی سربراہی کر سکتے تھے؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ جب مجھے دوسروں سے زیادہ خیالات سوجھتے ہیں تو میں اپنے خیالات ان دوسروں کو دے دیتا ہوں، اگر وہ قبول کرنا چاہیں۔ اور یہی میرے نزدیک سربراہی ہے۔"

"اور آج کل سربراہی کرنے کے لیے درختوں پر رہنے کی ضرورت پڑتی ہے؟" بیرن کی زبان پر یہ بات آتے آتے رہ گئی۔ مگر اس بات کو دوبارہ چھیڑنے سے کیا حاصل تھا! اپنے خیالوں میں محو، انھوں نے آہ بھری، پھر اپنی پیٹی جس پر ان کی تلوار لٹک رہی تھی، ڈھیلی کی۔ "تم اب اٹھارہ سال کے ہو... وقت آ گیا ہے کہ تم اپنے آپ کو بالغ سمجھو... اب میرے پاس جینے کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے..." اور انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں پر چپٹی دھری ہوئی تلوار آگے بڑھائی۔ "کیا تمھیں یاد ہے کہ تم بیرن دی روندو ہو؟"

"جی، محترم والد، مجھے اپنا نام یاد ہے۔"

"کیا تم اپنے نام اور اس خطاب کے شایاں ہونے کی خواہش رکھتے ہو؟"

"میں کوشش کروں گا کہ انسان کے نام اور اس کے ہر وصف کا جتنا بھی میرے بس میں ہے شایاں ہو سکوں۔"

Scanned with CamScanner

''یہ تلوار سنبھالو — میری تلوار۔'' بیرن نے خود کو رکابوں میں اٹھایا۔ کوسیمو شاخ سے نیچے کو جھکا اور بیرن نے پیٹی اس کی کمر کے گرد باندھ دی۔

''شکریہ، محترم والد... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس سے صحیح کام لوں گا۔''

''الوداع، میرے بیٹے۔'' بیرن نے اپنے گھوڑے کو موڑا، لگام کو ذرا سا کھینچا اور آہستہ آہستہ روانہ ہو گئے۔

کوسیمو یہ جاننے کی خواہش میں لمحہ بھر وہیں کھڑا رہا کہ آیا اسے باپ کو تلوار سے سلامی نہیں دینی چاہیے تھی؟ پھر اس نے غور کیا کہ باپ نے تلوار ذریعۂ تحفظ کے طور پر دی تھی، آلۂ تقریب کے طور پر نہیں۔ سو اس نے تلوار کو نیام ہی میں رہنے دیا۔

۱۵

انھیں دنوں، جب کوسیمو نے کوالیئے سے زیادہ ملنا جلنا شروع کیا، تو اس کے رویے میں ایک عجیب بات محسوس کی، یا یہ کہیے کہ معمول سے ہٹی ہوئی بات دیکھی، اب وہ زیادہ عجیب ہو یا کم عجیب۔ ایسا تھا جیسے اس کا کھوئے رہنے کا انداز اب بھٹکتے ہوئے ذہن سے نہیں بلکہ ایک مسلسل اور حاوی سوچ سے ابھرتا ہو۔ اب اس پر اکثر باتیں کرنے کے دورے پڑتے اور حالانکہ اس سے قبل، غیر ملنسار ہونے کی وجہ سے، وہ کبھی شہر میں نہیں آتا تھا، لیکن اب لوگوں میں گھلا ملا، پیادہ رووں پر بوڑھے ملاحوں اور کشتی رانوں کے ساتھ بیٹھا، جہازوں کی آمد و رفت اور قزاقوں کی بدعملیوں پر تبصرہ کرتا ہوا وہ ہر وقت بندرگاہ میں موجود رہتا۔

ہمارے ساحلوں سے پرے بربری قزاقوں کے جہاز ابھی تک گشت کرتے تھے اور ہمارے جہازوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اب صرف معمولی قزاقی رہ گئی تھی، ویسی نہیں جب قزاقوں کے حملے کا مطلب تیونس یا الجزائر میں غلامی کی زندگی گزارنا، یا ناک کان سے ہاتھ دھونا ہوا کرتا تھا۔ اب اگر مسلمان اومبروسا کی کسی مستولی کشتی کو آ لیتے تو صرف اس پر لدا ہوا سامان ہی لوٹتے، جو ولندیزی پنیر کے لٹھوں، روئی کی گانٹھوں اور ایسی ہی چیزوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ بعض اوقات ہمارے لوگ تیز ثابت

Scanned with CamScanner

ہوتے اور جہاز کے بادبان پر گراب کا گولہ داغتے ہوئے بچ نکلتے۔ بربری ملاح جواب میں تھوکتے، فحش اشارے کرتے اور چلا چلا کر گالیاں بکتے۔

درحقیقت، یہ تقریباً دوستانہ قسم کی قزاقی تھی اور اس لیے جاری تھی کہ ان ملکوں کے پاشا ہمارے تاجروں اور جہازوں کے مالکوں سے کچھ مطالبے رکھتے تھے اور انھیں پورا کرنے کی تاکید کرتے تھے کیونکہ، ان کے بقول کسی نہ کسی کاروباری معاملے میں ان کے ساتھ درست معاملہ نہیں ہوا تھا، یا انھیں دھوکا دیا گیا تھا۔ اور یوں وہ ڈکیتی کے ذریعے بتدریج اپنا حساب برابر کرنے کی کوشش کرتے جبکہ اس کے ساتھ ہی تجارتی لین دین بھی، مستقل تو تکار اور مول تول کرتے ہوئے، جاری رکھتے۔ اس طرح تعلقات کو حتمی طور پر منقطع کرنا طرفین میں سے کسی کے حق میں نہیں تھا، اور جان و مال کے خطرات کے باوجود، لیکن کسی المیے کی شکل اختیار کیے بغیر، اس علاقے میں جہاز رانی جاری رہی۔

میں جو کہانی سنانے والا ہوں، اسے کوسیمو نے کئی مختلف صورتوں میں بیان کیا تھا؛ میں کہانی کی وہ صورت بیان کر رہا ہوں جو سب سے زیادہ مفصل اور سب سے زیادہ منطقی ہے۔ میرا بھائی جب اپنے کارنامے بیان کرتا تو یقیناً بہت سی اختراعی باتیں بھی شامل کر دیتا تھا، لیکن میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا ہوں کہ اس نے جو کچھ بتایا تھا اس کی حقیقی روداد پیش کروں، کیونکہ واحد ذریعہ بہرحال وہی ہے۔

خیر، ایک رات کوسیمو نے، جسے آگ کی نگرانی کے دنوں سے کسی بھی وقت جاگ جانے کی عادت پڑ گئی تھی، وادی میں آتی ہوئی ایک روشنی دیکھی۔ اس نے شاخوں پر سے اپنی بلی جیسی چال کے ساتھ خاموشی سے اس کا تعاقب کیا اور اینیا سلویو کاریگا کو دیکھا جو ترکی ٹوپی اور عبا میں ملبوس، ہاتھ میں لالٹین لیے، دبے پاؤں چلا جا رہا تھا۔

کوا لیئے، جو عام طور پر مرغیوں کے ساتھ ہی سرِ شام سو جاتا تھا، اتنی رات گئے کیا کر رہا تھا؟ کوسیمو کچھ فاصلے سے تعاقب کرتا رہا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس استغراق میں چلتے ہوئے اس کا چچا قریب قریب بہرا ہے اور اپنی ناک سے آگے فقط چند انچ ہی دیکھ سکتا ہے، کوسیمو نے احتیاط برتی کہ شور نہ ہو۔

خچر پگڈنڈیوں اور کوتاہ راستوں پر چلتا ہوا کوا لیئے سمندر کے کنارے پتھریلے ساحل کے ایک

Scanned with CamScanner

ٹکڑے پر پہنچا، اور اپنی لالٹین ہلانے لگا۔ چاند نہیں نکلا تھا اور سمندر پر قریبی لہروں کے متحرک جھاگ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوسیمو ساحل سے ذرا دور ایک صنوبر پر تھا کیونکہ اس سطح پر نباتات مفقود تھیں اور شاخوں پر آگے بڑھنا اتنا آسان نہیں تھا۔ بہر حال وہ ویران ساحل پر کھڑے اونچی ترکی ٹوپی والے بوڑھے آدمی کو تاریک سمندر کی طرف لالٹین ہلاتے ہوئے بالکل واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اور پھر اچانک اس تاریکی سے ایک اور لالٹین نے جواب دیا جو اتنی نزدیک تھی گویا اسی لمحے جلائی گئی ہو، اور گہرے رنگ کے چورس بادبان اور چپوؤں والی ایک چھوٹی کشتی، جو ہمارے علاقے کی کشتیوں سے مختلف تھی، بہت تیزی سے حرکت کرتی ہوئی ساحل کی طرف آتی دکھائی دی۔

لالٹین کی ٹمٹماتی روشنی میں کوسیمو نے پگڑیوں والے آدمی دیکھے: ان میں سے کچھ کشتی پر ہی رہے اور چپوؤں کی مدد سے اسے ساحل پر روکے رہے؛ کچھ نیچے اتر آئے۔ وہ چوڑی اور پھولی ہوئی سرخ پتلونیں پہنے تھے اور ان کی کمر سے چمکتی ہوئی شمشیریں بندھی تھیں۔ کوسیمو ہمہ تن گوش و چشم تھا۔ اس کا چچا اور بربر ایک ایسی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو اس کے لیے قابل فہم نہیں تھی لیکن وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اسے تقریباً سمجھ سکتا ہے، اور یقیناً یہی مشہور لنگوا فرانکا ہو گی۔ کبھی کبھی ہماری زبان کے دو ایک لفظ کوسیمو کے پلے پڑتے جنھیں دوسرے ناقابل فہم الفاظ سے ملاتے ہوئے اینیا سلویوتا کید اُدا کرتا۔ اطالوی زبان کے الفاظ جہازوں کے نام تھے جو اومبروسا کے جہاز مالکان کے جانے پہچانے یک مستولی اور دو مستولی جہاز تھے اور ہماری اور دوسری قریبی بندرگاہوں کے درمیان آتے جاتے تھے۔

کوالیئیر کیا کہہ رہا ہو گا، یہ سمجھنے کے لیے زیادہ عقل کی ضرورت نہیں تھی! وہ اومبروسا کے جہازوں کی آمد و رفت کے اوقات، ان پر لدے سامانِ تجارت، ان کے راستوں اور ان پر موجود ہتھیاروں کے بارے میں قزاقوں کو اطلاع دے رہا تھا۔ اور اب وہ بوڑھا آدمی یقیناً انھیں وہ سب کچھ بتا چکا ہو گا جو اس کے علم میں تھا، کیونکہ وہ مڑا اور تیزی سے واپس چل پڑا، اور قزاق اپنی کشتی میں سوار ہو کر تاریک سمندر میں غائب ہو گئے۔ جس رفتار سے وہ باتیں کر رہے تھے، اس نے محسوس کیا کہ وہ اب سے پیشتر بھی اکثر ایسا کرتے ہوں گے۔ کون جانے کہ ان بربروں کے حملے ہمارے چچا کی فراہم کردہ اطلاعات کے باعث کتنے عرصے سے جاری تھے!

کوسیمو میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہاں سے، اس ویران ساحل سے، خود کو ہٹا پاتا۔ سو وہ صنوبر پر

بیٹھا رہا۔ درخت اپنے سارے جوڑوں میں کراہ رہا تھا اور کوسیمو کے دانت بج رہے تھے، سرد ہوا سے نہیں بلکہ اپنی افسوس ناک دریافت کی برودت سے۔

اس طرح وہ ڈرپوک اور پُراسرار مردِ ضعیف جسے اپنے بچپن سے ہم نے ہمیشہ دروغ گو سمجھا تھا اور جسے کوسیمو نے اپنے خیال میں بتدریج سراہنا اور سمجھنا سیکھ لیا تھا، اب ایک گھٹیا، غدار اور ناشکر گذار بدنصیب کی حیثیت سے سامنے آیا، جو خود اپنے ملک کو، جس نے اسے اس وقت سہارا دیا جب وہ اپنی خطاؤں بھری زندگی کے بعد محض ایک دریا بردکی جانے والی لکڑی کی مثال تھا، نقصان پہنچانے پر آمادہ تھا۔ کیا وہ ان ملکوں اور لوگوں کی یاد میں، جہاں اس نے اپنے آپ کو اپنی ساری زندگی میں ایک بار یقیناً خوش پایا ہوگا، اس حد تک پہنچ گیا تھا؟ یا وہ اس کے گھرانے کے خلاف کوئی گہرا کینہ پال رہا تھا، جہاں اس کا کھایا ہوا ہر لقمہ یقیناً ذلت کا لقمہ رہا ہوگا؟ کوسیمو دو خیالوں میں منقسم تھا۔ ایک جذبہ یہ تھا کہ تیزی سے واپس جا کر جاسوس ہونے کے ناتے اس کی مذمت کرے اور یوں ہمارے تاجروں کا سامانِ تجارت بچائے، اور دوسری سوچ اس کرب کے بارے میں تھی جو اس لگاؤ کی وجہ سے ہمارے والد کا مقسوم تھا جس نے اتنے ناقابل توجیہہ طور سے انھیں اپنے سوتیلے بھائی سے وابستہ کر رکھا تھا۔ کوسیمو ابھی سے اس منظر کا تصور کر سکتا تھا۔ لعن طعن کرتے ہوئے اومبروسائیوں کی دورویہ قطاروں کے درمیان، پولیس کے گھیرے میں ہتھکڑیاں پہنے کوالیئے کو چوک میں لے جایا جانا، اس کی گردن میں پھندا پڑنا، پھانسی چڑھایا جانا... جیان دائی بروگی کی لاش پر پہرہ دینے کی رات کے بعد کوسیمو نے قسم کھائی تھی کہ وہ کسی سزائے موت کو نہیں دیکھے گا؛ لیکن اب اسے اس بات کا فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے ہی ایک عزیز کو سزائے موت سنائے۔

یہ خیال اسے ساری رات اور اگلے سارے دن اذیت دیتا رہا۔ اور وہ غیر مختتم طور پر ایک شاخ سے دوسری شاخ کی جانب پھسلتا، اپنے بازوؤں کی مدد سے اپنے کو بچاتا، چھال پر سرکتا ہوا، جیسا کہ وہ کسی گہری سوچ میں مبتلا ہونے کی صورت میں ہمیشہ کرتا تھا، متحرک رہا۔ آخر کار اس نے اپنا فیصلہ کر لیا، جو ایک سمجھوتا تھا۔ وہ قزاقوں اور اپنے چچا کو خوفزدہ کر کے ان کا مجرمانہ کاروبار، قانون کی مداخلت کے بغیر، ختم کروا دے گا۔ وہ رات کو تین چار بھری ہوئی بندوقوں کے ساتھ (اس وقت تک اپنی مختلف شکاری ضروریات کے لیے اس نے پورا اسلحہ خانہ جمع کر لیا تھا) اسی صنوبر کے درخت پر بیٹھے گا۔ جب کوالیئے

قزاقوں سے ملے گا تو وہ یکے بعد دیگرے بندوقیں چلا کر گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزارے گا۔ گولیوں کی آواز سن کر قزاق اور چچا اپنی اپنی راہ فرار اختیار کر لیں گے، اور کوا لیئے، جو یقیناً بہادر نہیں تھا، پہچان لیے جانے کے امکان اور ساحل پر اپنی ملاقاتوں کی نگرانی کیے جانے کے تیقن پر، بربر ملاحوں سے اپنے تعلقات یقینی طور پر توڑ لے گا۔

اس طرح، کوسیمو نے بھری ہوئی بندوقوں کے ساتھ صنوبر کے درخت پر دو راتوں تک انتظار کیا۔ لیکن کچھ نہیں ہوا۔ تیسری شب ترکی ٹوپی والا بوڑھا شخص اپنی لالٹین ہلاتا، ساحل کے سنگ ریزوں پر تیز تیز چلتا ہوا آیا، اور ایک کشتی پھر قریب آئی جس میں پگڑیوں والے ملاح سوار تھے۔

بندوق کی لبلبی پر کوسیمو کی انگلی تیار تھی مگر اس نے گولی نہیں چلائی، کہ اس بار ہر بات مختلف تھی۔ آپس میں مختصر بات چیت کے بعد دو قزاق ساحل پر اترے۔ انھوں نے کشتی کی طرف اشارہ کیا اور دوسروں نے سامان، جو پیپوں، گانٹھوں، بوروں، بڑے بڑے مرتبانوں اور پنیر کے ڈبوں پر مشتمل تھا، اتارنا شروع کر دیا۔ وہاں صرف ایک کشتی نہیں تھی بلکہ کئی تھیں، اور سب کی سب وزنی سامان سے بھری ہوئی۔ پگڑیوں والے قلیوں کی ایک قطار ساحل کے ساتھ ساتھ گھومتے ہوے راستے پر چلنے لگی۔ آگے آگے ہمارا چچا تھا جو اپنے متذبذب قدموں سے چٹانوں کے درمیان ایک غار کی جانب انھیں لے جا رہا تھا۔ بربروں نے وہ تمام سامان جو یقیناً ان کی تازہ ترین قزاقیوں کا ثمر تھا، وہاں رکھ دیا۔

وہ یہ سامان ساحل پر کیوں لا رہے تھے؟ بعد میں صورتِ حال پر غور کر کے اسے سمجھنا آسان تھا۔ چونکہ بربری جہاز کے لیے کسی جائز کاروبار کے سلسلے میں، جو ان کے اور ہمارے درمیان ان کی ساری قزاقیوں کے باوجود ہمیشہ جاری رہتا تھا، ہماری بندرگاہ پر لنگر انداز ہونا اور ہمارے محکمۂ محصولات کو تلاشی دینا لازم تھا، لہٰذا انھیں اپنا چرایا ہوا سامان کسی محفوظ جگہ پر چھپانا تھا، تاکہ واپس جاتے وقت اسے دوبارہ لے لیں۔ اس طرح جہاز کا عملہ یہ ثابت کر سکتا کہ گہرے سمندر میں تازہ ترین ڈکیتیوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور اومبروسا کے ساتھ اپنے معمول کے تجارتی تعلقات کو بھی مضبوط بناتا۔

یہ ساری باتیں بعد میں واضح ہوئیں۔ اُس وقت کوسیمو نے اپنے آپ سے سوالات کرنا ختم نہیں کیے۔ غار میں قزاقوں کا خزانہ چھپا تھا۔ قزاق دوبارہ کشتی میں سوار ہو رہے تھے اور خزانہ وہیں چھوڑے جا رہے تھے۔ جتنی جلد ممکن ہو، خزانہ یہاں سے منتقل ہونا چاہیے۔ میرے بھائی کے ذہن میں پہلے تو یہ

Scanned with CamScanner

خیال آیا کہ اومبروسا کے تاجروں کو جا کے جگائے جو غالباً اس مال کے جائز مالکان تھے۔ لیکن پھر اسے اپنے کوئلہ گر دوست یاد آئے جو اپنے خاندانوں کے ساتھ جنگل میں فاقہ کشی کر رہے تھے۔ اس نے لمحہ بھر دیر نہیں کی اور تیزی سے سیدھا اس جانب روانہ ہو گیا جہاں پٹی ہوئی زمین کے خاکستری ٹکڑوں کے گرد برگاموو الے اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں خوابیدہ تھے۔

"جلدی کرو! سب لوگ آ جاؤ! میں نے قزاقوں کا خزانہ ڈھونڈ لیا ہے!"

خیموں کے نیچے اور جھونپڑوں کی شاخوں سے پھونکیں مارنے، گھسٹنے اور لعن طعن کی آوازیں اور آخرکار حیرت کی ہانک پکار اور سوال آنے لگے۔ "سونا؟ چاندی؟"

"میں نے ٹھیک سے دیکھا نہیں ہے..." کوسیمو نے کہا، "بُو سے تو میں کہوں گا کہ وہاں بہت ساری صاف کی ہوئی مچھلی اور بکری کا پنیر ہے۔"

یہ سنتے ہی جنگل کے سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوے۔ جن کے پاس بندوقیں تھیں، انھوں نے بندوقیں اٹھا لیں، دوسروں نے کلھاڑیاں، سنخس، پھاوڑے یا بلیاں سنبھال لیں، لیکن ان سب نے سامان رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی برتن ضرور ساتھ لیا، یہاں تک کہ کوئلہ ڈھونے کی ٹوٹی ہوئی تغاریاں اور کالی پڑی ہوئی بوریاں بھی نہ چھوڑیں۔ ایک طویل جلوس چل پڑا۔ "ہورا ہوتا!" عورتیں تک، اپنے سروں پر خالی ٹوکریاں دھرے نکل پڑیں۔ لڑکوں نے، جو سب کے سب بوریوں کے سرپوش اوڑھے تھے، مشعلیں سنبھال رکھی تھیں۔ خشکی کے دیودار سے زیتون تک اور زیتون سے سمندر کے دیودار تک، کوسیمو آگے آگے تھا۔

وہ چٹان کے دوسری سمت جس کے پرے غار کا منھ تھا، پہنچا ہی چاہتے تھے کہ ایک بل کھائے ہوے انجیر کی چوٹی پر ایک قزاق کا سفید سایہ نمودار ہوا جو اپنی شمشیر بلند کرتے ہوے اپنے ساتھیوں کو خبردار کرنے لگا۔ چند جستوں کے بعد کوسیمو اس کے اوپر واقع ایک شاخ پر تھا۔ اس نے اپنی تلوار قزاق کی پشت پر رکھ دی یہاں تک کہ وہ چٹان کے پار کود گیا۔

غار میں قزاق سرداروں کا اجلاس جاری تھا۔ (سامان اتارنے کی اس ساری ہماہمی میں کوسیمو نے غور نہیں کیا تھا کہ قزاق غار میں ٹھہر گئے تھے۔) سنتری کی پکار سن کر وہ باہر آئے تو اپنے آپ کو کوئلے سے سیاہ مردوں اور عورتوں کے ایک ہجوم میں گھرا ہوا پایا جو اپنے سروں پر بوریاں ڈالے ہوے تھے اور

Scanned with CamScanner

بلّیوں سے مسلح تھے۔ اپنی شمشیریں عریاں کرتے ہوئے بربروں نے گھیرا توڑنے کے لیے ہلّہ بول دیا،
''ہورا ہوتا!'' ''انشاءاللہ!'' لڑائی شروع ہوگئی۔

تعداد کے لحاظ سے کوئلہ گر برتر تھے، لیکن قزاق بہتر طور سے مسلح تھے۔ پھر بھی یہ بات سب جانتے ہیں کہ شمشیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے بلیوں سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ کلِنگ! کلِنگ! اور شمشیروں کے دمشقی پھل، جن کی دھاریں کند ہو چکی تھیں، پیچھے ہٹ گئے۔ دوسری طرف ان کی بندوقیں گرجتی اور دھواں چھوڑتی رہیں مگر بے سود۔ کچھ قزاقوں کے پاس، جو ظاہر ہے افسر تھے، بکمل طور پر منقش خوبصورت بندوقیں تھیں مگر غار میں نم ہو جانے کی وجہ سے شتابی سے چنگاری نہیں نکل رہی تھی۔ اب کچھ کوئلہ گروں نے قزاق افسروں سے بندوقیں لینے کے لیے ان کے سر پر بلیاں مار کے انھیں بے ہوش کرنے کی ٹھانی۔ لیکن پگڑیوں کی وجہ سے بربروں کے سروں پر ہر وار بے اثر رہا، گویا ان کے سروں پر پگڑیاں نہیں، گدیاں بندھی ہوں۔ ان کے پیٹ میں لات مارنا بہتر تھا کیونکہ ان کے سینے اور کمر کی درمیان کی جگہ عریاں تھی۔

یہ دیکھتے ہوئے کہ خاصی مقدار میں موجود ہتھیار صرف پتھر ہیں، کوئلہ گر انھیں مٹھیاں بھر بھر کے پھینکنے لگے۔ پھر مُوروں نے پتھر واپس پھینکنا شروع کر دیا۔ انجام کار اس سنگ باری سے لڑائی نے ایک زیادہ منظم رخ اختیار کر لیا۔ لیکن، چونکہ مچھلی کی بُو سے متاثر کوئلہ گر غار میں داخل ہونے کی کوشش میں تھے اور بربر ساحل پر منتظر اپنی ہر کاری کشتی کی طرف نکلنے کے لیے کوشاں تھے، لہٰذا لڑائی جاری رہنے کی کوئی بڑی وجہ نہیں تھی۔

پھر برگاموو الوں نے غار میں داخل ہونے کے لیے ہلّہ بول دیا۔ مسلمان پتھروں کی برسات میں ابھی تک مزاحمت کر رہے تھے کہ سمندر کو جانے والا راستہ انھیں خالی نظر آیا۔ اس صورت میں مزاحمت کیوں جاری رکھی جائے؟ بہتر ہے کہ بادبان اٹھائیں اور روانہ ہو جائیں۔

کشتی پر پہنچنے کے بعد تین قزاقوں نے، جو سب امرا اور افسر تھے، بادبان کھول دیے۔ کوسیمو نے ساحل پر لگے ایک دیودار کے درخت سے چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے آپ کو مستول پر گرا دیا۔ اس نے چوٹی پر لگی افقی بلّی کو مضبوطی سے تھاما اور اس بلندی پر، گھٹنوں کے بل لٹکتے ہوئے اپنی تلوار کو نیام سے نکالا۔ تینوں قزاقوں نے اپنی شمشیریں بلند کیں۔ میرے بھائی نے دائیں بائیں تلوار چلا کر تینوں کو دور

Scanned with CamScanner

رکھا۔ کشتی، جواب تک لنگر انداز تھی، اب ایک سے دوسری سمت میں جھولنے لگی تھی۔ اسی لمحے چاند نکل آیا اور بیٹے کودی ہوئی بیرن کی تلوار اور اسلامی شمشیروں پر دمکنے لگا۔ میرا بھائی مستول پر پھسلتا ہوا نیچے آیا اور سمندر میں گرتے ہوئے ایک قزاق کے سینے میں اپنی تلوار گھونپ دی۔ دو دفاعی حربوں کے ذریعے دوسروں کے وار سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے وہ چھپکلی کی سی تیزی کے ساتھ دوبارہ اوپر گیا۔ ایک بار اور پھسل کر نیچے آیا اور تلوار ایک دوسرے قزاق کے بدن سے پار کر دی۔ وہ پھر اوپر گیا اور تیسرے سے ایک مختصر جھڑپ کے بعد اسے بھی نیچے آ کر چھید دیا۔

تینوں مسلمان افسروں کے آدھے دھڑ سمندر میں تھے اور ان کی داڑھیاں سمندری پودوں سے بھری ہوئی تھیں۔ غار کے منھ پر دوسرے قزاق پتھروں اور بلّیوں کے واروں سے حواس باختہ تھے۔ کوسیمو مستول کی چوٹی سے چاروں طرف فاتحانہ دیکھ رہا تھا اور کوالیئے، جواب تک غار میں چھپا ہوا تھا، ایسی بلی کی طرح اچھل کر باہر آیا جس کی دُم میں آگ لگی ہو۔ سر نیچا کیے وہ ساحل کی طرف دوڑ پڑا۔ اس نے کشتی کو دھکا دیا جو ساحل سے پرے تیر گئی۔ وہ اس میں کود پڑا اور چپو سنبھال کر اپنی پوری طاقت سے کھلے سمندر کی طرف کھینے لگا۔

''کوالیئے! تم کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو گئے ہو؟ واپس ساحل پر چلو! ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

جواب ندارد۔ یہ واضح تھا کہ اینیا سلویو کاریگا اپنے آپ کو بچانے کے لیے قزاقوں کے جہاز تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کا سنگین جرم اب ہمیشہ کے لیے ظاہر ہو چکا تھا۔ اگر وہ ساحل پر ٹھہرتا تو بلاشبہ پھانسی کے تختے پر پہنچتا، لہٰذا وہ مسلسل کشتی کھیتا رہا۔ حالانکہ کوسیمو کے ہاتھ میں اب تک ننگی تلوار تھی اور وہ بوڑھا شخص غیر مسلح اور کمزور تھا، مگر کوسیمو پھر بھی حیران تھا کہ اب کیا کرے۔ بنیادی طور پر وہ اپنے چچا کو قطعاً نقصان پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اور ایک بات اور تھی: اس تک پہنچنے کے لیے اسے مستول سے بالکل نیچے آنا پڑتا اور کشتی پر یہ نزول، زمین پر اترنے کے مترادف تھا۔ یہ سوال کہ آیا وہ ایک جڑوں والے درخت سے کشتی کے مستول پر کود کر اپنے ان کہے اندرونی اصولوں سے پہلے ہی انحراف نہیں کر چکا ہے، اس وقت سوچنے کے لیے بہت پیچیدہ تھا۔ سو اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ مستول کی چوٹی پر دونوں طرف ٹانگیں پھیلا کے بیٹھ گیا اور لہروں کے دوش پر دور کی سمت حرکت کرنے لگا۔ اس دوران خفیف سی ہوا نے بادبان کو تان دیا تھا مگر بوڑھے آدمی نے چپو چلانا نہیں چھوڑا۔

Scanned with CamScanner

اس نے ایک بھونک سنی اور خوشی سے چونک اٹھا۔ کتا، اوتیمو ماسیمو، جو لڑائی کے دوران اس کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا، کشتی کے پیندے میں بیٹھا اپنی دم یوں ہلا رہا تھا گویا کوئی غیر معمولی بات نہ ہو رہی ہو۔ ارے ہاں، کوسیمو نے غور کیا، بہت زیادہ فکر مندی کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک خاندانی اجتماع تھا، اس کے چچا اور اس کے کتے کا ہی سہی، اور وہ کشتی میں سیر کر رہا تھا جو شجری زندگی کے اتنے سارے برسوں کے بعد ایک خوشگوار تفریح تھی۔

چاند سمندر پر چمک رہا تھا۔ بوڑھے آدمی کی سکت اب جواب دے رہی تھی۔ وہ بہ مشکل چپو چلا رہا تھا اور سسکیاں لیتے ہوئے بار بار ''آہ، زائرہ... آہ، اللہ، اللہ، زائرہ... انشاء اللہ...!'' کہے جا رہا تھا۔ پھر وہ ترکی بولنے لگتا اور آنسوؤں کے درمیان بار بار اس عورت کا نام دُہرائے جاتا جو کوسیمو نے کبھی نہیں سنا تھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو، کوالیئے؟ تمھیں ہوا کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''زائرہ... آہ، زائرہ... اللہ، اللہ...'' بوڑھے آدمی نے اعلان کیا۔

''زائرہ کون ہے، کوالیئے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح زائرہ تک پہنچ جاؤ گے؟'' اینیا سلویو کاریگا نے اثبات میں سر ہلایا، اور سسکیوں کے درمیان ترکی میں بولنے لگا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھ کر پھر وہی نام لیا۔

کوسیمو اس زائرہ کے بارے میں مفروضات پر غور کرنے لگا۔ غالباً اس کم آمیز و پُراسرار شخص کا سب سے گہرا راز اپنے کو عیاں کرنے والا تھا۔ اگر قزاقوں کے جہاز کی طرف جاتا ہوا کوالیئے اس زائرہ سے ملنے کا امیدوار تھا تو وہ یقیناً ان عثمانی ملکوں کی کوئی عورت ہوگی۔

شاید اس عورت کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یاد اس کی ساری زندگی پر حاوی تھی۔ شاید یہ اس گم شدہ مسرت کا عکس تھا جس کا اظہار اس نے مکھیاں پال کر اور نہروں کے نقشے بنا کر کیا تھا۔ شاید وہ کوئی محبوبہ تھی، کوئی بیوی تھی، جسے وہ سمندر پار ملکوں کے باغات میں چھوڑ آیا تھا؛ یا وہ شاید اس کی بیٹی تھی، وہ بیٹی جسے اس نے بچپن کے بعد سے نہیں دیکھا تھا، جسے پانے کے لیے اس نے ہمارے علاقوں میں آنے والے کسی ترکی یا افریقی جہاز سے رابطہ کرنے کی برسوں کوشش کی تھی یہاں تک کہ اسے حتمی طور پر اس کی خبر مل گئی۔ شاید اسے بتایا گیا تھا کہ وہ ایک کنیز ہے اور تاوان کے طور پر انھوں نے تجویز کیا تھا کہ وہ اومبروسائی جہازوں کی مخبری کرے؛ یا شاید یہ وہ قیمت تھی جو ان میں شامل ہونے اور زائرہ کے دیس

Scanned with CamScanner

جانے کے لیے اسے چکائی تھی۔

اب جبکہ اس کی سازش بے نقاب ہو چکی تھی، وہ اومبروسا سے بھاگنے پر مجبور تھا۔ اب بربرا سے اپنے ساتھ لے جانے اور زائرہ تک پہنچانے سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی باتوں کے ہانپتے ٹکڑوں کے بدلتے لہجوں میں امید، التجا تھی اور یہ خوف بھی کہ شاید یہ موقع بھی سازگار ثابت نہ ہو، یا اسے کوئی ناگہانی اس سے جدا نہ کر دے جس کے لیے وہ تڑپتا رہا ہے۔

چپو چلانے میں اس کی ساری طاقت صرف ہو چکی تھی کہ اس نے ایک اور بربری کشتی کو نزدیک آتے دیکھا۔ غالباً انھوں نے جہاز سے ساحل پر لڑائی کی آوازیں سن لی تھیں اور معلومات کرنے کے ملاح بھیج رہے تھے۔ کوسیمو بادبان کے پیچھے چھپنے کے لیے آدھے مستول تک نیچے اترا، مگر وہ بوڑھا شخص ملتجی بازو پھیلاتے ہوئے لنگوا فرانکا میں انھیں آوازیں دینے لگا کہ اسے جہاز پر لے جائیں۔ اس کی درخواست قبول ہوئی۔ دو پگڑی پوش جاں نثاروں نے، جونہی وہ قریب پہنچے، ہلکا پھلکا ہونے کی وجہ سے اسے کاندھوں سے پکڑ کر اپنی کشتی پر کھینچ لیا۔ جس کشتی پر کوسیمو تھا، ریلے سے دور ہو گئی، بادبان نے ہوا پکڑ لی اور یوں میرا بھائی، جسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس بار خاتمہ یقینی ہے، پکڑے جانے سے بچ نکلا۔

ہوا اسے قزاقوں کی کشتی سے دور لے جا رہی تھی کہ کوسیمو نے بلند ہوتی ہوئی آوازیں سنیں گویا کہ حجت جاری ہو۔ مُوروں کے کہے ہوئے ایک لفظ نے، جو "مارانو" سا سنائی دیا، اور بوڑھے شخص کی دُہرائی ہوئی پکار "آہ، زائرہ" نے کشتی پر کوالیئے کے استقبال کے بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں چھوڑا۔ بلاشبہ وہ اسے غار پر شب خون، اپنے مالِ غنیمت کے زیاں اور اپنے آدمیوں کی ہلاکت کا ذمے دار سمجھتے تھے اور اس پر غداری کا الزام لگا رہے تھے... ایک آخری چیخ، پانی میں گرنے کی ایک آواز، پھر خاموشی۔ اور کوسیمو تک اپنے باپ کی چلاتی ہوئی آواز، جو اینیا سلویا کو پکارتے ہوئے دیہاتی علاقے میں اپنے ناجائز بھائی کا پیچھا کر رہا تھا، اتنے واضح طور پر آئی گویا کہ وہ اس نے سچ مچ سنی ہو۔ کوسیمو نے اپنا چہرہ بادبان میں چھپا لیا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ کشتی کہاں جا رہی ہے، وہ مستول کی افقی بلی پر دوبارہ چڑھا۔ سمندر کے بیچوں بیچ کوئی چیز بہہ رہی تھی گویا کہ کوئی رَو اسے لے جا رہی ہو۔ وہ لنگر نما تھا، مگر ایک طرح کا دُم والا لنگر نما... چاند کی ایک کرن اس پر پڑی تو کوسیمو نے دیکھا کہ وہ کوئی شے نہیں بلکہ ایک سر ہے، جو پھندنے والی ترکی ٹوپی میں اٹکا ہوا ہے۔ اس نے کوالیئے کا الٹا ہوا چہرہ پہچان لیا۔ وہ اپنے معمول کے

Scanned with CamScanner

مستغرق انداز میں اوپر کی سمت دیکھ رہا تھا اور اس کا منھ کھلا ہوا تھا۔ لیکن داڑھی کے نیچے اس کا بقیہ جسم پانی میں ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوسیمو پکارا، ''کوالیئے! تم کیا کر رہے ہو؟ تم کیا کر رہے ہو؟ کشتی میں کیوں نہیں آتے؟ کشتی کا نچلا حصہ پکڑو! میں سوار ہونے میں تمھاری مدد کروں گا، کوالیئے!''

لیکن اس کے چچا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تو اسی دہشت زدہ انداز سے اوپر دیکھتے ہوے جیسے اسے کچھ نظر نہ آ رہا ہو، پانی میں بہا جا رہا تھا۔ کوسیمو نے کہا، ''اے! اوتیمو ماسیمو! پانی میں کود جاؤ! کوالیئے کو گدی سے پکڑو! اسے بچاؤ! اسے بچاؤ!''

مطیع کتا پانی میں کود پڑا۔ اس نے اپنے دانت بوڑھے شخص کی گدی میں گڑونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا، سو اس نے بوڑھے کو داڑھی سے پکڑ لیا۔

''گدی سے، میں کہتا ہوں گدی سے، اوتیمو ماسیمو!'' کوسیمو نے اصرار کیا۔ لیکن کتے نے داڑھی سے پکڑ کر سر کو اٹھایا اور اسے کشتی کے کنارے کی طرف دھکیلنے لگا اور تب یہ کھلا کہ گدی تھی ہی نہیں، نہ بدن تھا نہ کوئی اور شے۔ فقط ایک سر تھا۔ اینیا سلویو کاریگا کا سر جسے شمشیر کے ایک وار نے قطع کر دیا تھا۔

۱۶

کوالیئے کے انجام کا پہلا بیان جو کوسیمو نے پیش کیا وہ بہت مختلف تھا۔ جب ہوا کشتی کو ساحل پر لائی تو وہ مستول کی اُفقی بلّی سے چمٹا ہوا تھا اور اوتیمو ماسیمو کٹے ہوے سر کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو، جو اس کی آواز پر دوڑے آئے، ایک بہت سادہ کہانی سنائی۔ دریں اثنا وہ ایک رسّی کی مدد سے تیزی کے ساتھ ایک درخت پر چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ کوالیئے کو قزاقوں نے اغوا اور بعدازاں قتل کر دیا تھا۔ غالباً اس بیان کا محرک باپ کا خیال تھا جو اپنے سوتیلے بھائی کی موت کی خبر اور اس دردناک یادگار کے نظارے سے اتنا دل گرفتہ ہوتا کہ کوسیمو کوالیئے کے سنگین جرم سے اسے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت، بعدازاں، جب کوسیمو نے اس گہری اداسی کے بارے میں سنا جس میں بیرن ڈوبا ہوا تھا تو اس نے قزاقوں کے خلاف ایک خفیہ اور پُرفن سازش کی کہانی گھڑتے ہوے، جس کے لیے کوالیئے نے کچھ عرصے سے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا اور جس کا انکشاف اس کی موت کا سبب بنا تھا، ہمارے فطری

Scanned with CamScanner

چچا کے لیے ایک تصوراتی ستائش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ بیان متضاد تھا اور اس میں بہت سے خلا تھے۔ اس وجہ سے بھی کہ کوسیمو مسروقہ اشیا کو غار میں اتارے جانے اور کوئلہ گروں کی مداخلت کا قصہ چھپانا چاہتا تھا، کیونکہ اگر ساری کہانی عام ہو جاتی تو اومبروسا کی تمام آبادی برگاموو الوں سے اپنی اشیاے تجارت واپس لینے کے لیے جنگل کا رخ کر لیتی اور ان سے وہی برتاؤ کرتی جو ڈاکوؤں سے کیا جاتا ہے۔

کوئی ہفتے بھر بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ کوئلہ گروں نے مال ٹھکانے لگا دیا ہے، اس نے غار پر حملے کی بات بتائی۔ اور جو کوئی بھی جنگل میں اپنا مال برآمد کرنے گیا خالی ہاتھ لوٹا۔ کوئلہ گروں نے ساری مچھلی قتلے قتلے کر کے برابر برابر حصوں میں بانٹ لی تھی، اور مختلف قسم کی قیمہ بھری آنتوں، پنیر کے کیکوں اور باقی چیزوں سے شان دار ضیافت اڑائی جو سارا دن جاری رہی۔

ہمارے والد بہت ضعیف ہو گئے تھے۔ اینیا سلویو کی موت کے صدمے نے ان کے رویے پر عجیب و غریب اثر ڈالے تھے۔ انھیں اپنے بھائی کے کاموں کو ضائع ہونے سے بچانے کا خبط ہو گیا تھا، لہٰذا وہ شہد کے چھتوں کی دیکھ بھال خود کرنے پر مصر تھے، حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے کوئی چھتا قریب سے دیکھا بھی نہیں تھا، مگر انھوں نے اس کام کا آغاز بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا۔ مشورے کے لیے وہ کوسیمو سے رجوع کرتے جو چھتوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان گیا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ اس سے براہِ راست سوالات کرتے تھے بلکہ محض گفتگو کو مگس بانی کی طرف موڑ دیتے۔ کوسیمو جو کچھ کہتا، وہ اسے سنتے اور پھر وہی کچھ ایک خود کفیل چڑ چڑے لہجے میں احکامات کی شکل میں دہقانوں کے آگے دہرا دیتے، گویا کہ سب کچھ بالکل واضح ہو۔ نیش زنی کے خوف سے وہ کوشش کرتے کہ خود چھتوں سے بہت زیادہ قریب نہ ہوں، لیکن وہ اس خوف پر قابو پانے کا تہیہ کیے ہوے تھے، اور اس کے باعث یقیناً شدید اذیتوں سے گزر رہے ہوں گے۔ بے چارے اینیا سلویو کے آغاز کردہ ایک منصوبے کو مکمل کرنے کے لیے انھوں نے کئی آبی گزرگاہیں کھودنے کے احکامات بھی دیے۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتے تو یہ ایک بہترین کام ہوتا کیونکہ بے چارہ بھائی اپنا ایک بھی منصوبہ مکمل نہ کر پایا تھا۔

افسوس کہ عملی معاملات کے لیے بیرن کا یہ بعد از وقت شوق محض تھوڑا عرصہ ہی رہا۔ ایک دن جب وہ چھتوں اور آبی گزرگاہوں کے درمیان بے چینی کے ساتھ مصروف تھے تو ان کی کسی جلد بازی کے باعث مکھیوں کے ایک جھنڈ نے ان پر حملہ کر دیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر اپنے ہاتھ اِدھر اُدھر ہلانے

Scanned with CamScanner

لگے۔ انھوں نے ایک شہد کا چھتا الٹ دیا اور اپنے عقب میں مکھیوں کا ایک بادل لیے بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہے تھے کہ ایک نالے میں، جسے پانی سے بھرنے کی کوشش کی جا رہی تھی، گر پڑے۔ جب انھیں باہر نکالا گیا تو وہ پانی سے شرابور تھے۔

انھیں بستر پہ لٹا دیا گیا۔ کچھ تو اس بخار سے جو مکھیوں کے ڈنک کے باعث تھا، اور کچھ بھیگنے کی وجہ سے، وہ ہفتے بھر بستر پہ رہے۔ پھر وہ کم و بیش ٹھیک ہو گئے لیکن وہ اس قدر نحیف ہو گئے تھے کہ پھر کبھی بحال نہ ہو سکے۔

وہ جینے کی خواہش گنوا چکے تھے اور تمام دن بستر میں رہتے تھے۔ زندگی میں کچھ بھی تو ان کی امیدوں کے مطابق نہیں ہوا تھا۔ نوابی کا اب کوئی ذکر تک نہیں کرتا تھا۔ ان کا بڑا بیٹا اب بھی، جبکہ وہ جوان ہو چکا تھا، اپنی زندگی درختوں پر گزار رہا تھا۔ ان کا سوتیلا بھائی قتل کر دیا گیا تھا۔ ان کی بیٹی بہت دور تھی اور ایسے خاندان میں بیاہی گئی تھی جو خود اس سے زیادہ ناگوار تھا۔ میں ان کا رفیق بننے کے لیے بہت چھوٹا تھا۔ ان کی بیوی بہت ترنگی اور شیخی باز تھی۔ وہ اس وہم میں مبتلا ہو گئے کہ یسوعیوں نے ان کے گھر پہ قبضہ کر لیا ہے اور انھیں اپنے کمرے سے نکلنے کی اجازت نہیں دے رہے۔ اور یوں جس تکلیف دہ اور اوٹ پٹانگ انداز سے وہ جیے تھے، اسی طرح اپنی موت سے جا ملے۔

کوسیمو بھی ایک سے دوسرے درخت کے ذریعے جنازے کے ساتھ ساتھ آیا۔ لیکن وہ قبرستان میں داخل نہ ہو سکا کیونکہ صنوبروں کی شاخیں آپس میں اتنی گتھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان پر چڑھنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ قبرستان کی دیوار کے پرے سے تدفین کا منظر دیکھتا رہا اور جب ہم سب تابوت پر اپنے اپنے حصے کی مٹی ڈال رہے تھے تو اس نے بھی پتوں کی ایک چھوٹی سی شاخ نیچے گرا دی۔ میں نے سوچا کہ ہم سب میرے والد سے اتنے ہی دور رہے تھے جتنا کہ درختوں پر رہتے ہوئے کوسیمو۔

سو، اب کوسیمو پیرن دی رونڈو تھا۔ اس کی زندگی میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ خاندانی مفادات کا خیال رکھتا تھا لیکن ہمیشہ قدرے بے ضابطگی کے ساتھ۔ جب ناظر اور مزارع اسے ڈھونڈنا چاہتے تو نہیں جانتے تھے کہ اسے کہاں تلاش کریں، اور جب وہ اس بات کے بہت کم متمنی ہوتے کہ کوسیمو ان سے ملے، تو عین اس وقت وہ کسی شاخ پر آدھمکتا۔

کسی قدر معاملات جائیداد کے سلسلے میں کوسیمو اب اکثر شہر میں نظر آتا تھا۔ وہ یا تو چوک میں

Scanned with CamScanner

اخروٹ کے بڑے درخت پر ہوتا یا گھاٹ کے ساتھ گلِ خطمی کے درختوں پر۔ لوگ اس کے ساتھ بڑی تکریم سے پیش آتے اور اسے ''محترم سردار'' کہتے۔ اس نے بڑی عمر کے لوگوں جیسے کئی رویے اپنا لیے تھے جیسا کہ نوجوان بعض اوقات کرتے ہیں، اور اوپر بیٹھا درخت کی جڑ کے گرد مجتمع اومبروسائیوں کی ٹولیوں کو کہانیاں سناتا رہتا۔

وہ اکثر ہمارے چچا کا انجام بیان کرتا، جو کبھی دو بار یکساں نہیں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے قزاقوں کے ساتھ کوالیئے کی ساز باز کا انکشاف کرنا شروع کر دیا۔ لیکن نیچے بیٹھے لوگوں کی برہمی کے فوری طوفان کو روکنے کے لیے وہ ایک دم سے زائرہ کی کہانی شامل کر دیتا، جیسے کاریگا نے مرنے سے پہلے اس بارے میں اسے راز دار بنایا ہو، اور انجام کار اس نے بوڑھے شخص کے افسوسناک انجام پر لوگوں میں ہمدردی پیدا کر دی۔

مجھے یقین ہے کہ متواتر اندازوں کے ذریعے کوسیمو، مکمل اختراع کی مدد سے، حقائق کی ایک ایسی تفصیل تک پہنچ گیا تھا جو تقریباً مکمل طور پر درست تھی۔ اس نے یہ داستان دو تین بار بیان کی، پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ سامعین اسے سننے سے کبھی نہیں اکتاتے اور ان میں نئے سننے والوں کا روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جو تفصیلات جاننا چاہتے ہیں، وہ افراط و تفریط اور مبالغہ آرائی کرتے ہوئے اس میں نت نئے اضافے کرتا اور نئے کردار و واقعات متعارف کراتا رہا، اور یوں یہ کہانی بالکل مسخ ہو کر پہلے سے بھی کہیں زیادہ اختراعی بن کر رہ گئی۔

اب کوسیمو کو ایسے حامی مل گئے تھے جو اس کی ہر بات کو حیرت سے منھ پھاڑے سنتے۔ وہ درختوں پر اپنی زندگی، اپنی شکاریات، ڈاکو جیان وائی بروگی اور کتے اوتیمو ماسیمو کے بارے میں کہانیاں سنانے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ اس کی کہانیوں کا مواد بن گئے اور اس کی داستان گوئی کبھی ختم ہونے میں نہ آتی۔ (میں اس بات کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ اگر وہ سب جو میں لکھ رہا ہوں ناقابلِ یقین ہو، یا انسانی زندگی اور حقیقت کے ہم آہنگ نقطۂ نظر سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو معذرت خواہی کر سکوں۔)

مثال کے طور پر کوئی مجہول شخص پوچھتا، ''لیکن کیا یہ سچ ہے آپ نے ایک بار بھی درختوں سے قدم نہیں ہٹائے، محترم سردار؟''

اور کوسیمو شروع ہو جاتا۔ ''ہاں ایک بار، مگر غلطی سے۔ میں ایک ہرن کے سینگوں پر چڑھ گیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں پیپل کے درخت پر جا رہا ہوں مگر وہ ایک ہرن تھا جو شاہی شکار گاہ سے نکل بھاگا تھا اور اس خاص جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ہرن نے اپنے سینگوں پر میرا وزن محسوس کیا تو جنگل کی طرف بھاگ لیا۔ تم لوگ میری حالت کا اندازہ کر سکتے ہو! سینگوں کی تیز نوکوں، کانٹوں اور چہرے سے ٹکراتی شاخوں کی وجہ سے میں اپنے سارے وجود میں چیزوں کو چبھتا محسوس کر رہا تھا۔ مجھ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتا ہوا، ہرن پیچھے ہٹتا۔ میں مضبوطی سے سینگوں پر قائم رہا..."

یہاں پہنچ کر وہ ٹھہر جاتا اور منتظر رہتا، تاوقتیکہ دوسرے لوگ پوچھتے: "اور اس مصیبت سے آپ نکلے کیسے جناب؟"

کوسیمو ہر بار ایک مختلف اختتام بیان کرتا۔ "ہرن دوڑتا ہی چلا جا رہا تھا۔ آخر وہ گلّے تک پہنچا۔ بیشتر ہرن اس کے سینگوں پر آدمی کو سوار دیکھ کر منتشر ہو گئے۔ تجسس کے مارے کچھ ہرن قریب آئے۔ میں نے بندوق سیدھی کی جو ابھی تک میرے کندھے پر لٹک رہی تھی اور جس ہرن پر بھی میری نظر پڑی میں نے مار گرایا۔ میں نے ان میں سے پچاس ہرن گرائے..."

"کیا ان علاقوں میں کبھی پچاس ہرن رہے ہیں؟" ان میں سے کوئی کوچہ گرد پوچھتا۔

"وہ نسل اب معدوم ہو گئی ہے کیونکہ وہ پچاس کی پچاس تمام ہرنیاں تھیں، کیا سمجھے؟ ہر بار جب میرا ہرن کسی مادہ کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تو میں گولی چلا دیتا اور وہ نیچے آ رہتی۔ ہرن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ پھر... پھر اس نے اچانک اپنے آپ کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تیزی سے ایک اونچی پہاڑی پر چڑھا اور اپنے آپ کو نیچے گرا دیا۔ لیکن میں جوں توں ایک باہر کو نکلے ہوئے صنوبر سے چمٹ گیا اور یوں اس وقت یہاں موجود ہوں!"

یا وہ یہ بتاتا کہ سینگوں والے دو ہرنوں کے درمیان لڑائی چھڑ گئی اور وہ ہر ٹکر پر ایک ہرن کے سینگوں سے دوسرے کے سینگوں پر چھلانگیں لگاتا رہا یہاں تک کہ ایک خاص زوردار ٹکر نے اسے بلوط کے درخت پر اچھال دیا...

درحقیقت وہ داستان گو کے اس خبط سے مغلوب تھا جو نہیں جانتا کہ کون سی کہانیاں زیادہ خوبصورت ہیں، وہ جو واقعی پیش آئیں اور جن کی تمثال انگیزی گزرے ہوئے گھنٹوں، گھٹیا جذبات، دریت، مسرت، عدم تحفظ، خود پسندی اور خود تنفری کے ایک مکمل بہاؤ کو یادداشت میں زندہ کر دیتی ہے،

Scanned with CamScanner

یادہ جو گڑھی جاتی ہیں اور جن میں وہ ایک مرکزی سانچا بناتا ہے، اور ہر چیز آسان لگتی ہے، لیکن جونہی اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انھیں باتوں کو دوبارہ بیان کر رہا ہے جو گزاری ہوئی حقیقت میں پیش آچکی ہیں یا کبھی جا چکی ہیں، تو وہ انھیں بدلنا شروع کر دیتا ہے۔

کوسیمو ابھی تک عمر کے اس حصے میں تھا جب کہانیاں سنانے کی خواہش آدمی کو زیادہ جینے کا تمنائی بناتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ ابھی اس نے اتنی زندگی نہیں گزاری کہ کچھ بیان کر سکے۔ اور یوں کوسیمو شکار پر نکل جاتا۔ وہ ہفتوں غائب رہتا اور پھر نیولے، بجو اور لومڑیاں دُموں سے لٹکائے، چوک کے درختوں پر لوٹ آتا اور اومبروسائیوں کو نئی کہانیاں سناتا جو اصلاً سچی ہوتیں مگر اس کے سنانے سے اختراعی بن جاتیں اور اختراعی سے دوبارہ سچی ہو جاتیں۔

لیکن اس کی اس ساری بے چینی کے پیچھے ایک اور گہری ناآسودگی تھی، اور سامعین کی موجودگی کی اس طلب میں ایک مختلف قسم کی کمی مضمر تھی۔ کوسیمو ابھی محبت سے ناآشنا تھا، اور محبت کے بغیر کسی بھی تجربے کی کیا حیثیت ہے؟ جب زندگی کی اصل لذت ہی سے آشنائی نہ ہو تو زندگی کو خطرے میں ڈالنا کون سی عقل مندی ہے؟

دہقان لڑکیاں اور ماہی فروش، اور بگھیوں میں سوار نوجوان خواتین اومبروسا کے چوک سے گزرا کرتی تھیں اور درختوں پر سے کوسیمو انھیں تیکھے انداز سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جس چیز کا وہ متلاشی ہے، وہ ان سب میں موجود ہونے کے باوجود، ان میں سے کسی میں بھی مکمل طور پر کیوں موجود نہیں ہے۔ رات کو جب گھروں میں بتیاں جل جاتیں اور کوسیمو الوؤں کی زرد آنکھوں کے ساتھ شاخوں پر تنہا ہوتا تو وہ محبت کے خواب دیکھنے لگتا۔ جھاڑیوں کے عقب میں یا انگور کی بیلوں کے درمیان راز و نیاز میں محو جوڑوں کو دیکھ کر اس کا دل رشک و تحسین سے بھر آتا، اور جب وہ اندھیرے میں جاتے تو اس کی نظریں ان کا تعاقب کرتیں۔ لیکن اگر وہ اس کے مخصوص درخت کے نیچے ہی لیٹ جاتے تو وہ پریشان ہو کر وہاں سے چلا جاتا۔

پھر وہ اپنے شرمیلے پن پر قابو پانے کے لیے رُک جاتا اور جانوروں کو مباشرت کرتے دیکھنے لگتا۔ بہار کے موسم میں درختوں کی دنیا کتخدائی کی دنیا ہوتی۔ گلہریاں تیکھی چیخوں اور تقریباً انسانوں جیسی

حرکات کے ساتھ ملاپ کرتیں۔ چڑیاں پھڑپھڑاتے پروں کے ساتھ جفتی کرتیں۔ چھپکلیاں بھی، اپنی دموں میں مضبوطی سے گرہیں لگائے، یک تن ہو کر پھسلتیں اور خار پشت اپنی ہم آغوشیوں میں لذت پیدا کرنے کے لیے اپنے کانٹوں کو نرم کرتے ہوئے لگتے۔ اوتیوماسیمو، اس حقیقت سے قطعاً اثر لیے بغیر کہ وہ اومبروسا میں واحد بجو کتا ہے، بڑی گلہ بان کتیوں یا جاسوس کتیوں کو رجھانے کی کوشش کرتا رہتا اور اپنے وجود سے پیدا ہونے والی فطری ہمدردی پر بھروسا کرتے ہوئے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ گرم جوشی کا اظہار کرتا۔ بعض اوقات وہ اپنے سارے بدن پر زخم لیے لوٹتا لیکن ایک کامیاب معاشقہ ساری شکستوں کی تلافی کے لیے بہت تھا۔

اوتیوماسیمو کی طرح کوسیمو بھی ایک نوع کی واحد مثال تھا۔ اپنے جاگتے کے خوابوں میں وہ خود کو انتہائی حسین لڑکیوں سے معاشقہ کرتے دیکھتا۔ لیکن درختوں پر رہتے ہوئے وہ کیسے محبت کر سکتا تھا؟ اپنے خیالوں میں وہ یہ واضح کرنے کا اہتمام کرتا کہ یہ واقعہ کہاں پیش آئے گا، زمین پر یا اوپر اس عنصر میں جہاں وہ اب رہتا تھا؛ ہر مقام سے تہی ایک مقام، وہ تصور کرتا؛ وہ دنیا جہاں اوپر چڑھ کر پہنچا جاتا ہے، نیچے اتر کر نہیں۔ ہاں، یہی تھی وہ جگہ۔ غالباً کوئی درخت اتنا بلند ہوگا جس پر چڑھنے سے وہ ایک اور دنیا میں پہنچ جائے گا، چاند کو چھو لے گا۔

دریں اثنا، چوک میں گپ شپ کرنے کی عادت بڑھنے کے ساتھ ساتھ، وہ اپنے آپ سے غیر مطمئن ہوتا چلا گیا۔ اور پھر، ایک منڈی کے دن، اولیوابا سا کے قریبی شہر سے آنے والے ایک شخص نے پکار کر کہا، "ارے، تو تمھارے پاس بھی اپنا ہسپانوی موجود ہے، میں سمجھا!" پوچھے جانے پر کہ اس کا کیا مطلب ہے، اس نے جواب دیا، "اولیوابا سا میں ہسپانویوں کا ایک پورا قبیلہ درختوں پر رہتا ہے!" کوسیمو جب تک جنگل کے راستے اولیوابا سا کے لیے روانہ نہ ہو گیا، اسے چین نہ پڑا۔

۱۷

اولیوابا سا اندرونِ ملک واقع ایک شہر تھا۔ کوسیمو وہاں دو دن کا سفر، اور راستے کے کم جنگلاتی حصوں پر بہت سے خطرناک ٹکڑے طے کرنے کے بعد پہنچا۔ وہ جب بھی مکانوں کے پاس سے گزرتا تو

لوگوں کی، جنھوں نے اس سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا، حیرت سے چیخیں نکل گئیں، بلکہ دو ایک نے تو اس پر پتھر بھی پھینکے۔ سو، جس قدر بھی ممکن تھا اس نے غیر نمایاں طور پر گزرنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے ہی وہ اولیوا باسا کے نزدیک پہنچا، اس نے محسوس کیا کہ کوئی لکڑ ہارا، ہالی یا زیتون چننے والا، جو کوئی اسے دیکھتا ہے، قطعاً کسی حیرت کا اظہار نہیں کرتا۔ درحقیقت ان لوگوں نے اپنے ہیٹ اتار کر اس کا خیر مقدم کیا جیسے وہ اسے جانتے ہوں۔ بلکہ انھوں نے کچھ لفظ بھی ادا کیے، جو یقیناً مقامی بولی میں نہیں تھے اور ان کے منھ سے ادا ہو کر عجیب سے لگ رہے تھے، جیسے ''سینیور! روز بخیر، سینیور!''

سردیوں کی رُت تھی۔ کچھ پیڑ پتوں سے تہی تھے۔ اولیوا باسا میں چنار اور ایلم کے درختوں کی ایک دوہری قطار شہر کو قطع کر رہی تھی۔ میرے بھائی نے قریب آنے پر دیکھا کہ عریاں شاخوں پر لوگ موجود ہیں۔ ہر درخت پر ایک دو، بلکہ تین افراد بھی موجود ہیں جو سنجیدہ وضع کے ساتھ بیٹھے یا کھڑے ہیں۔ چند جستوں میں وہ ان تک پہنچ گیا۔

وہاں شاندار پوشاکوں، کلغی دار ہنکو نے ہیٹوں اور بڑے بڑے چوغوں میں ملبوس مرد تھے، اور عالی نسب نظر آنے والی خواتین بھی، جن کے سروں سے نقاب لٹک رہے تھے۔ وہ دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں شاخوں پر بیٹھی تھیں۔ کچھ کشیدہ کاری کر رہی تھیں اور گاہے بگاہے سینے کے ایک ترچھے جھٹکے کے ساتھ، یا شاخ کے ساتھ اپنے بازو پھیلاتے ہوئے نیچے سڑک کو دیکھتی جاتی تھیں، گویا کسی کھڑکی کی دہلیز پر ہوں۔

مردوں نے خیر مقدمی کلمات ادا کیے جو غم آگیں اور اک سے پُر لگتے تھے، ''روز بخیر، سینیور!'' اور کوسیمو نے تعظیماً خم ہو کر اپنا ہیٹ اتارا۔

ایک بھاری بھرکم شخص، جو سب سے زیادہ با اختیار لگتا تھا، ایک چنار کے دوشاخے میں یوں پھنسا بیٹھا تھا کہ وہاں سے اپنے کو نکالنے میں ناکام نظر آتا تھا۔ اس کی کلیجی جیسی رنگت میں اس کی منڈی ہوئی ٹھوڑی اور بالائی لب، اس کی سن رسیدگی کے باوجود سیاہ سائے منعکس کر رہے تھے۔ وہ اپنے پڑوسی کی طرف مڑا، جو سیاہ لباس پہنے، دبلا پتلا، زرد رنگ شخص تھا اور خود جس کے رخسار مونڈنے کے باوجود سیاہی مائل تھے اور یہ پوچھتا ہوا معلوم ہوا کہ درختوں پر سے ان کی طرف آتا ہوا یہ نامعلوم شخص کون ہے۔

کوسیمو نے سوچا کہ اپنے کو متعارف کروانے کا لمحہ آن پہنچا ہے۔

وہ فربہ شخص کے چنار پر پہنچا اور خم ہوتے ہوئے بولا، ''بیرن کوسیمو پیوواسکو دی روندو، آپ کی

Scanned with CamScanner

خدمت میں۔"

"روندوس؟" فربہ شخص نے بلند آواز میں کہا۔ "روندوس؟ آراگونیس؟ گالیسیاتو؟"

"نہیں، جناب۔"

"کاتالان؟"

"نہیں جناب۔ میرا تعلق انھیں علاقوں سے ہے۔"

"دیسترادوتامیان؟"

دبلے پتلے شخص نے اب درمیان میں پڑنے کو اپنا فرض سمجھا اور بہت لفاظی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے ترجمانی کرنے لگا، "عالی مرتبت فریدریکو الونسو سانچیز اِی توباسکو دریافت کر رہے ہیں کہ آیا حضور بھی ملک بدر ہیں، کیونکہ ہم جناب کو شاخوں پر چڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔"

"نہیں جناب۔ یا میں کم از کم کسی اور کے حکم سے ملک بدر نہیں۔"

فربہ شخص نے پھر سوال کیا۔

اور ترجمان یوں گویا ہوا، "عالی مرتبت فریدریکو الونسو سانچیز ازراہِ کرم دریافت کر رہے ہیں، آیا حضور لطف اندوزی کی خاطر یہ طریق سفر استعمال کرتے ہیں۔"

کوسیمو نے لمحہ بھر سوچا، پھر بولا، "میں ایسا اس لیے کرتا ہوں کیونکہ میرے خیال میں یہ میرے لیے موزوں ہے، اس لیے نہیں کہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔"

"فیلیز اُستید!" فریدریکو الونسو سانچیز نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "آئے دیمی، آئے دیمی!"

اور سیاہ پوش شخص پہلے سے کہیں زیادہ لفاظی کے ساتھ وضاحت کرنے لگا، "عالی مرتبت یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ حضور خوش نصیب ہیں جو ایسی آزادی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جس کا موازنہ ہم اپنی پابندی سے کرنے پر مجبور ہیں، جسے ہم، بہرحال، راضی بہ رضا ہو کر بھوگ رہے ہیں۔" اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

اور اس طرح شہزادہ سانچیز کے بلیغ اعلانوں اور سیاہ پوش شخص کی مفصل وضاحت سے کوسیمو نے چنار کے درختوں پر آباد اس بستی کی سرگزشت اپنے ذہن میں مرتب کر لی۔ وہ ہسپانوی امرا تھے اور انھوں نے مختلف متنازعہ جاگیردارانہ مراعات کے سلسلے میں شاہ چارلس سوئم کے خلاف بغاوت کی تھی۔

Scanned with CamScanner

نتیجے کے طور پر انھیں اپنے خاندانوں کے ساتھ ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ اولیواباسا پہنچنے پر انھیں اپنا سفر جاری رکھنے سے روک دیا گیا تھا۔ درحقیقت ہز کیتھولک میجسٹی کے ساتھ ایک قدیم معاہدے کے باعث وہ علاقے اسپین سے جلاوطن کردہ افراد کی نہ تو مہمان نوازی کر سکتے تھے اور نہ انھیں آگے جانے کا راستہ دے سکتے تھے۔ یہ امرا خاندانوں ایک نہایت دشوار صورتِ حال سے دوچار تھے۔ لیکن اولیواباسا کے مجسٹریٹ، جو غیر ملکی دیوان ہائے وزارت سے جھگڑا مول لینا نہیں چاہتے تھے اور ان مالدار غیر ملکیوں سے بھی کد نہ رکھتے تھے، ان کے ساتھ ایک مفاہمت پر پہنچ گئے۔ معاہدے میں درج تھا کہ جلاوطن ان کے علاقے میں ''زمین پر پاؤں نہیں دھریں گے۔'' اگر وہ اوپر درختوں پر رہیں تو ہر بات قاعدے کے مطابق ہوگی۔ لہٰذا جلاوطن بلدیہ کی مہیا کردہ سیڑھیوں کے ذریعے، جو بعد میں ہٹالی گئیں، ایلم اور چنار کے درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ معتدل آب و ہوا، چارلس سوم کی طرف سے آنے والے متوقع فرمانِ معافی اور خدا کی رحمت پر بھروسا کرتے ہوئے وہ کچھ مہینوں سے اوپر بسیرا کیے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ہسپانوی طلائی سکوں کی افراط تھی اور وہ خاصی خریداری کیا کرتے تھے اور یوں شہر کو کاروبار دے رہے تھے۔ قابوں کو اوپر کھینچنے کے لیے انھوں نے چرخیوں کا ایک نظام بنا رکھا تھا۔ دوسرے درختوں پر انھوں نے سائبان تان رکھے تھے جن کے نیچے وہ سوتے تھے۔ حقیقت میں وہ بڑے آرام سے رہنے لگے تھے، یا یہ کہ اولیواباسا کے لوگوں نے انھیں اچھی طرح بسایا تھا، کہ یہ بات ان کے اپنے فائدے میں تھی۔ جہاں تک جلاوطنوں کا تعلق ہے، وہ سارا دن انگلی بھی نہیں ہلاتے تھے۔

کوسیمو کے لیے درختوں پر رہنے والے دوسرے انسانوں سے ملنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ سو وہ عملی سوالات پوچھنے لگا۔

''اور برسات میں آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟''

''ہم اپنا سارا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، سینیور۔''

ترجمان جس کا نام فادر سلپیسیو دی گواداِلیتے تھا، سوسائٹی آف جیزس سے وابستہ ایک راہب تھا جو اسپین میں اپنے سلسلے کے ممنوع قرار دیے جانے کے باعث جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ اس نے وضاحت کی، ''اپنے سائبانوں میں محفوظ ہو کر ہم خدا سے لَو لگاتے ہیں اور اس تھوڑے بہت کے لیے جو ہمارے لیے کافی ہے اس کا شکر بجالاتے ہیں۔''

''آپ لوگ کبھی شکار بھی کرتے ہیں؟''

''گاہے بہ گاہے، سینیور، گوند کے ساتھ۔''

''بعض اوقات تفریح کے لیے، ہم میں سے کوئی ایک کسی شاخ کو گوند سے لتھیڑ دیتا ہے۔''

کوسیمو یہ معلوم کرنے سے تھک ہی نہیں رہا تھا کہ انھوں نے وہ مسائل جن سے خود اس کا سابقہ پڑ چکا تھا، کیونکر حل کیے ہیں۔

''اور دھونے کے بارے میں آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟''

دون فریدریکو نے کندھے اچکاتے ہوئے ہسپانوی میں کچھ کہا۔

''ہم کپڑے گاؤں کی دھوبن کو دیتے ہیں،'' دون سلپیسیو نے ترجمہ کیا۔ ''ہر پیر کو ہم میلے کپڑوں کی ٹوکری نیچے گرا دیتے ہیں۔''

''نہیں، میرا مطلب منھ دھونے اور نہانے سے تھا۔''

دون فریدریکو نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے کندھے اچکائے جیسے اس مسئلے سے اس کا سابقہ کبھی نہ پڑا ہو۔

فادر سلپیسیو نے اس عمل کی وضاحت کو اپنا فرض سمجھا، ''عالی مرتبت کی رائے کے مطابق یہ ہر شخص کا نجی معاملہ ہے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں، مگر آپ لوگ حوائجِ ضروریہ سے کہاں فارغ ہوتے ہیں؟''

''اولاس، سینیور۔''

دون سلپیشیو اپنے پُر انکسار لہجے میں بولا، ''درحقیقت، ہم کچھ مرتبان استعمال کرتے ہیں۔''

دون فریدریکو سے رخصت لیتے ہوئے کوسیمو فادر سلپیسیو کی رہنمائی میں بستی کے دوسرے اراکین سے ملنے ان کے اقامتی درختوں پر گیا۔ ان حالات میں بھی جواب تک غیر آرام دہ تھے، یہ تمام حضرات و خواتین اپنے معمول کے اطوار اور دل جمعی کی وضع برقرار رکھے ہوئے تھے۔ کچھ لوگوں نے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے کے لیے شاخوں پر گھوڑوں کی زینیں باندھ رکھی تھیں۔ اس بات نے کوسیمو کو، جس نے ان تمام برسوں میں ایسے نظام کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا، بہت متاثر کیا۔ (اس نے فوراً دیکھ لیا کہ رکابیں پاؤں لٹکائے رکھنے کی بے آرامی کو جو تھوڑی دیر بعد پیروں کو سن کر دیتی ہے، موقوف کر دیتی ہیں۔) ان

Scanned with CamScanner

میں سے کچھ لوگ (جن میں ایک کا عہدہ امیر البحر کا تھا) بحری دور بینوں سے، جنھیں وہ بے کاری یا گپ شپ میں ایک درخت سے دوسرے درخت پر غالباً محض ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے، نشانہ سادھ رہے تھے۔ خواتین، نوجوان، عمر رسیدہ، سب کی سب، اپنے کاڑھے ہوئے گدوں پر بیٹھی سلائی کر رہی تھیں (صرف وہی کچھ کرتی نظر آ رہی تھیں) یا بڑی بڑی بلیوں کو سہلا رہی تھیں۔ کچھ آزاد کبوتروں کے سوا، جو آ کر کسی لڑکی کے ہاتھ پر بیٹھ جاتے اور اشتیاق سے سہلائے جاتے، ان درختوں پر بلیوں اور مقید پرندوں کی، جو غالباً گوند کا شکار ہوئے تھے، ایک بہت بڑی تعداد تھی۔

اس شجری کمرۂ نشست میں کو سیمو کا سنجیدہ مہمان نوازی سے استقبال کیا گیا۔ انھوں نے اسے کافی پیش کی۔ پھر فوراً ان محلات کی، جو وہ اشبیلیہ یا غرناطہ میں چھوڑ آئے تھے، اور اپنی جائیداد اور غلہ گھروں اور اصطبلوں کی باتیں چھیڑ دیں، اور اپنی بحالی پر اسے وہاں آنے کی دعوت دی۔ بادشاہ کے بارے میں، جس نے انھیں دیس نکالا دیا تھا، وہ ایسے لہجے میں بات کر رہے تھے جو بیک وقت متعصبانہ نفرت اور پر خلوص تعظیم سے مملو تھا۔ اور بعض اوقات تو وہ اس شخص کو جس سے ان کا ایک خاندانی تنازعہ تھا، اور شاہی لقب کو، جس کی حاکمیت سے خود ان کی حاکمیت وابستہ تھی، واضح طور پر الگ کر سکنے کے اہل تھے۔ بعض اوقات، اس کے برعکس، وہ ان دونوں نقطۂ ہائے نظر کو ایک واحد ہیجانی جملے میں اکٹھا کر دیتے اور کو سیمو، ہر بار جب گفتگو میں شہنشاہ کا ذکر آتا، سمجھ نہیں پاتا تھا کہ کس بات کو درست جانے۔

جلاوطنوں کے تمام اشاروں اور باتوں پر ماتم و ملال کا ایک ایسا پرتو تھا جو کچھ تو ان کی فطرت سے مطابقت رکھتا تھا اور کچھ شعوری عزم سے، جیسا کہ بعض اوقات ناپختہ و مبہم یقین کے ساتھ کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کمی کو ایک متاثر کن برتاؤ کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

لڑکیوں میں، جو سب کی سب کو سیمو کو پہلی نظر میں قدرے جھبری اور زرد لگیں، شادمانی کا ایسا عنصر مرتعش تھا جس پر ہمیشہ بروقت قابو پا لیا جاتا تھا۔ دو لڑکیاں ایک درخت سے دوسرے درخت کے درمیان شٹل کاک سے کھیل رہی تھیں۔ ان کی ٹک ٹک جاری تھی کہ اچانک ایک چیخ ابھری۔ شٹل کاک سڑک پر گر گئی تھی۔ اولیوابا سا کے ایک بھکاری نے اسے اٹھایا اور دو پیسیتا کی اجرت کے عوض واپس پھینک دیا۔

آخری درخت پر جو ایلم کا تھا، ال کوندی نامی ایک بوڑھا شخص تھا۔ اس کا لباس پھٹا پرانا اور سر وِگ سے تہی تھا۔ فادر سلپیسیو نے نزدیک پہنچنے پر اپنی آواز دھیمی کر لی اور کوسیمو نے بھی خود کو اس کی تقلید کرتے پایا۔ ال کوندی بار بار ایک شاخ کو اپنے بازو سے ہٹا کر پہاڑی کے نشیب اور دور فاصلے میں مدغم ہوتے ہوئے سبز و طلائی رنگ سے بھرے ایک میدان کو دیکھ رہا تھا۔

سلپیسیو نے سرگوشیوں میں کوسیمو کو شاہ چارلس کے قید خانوں میں اس کے بیٹے کی قید اور ایذا رسانی کا قصہ سنایا۔ کوسیمو نے محسوس کیا کہ طبقۂ خواص کے وہ تمام لوگ ایک طرح سے جلاوطنی کی اداکاری کر رہے ہیں اور انھیں یہ بات بار بار یاد کرنی اور اپنے آپ کو بتانی پڑ رہی ہے کہ وہ وہاں کیوں ہیں، مگر یہ بوڑھا شخص وہ فردِ واحد تھا جو حقیقتاً دکھ اٹھا رہا تھا۔ شاخ کو حرکت دینے کا یہ عمل، گویا کہ اسے کسی اور زمین کے نمودار ہونے کا انتظار ہو، یہ ہلکورے لیتے ہوئے فاصلے میں اپنی نظروں کا دور دور تک گاڑنا، گویا کہ افق کو کبھی نہ دیکھ پانے کی امید ہو مگر دور بہت دور، شاید کسی مقام کو دیکھ لینے کی آس ہو — جلاوطنی کی یہ پہلی حقیقی علامت تھی جو کوسیمو کو نظر آئی۔ اور وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ طبقۂ خواص کے دیگر لوگوں کے لیے اپنے آپ کو یکجا رکھنے اور ایک مقصد عطا کرنے والی واحد شے کے طور پر ال کوندی کی موجودگی کس قدر اہم ہے۔ وہ جو غالباً ان سب سے غریب اور بلاشبہ وطن میں سب سے کم اہم تھا، انھیں یاد دلاتا تھا کہ انھیں دراصل کیا دکھ اٹھانا اور کیا کچھ کرنا چاہیے۔

ان ملاقاتوں سے واپس آتے ہوئے کوسیمو نے ایک بید کے درخت پر ایک لڑکی کو دیکھا جسے اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ چند جستوں میں وہ اس کے پاس جا پہنچا۔

وہ ہلکے نیلے رنگ کی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی تھی اور اس کی جلد سے مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ وہ ایک بالٹی تھامے ہوئے تھی۔

''میں جب سب سے مل رہا تھا تو میں نے تمھیں نہیں دیکھا؟''

''میں کنویں سے پانی نکال رہی تھی۔'' وہ مسکرائی۔ بالٹی سے، جو قدرے ترچھی تھی، پانی چھلک رہا تھا۔ اسے سیدھا رکھنے میں اس نے لڑکی کی مدد کی۔

''سو تم درختوں سے نیچے اترتی ہو؟''

''نہیں۔ چیری کا ایک پرانا خمیدہ درخت ہے جس کی شاخیں ایک آنگن کی دیوار پر جھکی ہوئی

ہیں۔ وہاں سے ہم بالٹیاں نیچے اتارتے ہیں۔ آؤ۔''

وہ ایک شاخ کے ساتھ ساتھ گئے اور دیوار پر چڑھ گئے۔ وہ رہنما کے طور چیری کے درخت پر پہلے گئی۔ نیچے کنواں تھا۔

''دیکھا تم نے، بیرن؟''

''تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ میں بیرن ہوں؟''

''میں سب کچھ جانتی ہوں۔'' وہ مسکرائی۔

''تمھارے آنے کے بارے میں میری بہنوں نے مجھے فوراً بتا دیا تھا۔''

''ان لڑکیوں نے جو شٹل کاک سے کھیل رہی تھیں؟''

''ہاں، آئرینا اور رائمنڈ ا۔''

''دون فریدریکو کی بیٹیاں؟''

''ہاں۔''

''اور تمھارا کیا نام ہے؟''

''اُرسلا۔''

''درختوں پر سفر کرنے میں تم یہاں ہر ایک سے زیادہ ماہر ہو۔''

''میں بچپن ہی سے درختوں پر چڑھتی رہی ہوں۔ غرناطہ میں ہمارے ہاں بہت بڑے بڑے درخت تھے۔''

''وہ گلاب توڑ سکتی ہو؟'' ایک درخت کی چوٹی پر ایک بے قاعدہ گلاب کھلا تھا۔

''افسوس، نہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تمھارے لیے توڑ لاتا ہوں۔'' وہ گیا اور گلاب کے ساتھ لوٹا۔

ارسلا مسکرائی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے۔

''میں اسے خود لگانا چاہتا ہوں۔ بتاؤ کہاں لگاؤں؟''

''میرے بالوں میں لگا دو، شکریہ۔'' اور اس نے کوسیمو کے ہاتھوں کی رہنمائی کی۔

''اب مجھے بتاؤ،'' کوسیمو نے پوچھا، ''کیا تم اس اخروٹ کے درخت تک پہنچ سکتی ہو؟''

Scanned with CamScanner

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ ہنس پڑی۔ ''میں چڑیا نہیں ہوں۔''

''ٹھہرو۔'' کوسیمو نے ایک رسّی کا سرا اس تک پھینکا۔ اگر تم اپنے آپ کو اس رسّی سے باندھ لو تو میں تمھیں اوپر اٹھا لوں گا۔''

''نہیں... مجھے ڈر لگتا ہے...'' لیکن وہ ہنس رہی تھی۔

''یہ میرا طریقہ ہے۔ میں برسوں سے اس طرح سفر کر رہا ہوں، اور سب کچھ اپنے آپ ہی کرتا ہوں۔''

''ماما مِیا!''

اس نے لڑکی کو اوپر پہنچایا۔ پھر وہ خود آیا۔ وہ اخروٹ کا ایک نوعمر درخت تھا جو ذرا بھی بڑا نہ تھا۔ وہ دونوں بہت قریب تھے۔ ارسلا ابھی تک ہانپ رہی تھی اور اپنی پرواز سے سرخ ہو رہی تھی۔

''ڈر گئی ہو؟''

''نہیں۔'' مگر اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

''تم نے گلاب کو گرنے نہیں دیا۔'' اس نے پھول کو ٹھیک کرنے کے لیے اسے چھوا۔

اس طرح درخت پر قریب ہونے کی وجہ سے ان کے بازو ہمہ وقت ایک دوسرے کے گرد تھے۔

''اوہ!'' وہ بولی اور پھر انھوں نے — کوسیمو نے پہل کی — ایک دوسرے کو چوما۔

اس طرح ان کی محبت کا آغاز ہوا۔ لڑکا شاداں و حیراں تھا۔ لڑکی خوش تھی مگر حیران ذرا بھی نہ تھی (لڑکیوں کے لیے کوئی بات بھی اتفاقی نہیں ہوتی)۔ اس محبت کا، جو اَب ناقابلِ توجیہہ طور سے آ پہنچی تھی، کوسیمو کو مدت سے انتظار تھا۔ اور یہ اس قدر خوبصورت تھی کہ اس کی خوبصورتی کے بارے میں، اس نے پہلے کیا سوچا تھا اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور اس کے لیے سب سے نئی بات اس کی حد درجہ سادگی تھی۔ اس لمحے کوسیمو نے سوچا کہ یہ سدا ایسی ہی رہے گی۔

۱۸

آڑو، بادام اور چیری کے درخت بہار پر تھے۔ کوسیمو اور ارسلا اپنے دن درختوں پر اکٹھے گزار رہے تھے۔ بہار نے ارسلا کے رشتے داروں کی ماتمی قربت کو بھی شادمانی کا رنگ بخش دیا تھا۔

Scanned with CamScanner

میرے بھائی نے جلد ہی جلاوطنوں کی آبادی میں خود کو کار آمد بنالیا۔ اس نے ایک سے دوسرے درخت پر جانے کے انھیں کئی طریقے سکھائے اور ہسپانوی نوابوں کو اپنا دائمی سکون ذرا دیر کے لیے چھوڑنے اور تھوڑی بہت حرکت کی مشق کرنے پر آمادہ کیا۔ اس نے درختوں کے درمیان رسیوں کے کئی پل بھی بنائے جن کی بدولت معمر جلاوطن ایک دوسرے کے پاس آنے جانے لگے۔ اور یوں تقریباً ایک سال کے دوران، جو اس نے ہسپانویوں کے ساتھ گزارا، کوسیمو نے آبادی کو بہت سی اختراعات سے شناسا کیا۔ ان میں پانی ذخیرہ کرنے کی جگہیں، تنور اور سونے کے لیے سمور کے تھیلے شامل تھے، اور یہ سب اس کی اپنی ایجادیں تھیں۔ ہر چند کہ وہ اس کے پسندیدہ مصنفوں کی آرا سے کسی طور بھی متفق نہیں تھے، مگر نئی ایجادات کے لیے اس کا شوق اسے ان جلاوطن لوگوں کی مدد کرنے پر اکساتا تھا۔ اس طرح، ان پاکباز لوگوں کی روزانہ اعتراف کرنے کی خواہش کو دیکھتے ہوے، اس نے ایک درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے ایک اعتراف گاہ بنائی جس میں داخل ہو کر دبلا پتلا دون سلپیسیو ایک چھوٹی سی پردے والی جالی میں سے ان کے گناہوں کو سن سکتا تھا۔

درحقیقت، تکنیکی جدت پسندی کے لیے اس کا خالص شوق اسے تسلیم شدہ ہیئتوں کو خراج پیش کرنے سے بچانے کے لیے ناکافی تھا۔ اسے تصورات درکار تھے۔ کوسیمو نے کتب فروش اوربیچی کو لکھا کہ اس دوران جو نئی کتابیں آئی ہوں اومبروسا سے اولیوابا سا آنے والی ڈاک کے ذریعے بھیج دے۔ اس طرح وہ ارسلا کو *Paul et Virginie* اور *La Nouvelle Heloise* پڑھ کر سنا پایا۔

جلاوطن اکثر ایک بڑے بلوط پر اپنے اجلاس منعقد کرتے تھے۔ ان پارلیمانوں میں وہ اپنے فرمانروا کو لکھے جانے والے خطوط کے مسودے تیار کرتے تھے۔ شروع شروع میں ان خطوط کا لہجہ برہمی، احتجاج اور دھمکی، بلکہ آخری انتباہ کا ہوتا تھا، مگر رفتہ رفتہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ایسی ترتیبِ الفاظ تجویز کر دیتا جو زیادہ نرم و باادب ہوتی۔ انجام کار انھوں نے ایک ایسی درخواست کا مسودہ تیار کر لیا جس میں وہ اپنے آپ کو مودبانہ طور پر بادشاہ کے قدموں پر جھکا کر معافی کے خواستگار ہوے۔

تب ال کوندی کھڑا ہوا۔ سب لوگ خاموش تھے۔ ال کوندی نے اوپر دیکھتے ہوے ایک مدھم مرتعش آواز میں بولنا شروع کیا اور وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس کے دل میں تھا۔ جب اس نے دوبارہ اپنی نشست سنبھالی تو دوسرے سنجیدہ اور گنگ تھے۔ کسی نے درخواست کے بارے میں مزید بات نہیں کی۔

Scanned with CamScanner

اس وقت کوسیمو آبادی کا ایک فرد بن چکا تھا اور مباحث میں حصہ لینے لگا تھا۔ وہ ان بحثوں میں فلسفیوں کے خیالات اور فرمانرواؤں کی غلط کاریاں جوانی کے بے تصنع جوش کے ساتھ واضح کرتا، اور بتاتا کہ ریاستیں انصاف و معقولیت سے کیسے چلائی جاسکتی ہیں۔ مگر وہاں اس کی بات سننے والے گنتی کے چند لوگوں میں ال کوندی تھا، جو بوڑھا ہونے کے باوجود سمجھنے اور عمل کرنے کے نئے طریقوں کی تلاش میں رہتا تھا، یا اُرسلا تھی جس نے چند کتابیں پڑھ رکھی تھیں، یا دو ایک دوسری لڑکیاں جو دوسروں کی نسبت زیادہ باشعور تھیں۔ آبادی کے باقی تمام لوگوں کے سر گویا جوتوں کے چرمی تلوں کے مانند تھے جن میں صرف کیلیں ہی ٹھونکی جاسکتی تھیں۔

درحقیقت، اب ال کوندی کو ارضی منظر پر مسلسل غور و فکر میں اپنا وقت صرف کرنے کے بجائے کتابیں پڑھنے کی طلب ہونے لگی۔ روسو کو وہ قدرے اکھڑ خیال کرتا تھا مگر مونٹیسکیو (Montesquieu) کو پسند کرتا تھا؛ یہ پہلا قدم تھا۔ طبقۂ خواص کے دیگر لوگ کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ تاہم ان میں سے دو ایک فادر سلپیسیو سے رازدارانہ درخواست کرتے کہ وہ کوسیمو سے کہہ کر انھیں ***La Puelzella*** نامی کتاب دلوائے تاکہ وہ اس کے ناشائستہ حصے پڑھ سکیں۔ یوں، کوسیمو کے نئے خیالات پر ال کوندی کے غور و فکر کی وجہ سے، بلوط کے درخت پر ہونے والی نشستوں نے ایک نیا موڑ لیا، یہاں تک کہ اسپین جا کر انقلاب برپا کرنے کی بات بھی کی گئی۔

پہلے پہل فادر سلپیسیو نے خطرے کا احساس نہیں کیا۔ وہ خود زیادہ باریک بین آدمی نہیں تھا اور اپنے سربراہوں کے نظامِ مراتب سے الگ ہونے کے باعث اس بات سے بے خبر تھا کہ ان دنوں لوگوں کے ذہنوں کو کس طرح مسموم کیا جارہا تھا۔ لیکن جونہی وہ نئے سرے سے اپنے خیالات کو ترتیب دینے کے قابل ہوا (یا جونہی — دوسروں کا کہنا تھا — اسے بشپ کی مہر لگے کئی خط ملے) اس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ شیطان ان کی آبادی میں در آیا ہے اور یہ کہ ان پر بجلیاں ٹوٹیں گی جو درختوں کو ان پر موجود ہر کسی سمیت جلا ڈالیں گی۔

ایک رات کو کراہنے کی آواز سے کوسیمو کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لالٹین لے کر اس طرف بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ ال کوندی اپنے بلوط پر تنے سے بندھا ہوا ہے اور یسوعی فادر سلپیسیو گانٹھیں کس رہا ہے۔

"ٹھہریے، فادر! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

Scanned with CamScanner

''مقدس عدالتِ احتساب کا بازو، بیٹا! اب یہ اس بدنصیب بوڑھے پر ہے کہ اپنے کفر کا اعتراف کرلے اور شیطان پر لعنت بھیج دے۔ پھر تمھاری باری آئے گی۔''

کوسیمو نے اپنی تلوار نکالی اور رسیاں کاٹ دیں۔ ''خبردار، فادر! ایسے ہتھیار بھی ہیں جو معقولیت اور انصاف کی خدمت کرتے ہیں!''

یسوعی پادری نے اپنے چوغے سے ایک برہنہ تلوار نکال لی۔ ''روندو کے سردار، کچھ وقت سے تمھارے خاندان کو میرے فرقے کا حساب چکانا ہے!''

''میرا ضعیف باپ ٹھیک کہتا تھا،'' تلواروں کی جھنکار میں کوسیمو نے اعلان کیا۔ ''یسوعیوں کی انجمن معاف نہیں کرتی!''

وہ درختوں پر ڈگمگاتے ہوئے لڑ رہے تھے۔ دون سلپیسیو بہت عمدہ شمشیر زن تھا اور اکثر موقعوں پر میرا بھائی خود کو مشکل میں گھرا محسوس کر رہا تھا۔ وہ مقابلے کے تیسرے دور میں تھے کہ ال کونڈی نے اپنے کو سنبھالا اور لوگوں کو آوازیں دینے لگا۔ دوسرے جلاوطن جاگ گئے۔ وہ تیزی سے اس جگہ پہنچے اور بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ سلپیسیو نے اپنی تلوار فوراً رکھ دی اور، گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو، جلدی جلدی سب کو خاموش کرانے لگا۔

کسی اور آبادی میں ایسے سنگین واقعے کو دبا دینا ممکن نہ ہوتا، مگر اپنی سوچوں کو کم سے کم رکھنے کی خواہش کی بدولت، اس آبادی میں ممکن تھا۔ لہٰذا دون فریدریکو نے اپنی خدمات پیش کیں اور دون سلپیسیو اور ال کونڈی میں ایک طرح کی مصالحت کروادی گئی اور ہر چیز ویسی ہی ہوگئی جیسے پہلے تھی۔

یقیناً کوسیمو کو محتاط ہونا پڑا۔ جب وہ اُرسلا کے ساتھ درختوں پر جاتا تو اسے یسوعی کی طرف سے اپنی جاسوسی کا مستقل خطرہ رہتا۔ وہ جانتا تھا کہ دون فریدریکو ان کے مراسم سے فکر مند ہے، کیونکہ اب لڑکی کو اس کے ساتھ باہر جانے سے روک دیا گیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ رئیس خاندان ایک بہت سخت اخلاقی ضابطے کے پابند تھے مگر اب وہ عالم جلاوطنی میں درختوں پر تھے اور ایسی باتوں کے بارے میں زیادہ فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ کوسیمو انھیں ایک اچھا نوجوان نظر آتا تھا اور اس کے پاس ایک خطاب بھی تھا۔ پھر وہ دوسروں کے کام آنا بھی جانتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ اپنی مرضی سے ٹھہرا ہوا تھا۔ اب اگر کوسیمو اور ارسلا کے درمیان کوئی لطیف جذبہ تھا اور وہ ان دونوں کو اکثر درختوں میں پھل پھول کے لیے جاتے

دیکھتے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتے تا کہ اعتراض کی کوئی بات ہی نظر نہ آئے۔

تاہم اب دون سلپیسیو کے دباؤ کی وجہ سے، دون فریدریکو کچھ نہ جاننے کا بہانہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کوسیمو کو اپنے درخت پر طلب کیا۔ اس کے پہلو میں سلپیسیو کا طویل سیاہ سراپا تھا۔

''بیرن، مجھے بتایا گیا ہے کہ تم میری بیٹی کے ساتھ اکثر گھومتے دیکھے جاتے ہو۔''

''عالی مرتبت، وہ مجھے آپ لوگوں کی زبان بولنا سکھا رہی ہے۔''

''تمھاری عمر کتنی ہے؟''

''تقریباً انیس سال۔''

''نوجوان، بہت چھوٹے ہو! میری بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے۔ تم اس کے ساتھ کیوں گھومتے ہو؟''

''ارسلا سترہ سال کی ہے۔''

''کیا تم ابھی سے اپنی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''کس کے بارے میں؟''

نوجوان، میری بیٹی تمھیں ٹھیک سے ہسپانوی نہیں پڑھاتی۔ میرا مطلب تھا، کیا تم اپنے لیے دلہن منتخب کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟ گھر بنانے کا ارادہ ہے؟''

سلپیسیو اور کوسیمو دونوں نے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔ گفتگو ایک ایسا موڑ لے رہی تھی جس کی خواہش یسوعی کو بالکل نہ تھی، اور میرے بھائی کو اس سے بھی کم۔

''میرا گھر...'' کوسیمو نے بلندترین شاخوں اور بادلوں کی جانب ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''میرا گھر ہر کہیں ہے، ہر کہیں جہاں میں چڑھ سکتا ہوں، اوپر کی جانب...''

پرنس فریدریکو الونسو نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''بیرن، اگر ہماری وطن واپسی پر تم غرناطہ آنے کی تکلیف کرو تو سیئرا کی شاداب ترین جاگیر دیکھو گے، یہاں سے کہیں بہتر۔''

اب دون سلپیسیو خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''لیکن عالی مرتبت، یہ نوجوان والتیئر کا پیرو ہے... اسے آپ کی بیٹی کے ساتھ ہرگز نہیں گھومنا چاہیے...''

''ارے، ابھی چھوٹا ہے۔ اس کی شادی ہو جانے دو، خیالات بدل جائیں گے۔ تم ضرور

غرناطہ آنا۔"

"آپ کا بہت شکریہ... میں اس بارے میں سوچوں گا..." اور کوسیمو اپنے ہاتھوں میں بلی کے سمور والی ٹوپی کو گھماتے ہوے، بہت سی کورنشوں کے بعد رخصت ہو گیا۔

جب وہ دوبارہ ارسلا سے ملا تو بہت گہری سوچ میں تھا۔ "جانتی ہو، ارسلا، تمھارے والد نے مجھ سے تمھارے بارے میں بات کی ہے... انھوں نے کئی موضوع چھیڑے..."

ارسلا چوکنّی ہو گئی۔ "تمھارا مطلب ہے وہ نہیں چاہتے کہ ہم ایک دوسرے سے ملا کریں؟"

"نہیں یہ بات نہیں... وہ چاہتے ہیں کہ جب تم لوگوں کی جلاوطنی ختم ہو تو میں تمھارے ساتھ غرناطہ چلا چلوں..."

"خدایا، ہاں! کیا عمدہ بات ہے!"

"لیکن، جانتی ہو، حالانکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، میں ہمیشہ درختوں پر رہا ہوں اور میں درختوں پر ہی رہنا چاہتا ہوں..."

"ارے، کوسیمو، ہمارے ہاں بھی خوبصورت درخت ہیں..."

"ہاں، لیکن اس دوران مجھے سفر کے لیے نیچے زمین پر آنا پڑے گا اور ایک دفعہ نیچے آیا..."

"ابھی فکر نہ کرو، کوسیمو، فی الوقت ہم بہرحال جلاوطن ہیں اور ہو سکتا ہے کہ باقی ماندہ زندگی بھی یونہی رہیں۔"

اور میرے بھائی نے اس بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔

لیکن ارسلا کا اندازہ غلط تھا۔ بعدازاں جلد ہی دون فریدریکو کو ایک خط ملا جس پر شاہی مہر ثبت تھی۔ تقدس مآب کی رحم دلانہ نرمی سے ان پر عائد پابندی منسوخ کر دی گئی تھی۔ رئیس جلاوطن اپنے گھروں اور اپنی جاگیروں کو لوٹ سکتے تھے۔ درختوں میں ایک دم ہلچل مچ گئی۔ "ہم واپس جا رہے ہیں! ہم واپس جا رہے ہیں! مادرید! کادریز! اشبیلیہ!"

جلد ہی یہ خبر شہر میں پھیل گئی۔ اولیوا باسا کے باشندے سیڑھیاں لے آئے۔ کچھ جلاوطن نعرہ ہاے تحسین کے درمیان نیچے آ گئے، دوسرے اپنا سامان اکٹھا کرنے کو رک گئے۔

"لیکن قصہ ابھی ختم نہیں ہوا!" ال کوندی بار بار کہے جا رہا تھا۔ "کورتیس کو اس کا پتا چلے گا، اور

بادشاہ کو!'' لیکن چونکہ جلاوطنی کے کسی ساتھی کو اس لمحے اس سے اتفاق کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، اور خواتین پہلے ہی اپنے پرانے فیشن کے ملبوسات کو نئی پوشاکوں سے بدلنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں، اس نے اپنی تقریر کا رخ اولیوا باسا کی آبادی کی طرف موڑ دیا۔ ''اب ہم اسپین جا رہے ہیں، اور پھر تم لوگ دیکھنا! ہم وہاں اپنا حساب چکائیں گے۔ میں اور یہ نوجوان انصاف پائیں گے!'' اور اس نے کوسیمو کی طرف اشارہ کیا۔ کوسیمو پریشان ہو کر اختلاف ظاہر کرنے کے اشارے کرنے لگا۔

دون فریدریکو بہت سے لوگوں کے سہارے زمین پر اتر آیا تھا۔ ''نیچے آؤ نوجوان!'' اس نے چلا کر کوسیمو سے کہا۔ ''نیچے آؤ بہادر نوجوان! ہمارے ساتھ غرناطہ چلو!''

کوسیمو ہلنے سے متذبذب، ایک شاخ پر دبکی لگائے بیٹھا تھا۔

پرنس نے بات جاری رکھی، ''کیوں نہیں؟ میں تمھیں اپنے بیٹوں کی طرح رکھوں گا!''

''جلاوطنی ختم ہو چکی ہے،'' ال کوندی نے کہا۔ ''ہم نے اتنے طویل عرصے جو سوچ بچار کیا ہے، اب اسے روبہ عمل لا سکتے ہیں۔ اب درختوں پر ٹھہرے رہنے سے کیا فائدہ، بیرن؟ اب کوئی وجہ نہیں ہے۔''

کوسیمو نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ ''میں یہاں آپ لوگوں سے پہلے آیا تھا عالی مرتبت اور آپ کے بعد بھی یہیں ٹھہروں گا!''

''تم پسپائی اختیار کرنا چاہتے ہو!'' ال کوندی چلایا۔

''نہیں، میں مزاحمت کرنا چاہتا ہوں،'' بیرن نے جواب دیا۔

ارسلا جو نیچے جانے والے اوّلیں لوگوں میں تھی اور اپنی بہنوں کے ساتھ ایک گاڑی میں سامان بھر رہی تھی، درخت کی جانب دوڑی۔ ''پھر میں تمھارے ساتھ رہوں گی! میں تمھارے ساتھ رہوں گی!'' وہ سیڑھی پر چڑھنے لگی۔

اوروں میں سے چار پانچ نے اسے روکا، بلکہ کھینچ کر الگ کیا، اور درختوں سے سیڑھیاں ہٹا دیں۔

''الوداع، ارسلا، خوش رہو!'' اسے زبردستی گاڑی تک لے جائے جاتے دیکھ کر، جو بعدازاں روانہ ہو گئی، کوسیمو نے کہا۔

ایک خوشی کی بھونک سنائی دی۔ بجو کتا، اوتیمو ماسیمو، جو اس تمام وقت جب اس کا مالک اولیوا باسا میں تھا، ناخوشی سے غراتا رہا تھا، آخر کار دوبارہ خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ مذاق میں ان چھوٹی بلیوں کے

پیچھے دوڑ رہا تھا جو پیچھے چھوڑ دی گئی تھیں اور درختوں پر رہ گئی تھیں۔ اور وہ اپنی گردن کے بال پھیلا کر اس پر سسیا رہی تھیں۔

جلاوطن رخصت ہو گئے، کچھ گھوڑوں پر، کچھ گاڑی میں۔ سڑک صاف ہو گئی۔ میرے بھائی کے سوا اولیوا باسا کے درختوں پر کوئی باقی نہ رہا۔ یہاں وہاں شاخوں میں اٹکا کوئی پَر یا ربن یا ہوا میں پھڑ پھڑاتا لیس کا ٹکڑا رہ گیا، یا ایک دستانہ، ایک جھالردار چھتری، ایک پنکھا، ایک مہمیز دار جوتا۔

۱۹

پورے چاندوں، ٹراتے مینڈکوں اور چہچہاتی چڑیوں سے بھری گرمیوں کی رُت تھی کہ بیرن ایک بار پھر اومبروسا میں نظر آیا۔ شاخ در شاخ زقند بھرتا ہوا، چیں بر جبیں، متجسس اور متذبذب، وہ بھی کسی پرندے کی طرح بے چین لگتا تھا۔

جلد ہی یہ افواہیں گشت کرنے لگیں کہ وادی کی پرلی طرف کوئی سچینا نامی لڑکی اس کی داشتہ ہے۔ وہ لڑکی ایک الگ تھلگ مکان میں اپنی بہری خالہ کے ساتھ رہتی تو یقیناً تھی اور ایک زیتون کی شاخ بھی اس کی کھڑکی کے قریب سے گزرتی تھی۔ چوک میں نکمے یہ بحث کیا کرتے تھے کہ وہ داشتہ ہے یا نہیں۔

''میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے۔ وہ کھڑکی کی دہلیز پر تھی اور کوسیمو شاخ پر۔ وہ چمگادڑ کی طرح اپنے بازو پھڑ پھڑا رہا تھا اور وہ ہنسی سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔''

''بعد میں وہ چھلانگ لگا کر اندر آ جاتا ہے!''

''بکواس! اس نے زندگی بھر درختوں سے نہ اترنے کی قسم کھائی ہے۔''

''اس نے اصول بنایا ہے تو مستثنیات کی گنجائش بھی نکال سکتا ہے...''

''ہوں، اگر ہم مستثنیات کی بات کر رہے ہیں...''

''نہیں نہیں، لڑکی خود کھڑکی سے چھلانگ لگا کر زیتون پر جاتی ہے!''

''تو پھر وہ کس طرح...؟ وہ لازماً بڑی بے آرامی میں ہوتے ہوں گے...''

''میں تو کہتا ہوں انھوں نے کبھی ایک دوسرے کو چھوا بھی نہیں ہے۔ ہاں وہ اسے رجھاتا ہے، یا ہو سکتا ہے کہ وہ اسے اکسا رہی ہو۔ لیکن وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا...''

Scanned with CamScanner

ہاں، نہیں، کوسیمو، بچینا، دہلیز، چھلانگ، شاخ... یہ بحثیں بے اَنت لگتی تھیں۔ اب اگر منگیترین یا بیویاں کسی درخت کی طرف نظر بھی اٹھاتیں تو ان سے منسوب شدہ نوجوان اور شوہر فوراً اپنا ردِعمل ظاہر کرتے۔ جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو وہ آپس میں ملتے ہی چہ میگوئیاں شروع کر دیتیں۔ وہ کیا باتیں کرتی تھیں؟ ظاہر ہے، اسی کے بارے میں۔

اب وہ بچینا ہو یا کوئی اور، میرے بھائی نے درختوں سے اترے بغیر آشنائیاں کی ہیں۔ ایک بار میں نے اسے کاندھے پر ایک گدا لٹکائے شاخوں پر دوڑتے دیکھا جو اس نے اتنی ہی آسانی سے لٹکا رکھا تھا جتنی آسانی سے وہ بندوقیں، رسیاں، کلہاڑیاں، پانی کی چھاگلیں یا بارود کی بوتلیں لٹکاتا تھا۔

ڈوروتھیا نامی ایک طوائف نے مجھ سے اعتراف کیا کہ وہ خود اپنے ایما پر اس سے مل چکی ہے، پیسے کے لیے نہیں بلکہ محض ایک تاثر حاصل کرنے کے لیے۔

''کیا تاثر حاصل کیا تم نے؟''

''ہوں! میں بالکل مطمئن ہوں...''

ایک اور نے جس کا نام زبیدے تھا، مجھے بتایا کہ اس نے ''درختوں والے آدمی'' کو، جیسا کہ اسے کہا جاتا تھا، خواب میں دیکھا ہے۔ یہ خواب اس قدر مفصل اور اس قدر غیر معمولی طور پر درست معلومات سے بھرپور تھا کہ میں سمجھتا ہوں اس نے لازماً اسے حقیقت میں جیا ہوگا۔

خیر، میں نہیں جانتا کہ یہ کہانیاں کس طرح پھیلیں، لیکن کوسیمو میں عورتوں کے لیے یقیناً دلربائی رہی ہوگی۔ وہ جب سے ہسپانویوں کے ساتھ رہا تھا، اپنی وضع قطع کا زیادہ خیال رکھنے لگا تھا۔ اس نے ریچھ کی طرح سمور لپیٹے پھرنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ موزے اور گاؤدُم کوٹ پہننے لگا تھا اور اس کے سر پر انگریزی رواج کے مطابق ایک اونچا ہیٹ ہوتا تھا۔ وہ روزانہ داڑھی مونڈتا اور اپنی وگ میں کنگھی کرتا۔ اب کوئی بھی اس کے لباس کو دیکھ کر یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ شکاری مہم پر جا رہا ہے یا کسی محبوبہ سے ملنے۔

کہانی یوں ہے کہ ایک پختہ کار اور عالی مرتبہ خاتون، جس کا نام میں نہیں بتاؤں گا کہ اس کا تعلق اومبروسا ہی سے تھا (اس کے بیٹے اور پوتے اب تک یہاں رہتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ اس ذکر سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے، لیکن اُن دنوں یہ کہانی زبان زدِ خاص و عام تھی)، وہ ہمیشہ ایک بوڑھے کوچوان کے ساتھ بگھی میں تنہا آیا جایا کرتی تھی۔ وہ بڑی سڑک کے ایک حصے پر جو جنگل سے گزرتا تھا، بگھی کو لے

Scanned with CamScanner

جاتی اور ایک خاص جگہ پہنچ کر کوچوان سے کہتی، ''جیوویتا، جنگل کھمبیوں سے پٹا پڑا ہے۔ ذرا نیچے اترو اور اسے بھر لاؤ،'' اور ان الفاظ کے ساتھ اسے ایک بڑی سی ٹوکری تھما دیتی۔ جوڑوں کے درد کا مارا غریب کوچوان اپنی نشست سے نیچے اترتا اور ٹوکری اپنے کاندھوں پر اٹھا کر سڑک پر چل پڑتا۔ وہ شبنم میں تر پودوں کے درمیان تلاش شروع کرتا اور چھتری نما یا گولا کھمبی ڈھونڈنے کے لیے ہر پتے کے نیچے جھکتا ہوا بتولوں میں دور سے دور تر نکل جاتا۔ دریں اثنا عالی مرتبہ خاتون بگھی سے اتر کر سڑک پر لٹکتی ہوئی موٹی موٹی شاخوں میں یوں غائب ہو جاتی گویا کہ آسمان پر چلی گئی ہو۔ اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ماسوائے یہ کہ گزرتے ہوئے لوگ بگھی اکثر جنگل میں خالی کھڑی ہوئی دیکھا کرتے۔ پھر، جس پُراسرار انداز سے وہ عالی مرتبہ خاتون غائب ہوتی تھی، نڈھال دکھائی دیتی ہوئی وہ اسی انداز سے بگھی میں دوبارہ بیٹھ جاتی۔ تب تر جیوویتا ٹوکری کی تہہ میں چند کھمبیاں لیے لوٹ آتا، اور وہ دوبارہ چل پڑتے۔

ان کہانیوں میں سے اکثر اُن پانچ جینوائی خواتین کے گھر سنائی جاتی تھیں جو نوجوان امیروں کی دعوتیں کیا کرتی تھیں (جب میں کنوارا تھا تو خود بھی ان دعوتوں میں اکثر شریک ہوتا تھا) اور یوں ان خواتین پر اچانک بیرن سے ملاقات کرنے کا خبط سوار ہو گیا۔ حقیقت میں، بلوط کا ایک خاص درخت ابھی تک ''پانچ چڑیوں والا بلوط'' کہلاتا ہے، اور ہم بوڑھے جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ کہانی کا راوی گی نامی، ایک کشمش کا بیوپاری ہے، جس کی بات کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ دھوپ بھرا ایک خوشگوار دن تھا اور یہ گیے نامی شخص جنگل میں شکار کھیل رہا تھا۔ وہ بلوط کے قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ کوسیمو نے پانچوں خواتین کو اوپر شاخوں پر بٹھایا ہوا ہے، اور وہ سب بالکل عریاں، ایک اس شاخ پر تو دوسری اس شاخ پر، گرم سہ پہر کے مزے لے رہی ہیں۔ سورج سے بچنے کے لیے انھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی چھتریاں کھول رکھی تھیں، اور بیرن ان کے جھرمٹ میں بیٹھا لاطینی اشعار پڑھ رہا تھا۔ شعر اووِڈ (Ovid) کے تھے یا لکریشیس (Lucratius) کے، گیے یہ نہیں سمجھ پایا۔

سو، اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور تھیں۔ اب ان کہانیوں میں کتنی سچائی تھی، میں یہ نہیں جانتا۔ اس وقت وہ کسی حد تک کم آمیز اور ایسی باتوں کے بارے میں شرمیلا تھا، لیکن بڑھاپے میں وہ بہت، بلکہ بہت زیادہ، کہانیاں سنایا کرتا تھا، اگرچہ ان میں سے بیشتر اتنی غیر حقیقی ہوتی تھیں کہ وہ خود ان میں بھٹک کر رہ جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی لڑکی حاملہ ہو جاتی اور کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ اس کا

ذمے دار کون ہے، تو لوگ آسانی سے کوسیمو پر الزام لگا دیتے اور یہ ان کی عادت بن گئی تھی۔ ایک بار ایک لڑکی نے بتایا کہ اس نے زیتون چنتے ہوئے کس طرح اپنے آپ کو بندر جیسے دو لمبے بازوؤں کے ذریعے اوپر اٹھایا جاتا ہوا محسوس کیا... تھوڑے ہی عرصے بعد اس کے ہاں جڑواں بچے ہوئے۔ اومبروسا بیرن کے حقیقی یا فرضی ناجائز بچوں سے بھر گیا۔ اب وہ سب جوان ہو چکے ہیں اور سچ ہے کہ چند کی صورت یقیناً اس سے ملتی ہے، مگر یہ قوتِ ترغیب کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے، کہ حاملہ عورتیں جب کوسیمو کو اچانک ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتے دیکھتیں تو ان کے جذبات میں تغیر آنا لازم تھا۔

جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں ان میں سے بہت سی کہانیوں پر، جو کئی پیدائشوں کی وضاحت میں سنائی جاتیں، یقین نہیں رکھتا۔ نہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے اتنی ہی عورتوں سے تعلقات تھے جتنی عورتوں سے لوگ اسے منسوب کرتے ہیں۔ لیکن جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جاننے والے اس کے بارے میں خاموش رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔

اور پھر، اگر اس کے پیچھے اتنی ہی عورتیں پڑی ہوئی تھیں، تو ان چاندنی راتوں کی کیسے وضاحت کی جا سکتی ہے جب وہ اومبروسا کے مکانوں کے باہری حلقے کو بلندی سے دیکھتے ہوئے میوہ زاروں میں لگے انجیر، آلو بخارے اور بہی کے درختوں پر کسی بلی کی طرح گاؤں کے گرد ماتم کناں بھٹکتا پھرتا اور اس کی آہیں، جمائیاں یا کراہیں، قابو پانے اور عام آوازوں میں ادا کرنے کی ہزار کوششوں کے باوجود اس کے گلے سے عموماً چیخوں یا غراہٹوں کی صورت میں نکلتیں، اور اومبروسا کے لوگ، جو اس کی عادتوں سے واقف تھے، جب اپنی نیند میں یہ سب کچھ سنتے تو چونکتے تک نہ تھے۔ وہ فقط بستر میں کروٹ بدلتے اور کہتے، ”بیرن کسی عورت کی تلاش میں ہے۔ خدا کرے اسے کوئی مل جائے اور ہم سو پائیں۔“

بعض اوقات ان بوڑھوں میں سے جو بے خوابی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ذرا سے بھی شور پر کھڑکی تک جانے کے لیے بالکل تیار رہتے ہیں، کوئی باہر میوہ زار میں جھانکتا، اور انجیر کے پیڑوں کی شاخوں کے درمیان سے چاندنی میں زمین پر پڑتا ہوا کوسیمو کا سایہ دیکھتا۔ ”حضور والا، آج رات آپ سو نہیں پا رہے؟“

”نہیں۔ میں جتنا بھی جھولتا اور پہلو بدلتا ہوں اتنا ہی زیادہ بیدار محسوس کرتا ہوں،“ کوسیمو اس طرح کہتا گویا کہ اپنا چہرہ تکیوں میں دبائے اپنے پپوٹوں کو بند ہوتا محسوس کرنے کی آرزو میں، اپنے بستر

سے بول رہا ہو، جب کہ حقیقت میں وہ کسی بازی گر کی طرح معلق لٹک رہا تھا۔ ''معلوم نہیں آج رات کیا بات ہے... گرمی... اعصاب... غالباً موسم بدل رہا ہے۔ کیا تم ایسا محسوس نہیں کرتے؟''

''ہوں، میں محسوس کرتا ہوں، میں محسوس کرتا ہوں... لیکن میں بوڑھا ہوں، حضور والا۔ اس کے برعکس آپ کے لہو میں جوش ہے...''

''ہاں، سو تو ہے...''

''خیر، کوشش کیجیے کہ یہ ذرا دوری پر جوش مارے، حضور سردار، کیونکہ یہاں آپ کو سکون دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ فقط غریب لوگ ہیں جنھیں نور کے تڑکے اٹھنا ہے اور جو اَب سونا چاہتے ہیں...''

کوسیمو جواب نہ دیتا۔ صرف سرسراہٹ پیدا کرتا ہوا میوہ زار کے اندر چلا جاتا۔ وہ ہمیشہ سے شائستگی کی حدود میں رہنا جانتا تھا اور جہاں تک اومبروسا کے لوگوں کا تعلق ہے تو وہ بھی ہمیشہ سے اس کی ترنگوں کو برداشت کرنا جانتے تھے۔ کچھ اس لیے کہ وہ سردار تھا اور کچھ اس لیے کہ وہ دوسروں سے مختلف سردار تھا۔

بعض اوقات اُس کی حیوانی آوازیں دوسری کھڑکیوں اور زیادہ مشتاق کانوں تک پہنچتیں۔ بلاشبہ کسی روشن ہوتی موم بتی، دبی دبی ہنسی اور سایوں میں نسوانی سرگوشیوں کی آواز کا مطلب اس کے ساتھ مذاق کرنا یا اس کی نقل اتارنا تھا۔ اس کے باوجود اس متروک انسان کے لیے جو کسی بھڑ مانس کی طرح شاخوں پر اچھلتا پھرتا تھا، یہ بات نہایت سنجیدہ بلکہ محبت کی پکار تھی۔

اور اب زیادہ بے حیا لڑکیوں میں سے کوئی جس کا بدن اپنے بستر کی حرارت سے ابھی تک گرم ہوتا، پستان نظر آرہے ہوتے، بال کھولے، اپنے گداز ہونٹوں کے درمیان ایک اجلی مسکراہٹ لیے، کھڑکی تک آتی جیسے کہ یہ دیکھنے آئی ہو کہ باہر کیا ہے۔ پھر ایک مکالمہ شروع ہو جاتا۔

''کون ہے؟ کیا بلی ہے؟''

وہ کہتا، ''ایک آدمی، ایک انسان۔''

''میاؤں میاؤں کرتا آدمی؟''

''نہیں، آہیں بھرتا۔''

''کیوں؟ کیا بات ہے؟''

Scanned with CamScanner

''کوئی بات ہے...''

''کیا؟''

''یہاں آؤ تو میں تمھیں بتاؤں...''

لیکن مردوں نے کبھی اس کی توہین نہیں کی۔ اور نہ کبھی کسی سے اس کا جھگڑا ہوا۔ یہ علامتیں، مجھے لگتا ہے، ظاہر کرتی ہیں کہ وہ کبھی اس حد تک خطرناک نہیں تھا۔ صرف ایک دفعہ وہ پُراسرار طور پر زخمی ہوا تھا۔ یہ خبر ایک صبح پھیل گئی۔ اومبروسا کے ڈاکٹر کو اس اخروٹ کے پیڑ پر چڑھنا پڑا جہاں وہ کراہ رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ان گرابی چھرّوں سے بھری ہوئی تھی جو گوریّوں کے شکار میں استعمال ہوتے ہیں اور انھیں ایک ایک کر کے چمٹی سے نکالا جانا تھا۔ یہ عمل تکلیف دہ تھا لیکن وہ جلد ہی بحال ہو گیا۔ یہ بات کبھی صحیح طور سے معلوم نہ ہو سکی کہ اسے چھرے کیسے لگے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک شاخ پر چڑھتے ہوئے اسے غلطی سے چھرے لگ گئے تھے۔

اخروٹ کے پیڑ پر افاقہ یابی اور غیر متحرک ہونے کے دوران وہ سنجیدہ مطالعے میں ڈوب گیا۔ ان دنوں اس نے درختوں میں ایک مثالی ریاست کے آئین کے لیے ایک منصوبہ تحریر کرنا شروع کیا جس میں انصاف پسند لوگوں سے آباد ایک خیالی شجری جمہوریہ کو بیان کیا گیا تھا۔ اس نے اسے قوانین اور حکومتوں پر ایک مقالے کی حیثیت سے شروع کیا تھا لیکن دورانِ تحریر، پیچیدہ کہانیاں اختراع کرنے کی ترنگ اس کی راہ میں حائل ہو گئی اور مقالہ مہمات، مبارزتوں اور شہوانی واقعات کا ایک ابتدائی خاکہ بن کے رہ گیا۔ آخر الذکر عنصر، ازدواجی حقوق پر ایک باب میں شامل تھا۔ اس کتاب کا اختتام یہ ہونا چاہیے تھا: مصنف درختوں کی چوٹیوں پر ایک کامل ریاست قائم کرنے اور ساری انسانیت کو وہاں سکونت اختیار کرنے اور ہنسی خوشی رہنے پر قائل کرنے کے بعد زمین کو بسانے نیچے آ گیا، جواب ویران تھی۔ یہ ہے وہ اختتام جو ہونا چاہیے تھا، لیکن کتاب نامکمل رہی۔ اس نے دیدرو کو ایک تلخیص محض یہ لکھ کر بھیج دی: ''کوسیمو دی روندو، انسائیکلوپیڈیا کا قاری''۔ دیدرو نے ایک مختصر رقعے کے ذریعے اس کا شکریہ ادا کیا۔

۲۰

میں اُس دور کے بارے میں زیادہ نہیں بتا سکتا، کہ وہ میرے اوّلیں سفرِ یورپ کا زمانہ تھا۔ میں

Scanned with CamScanner

نوجوان تھا اور خاندانی میراث کو جس طرح چاہتا استعمال کر سکتا تھا کیونکہ میرے بھائی کو اس میں سے بہت کم درکار تھا۔ یہی بات میری والدہ کے لیے بھی درست تھی جو بے چاری حال ہی میں بہت تیزی سے بوڑھی ہو گئی تھیں۔ میرے بھائی نے اس شرط پر کہ میں اسے ایک ماہانہ رقم دوں، اس کے محصول ادا کروں اور اس کے معاملات کو درست رکھوں، ہماری ساری جائیداد کا مختار نامہ میرے حق میں لکھ دینے کو کہا تھا۔ مجھے صرف جائیداد کا انتظام سنبھالنا تھا اور اپنے لیے بیوی کا انتخاب کرنا تھا۔ میں پہلے ہی اپنے سامنے وہ منظم اور پرسکون زندگی دیکھ رہا تھا، جو صدی کے خاتمے پر بڑے بڑے انقلابات کے باوجود، میں حقیقت میں گزارنے میں کامیاب رہا ہوں۔

لیکن یہ زندگی شروع کرنے سے پہلے میں نے اپنے کو سفر کا ایک وقفہ دیا۔ میں پیرس بھی گیا اور عین اس وقت وہاں پہنچا جب والتیئر کو، جو اپنی ایک تمثیل پیش کرنے کے لیے برسوں بعد لوٹا تھا، ایک فاتحانہ استقبالیہ دیا جا رہا تھا۔ لیکن یہ میری زندگی کی یادداشتیں نہیں ہیں، جو اس لائق نہیں ہیں کہ تحریر میں لائی جائیں۔ میں اس سفر کا ذکر صرف اس لیے کر رہا ہوں کہ میں جہاں کہیں بھی گیا اومبروسا کے درخت نشیں شخص کی شہرت وہاں موجود تھی۔ غیر ملکوں میں بھی یہی حال تھا۔ ایک دفعہ میں نے ایک جنتری میں ایک تصویر دیکھی جس کے نیچے یہ الفاظ درج تھے، ''اومبروسا (جمہوریہ جینوآ) کا وحشی آدمی جو صرف درختوں میں رہتا ہے۔''

اسے ایک لمبی داڑھی اور لمبی دم کے ساتھ ایک ٹڈی کھاتے ہوئے اس طرح پیش کیا گیا تھا کہ اس کا سارا بدن پتوں سے چھپا ہوا تھا۔ اس کی تصویر عفریتوں والے باب میں دو جنسے اور جل پری کے درمیان تھی۔

اس قسم کے واہمے کا سامنا ہوتا تو میں عام طور پر یہ بات ظاہر نہ کرنے کی احتیاط کرتا کہ وہ شخص میرا بھائی ہے۔ لیکن جب پیرس میں والتیئر کے اعزاز میں دیے گئے استقبالیے میں مجھے مدعو کیا گیا تو میں نے اس کا واضح اعلان کیا۔ بوڑھا فلسفی اپنی آرام کرسی میں تھا اور خواتین کے ایک ہجوم نے جو جھینگر کی طرح شاداں اور خارپشت کی طرح کٹیلی تھیں، اسے گھیر رکھا تھا۔ جب اس نے سنا کہ میں اومبروسا سے آیا ہوں تو مجھے یوں مخاطب کیا، ''کیا وہ جگہ تمھارے نزدیک ہے، میرے عزیز کوالیئے، جہاں وہ مشہور فلسفی ہے جو درختوں پر رہتا ہے؟''

Scanned with CamScanner

مجھے اتنا فخر محسوس ہوا کہ میں اپنے کو جواب دینے سے نہ روک سکا۔ ''وہ میرا بھائی ہے، موسیو، بیرن دی روندو۔''

والتیئر بہت حیران ہوا، جزوی طور پر غالباً یہ دیکھ کر کہ ایسے عجیب مظہر کا بھائی بظاہر اس قدر عام شخص ہے، اور وہ مجھ سے اس طرح کے سوال کرنے لگا، ''لیکن کیا تمھارا بھائی آسمان سے نزدیک تر رہنے کے لیے درختوں پر رہتا ہے؟''

''میرا بھائی سمجھتا ہے،'' میں نے جواب دیا، ''کہ ہر وہ شخص جو زمین کو مناسب طور سے دیکھنا چاہتا ہے، اسے لازم ہے کہ اپنے کو زمین سے ضروری فاصلے پر رکھے۔'' والتیئر اس جواب کو سراہتا ہوا لگا۔ ''کبھی صرف فطرت ہی زندہ مظاہر پیدا کرتی تھی،'' اس نے بات سمیٹی۔ ''اب یہ کام عقل کرتی ہے۔'' اور عمر رسیدہ دانا اپنے خدا پرست مداحوں کے شور و غل میں پھر سے ڈوب گیا۔

جلد ہی ایک تاکیدی خط کے ذریعے واپس بلائے جانے کی وجہ سے مجھے اپنا سفر منقطع کر کے اومبروسا لوٹنا پڑا۔ ہماری والدہ کے دمے نے اچانک شدت اختیار کر لی تھی اور وہ بے چاری بستر سے ہلنے سے بھی معذور ہو گئی تھیں۔

جب میں نے دہلیز عبور کر کے اپنے مکان کی جانب نظریں اٹھائیں تو مجھے یقین تھا کہ اسے وہیں دیکھوں گا۔ کوسیمو، ہماری والدہ کی خواب گاہ کی دہلیز سے ذرا ہی باہر ایک شہتوت کے پیڑ کی اونچی شاخ پر دبکا ہوا بیٹھا تھا۔ ''کوسیمو!'' میں نے دبی ہوئی آواز میں صدا دی۔ اس نے جواب میں اشارہ کیا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ ہماری والدہ قدرے بہتر ہیں مگر ابھی تک بستر پہ ہیں، اور یہ بھی کہ میں خاموشی سے اوپر آؤں۔

کمرہ سائے میں تھا۔ میری والدہ بہت سارے تکیوں کے سہارے اپنے کاندھوں کو ٹکائے بستر میں لیٹی تھیں۔ وہ اتنی بڑی لگ رہی تھیں کہ پہلے کبھی نہیں لگی تھیں۔ گھر کی چند عورتیں ان کے آس پاس تھیں۔ باتیستا ابھی نہیں پہنچی تھی کیونکہ اس کے شوہر کاؤنٹ دیستومیک کو، جسے اس کے ساتھ آنا تھا، انگور کی فصل کی وجہ سے رکنا پڑ گیا تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی، جس میں درخت کی شاخ پر بیٹھا کوسیمو چوکھٹے میں جڑا ہوا نظر آ رہا تھا، کمرے کے سائے میں دمک رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں والدہ کا ہاتھ چومنے کے لیے جھکا۔ وہ فوراً مجھے پہچان گئیں اور اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ دیا۔
''ارے، تم آ گئے، بیاجیو...'' جب دمہ ان کے گلے پر بہت زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا تھا تو وہ کمزوری آواز میں بولتی تھیں، لیکن صاف طور پر اور بڑے احساس کے ساتھ۔ گو جس بات نے مجھے متاثر کیا وہ انھیں، ہم دونوں کو، کوسیمو اور مجھے، مخاطب کرتے ہوئے سننا تھا، گویا کہ وہ بھی ان کے سرہانے موجود ہو۔ کوسیمو انھیں درخت سے جواب دے رہا تھا۔

''کیا مجھے دوا کھائے بہت دیر ہو گئی، کوسیمو؟''

''نہیں، صرف چند منٹ ہوئے ہیں، اماں۔ دوسری خوراک لینے سے پہلے ذرا ٹھہر جائیے کیونکہ ابھی اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔''

ایک موقعے پر انھوں نے کہا، ''کوسیمو، مجھے سنترے کی ایک پھانک دینا،'' اور میں حیرت زدہ رہ گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیران میں تب ہوا جب میں نے کوسیمو کو کھڑکی کے راستے ایک طرح کا جہازی ہارپون کمرے کے اندر بڑھاتے اور اس کے ذریعے سنترے کی ایک پھانک اٹھا کر ہماری والدہ کے ہاتھ پر رکھتے دیکھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ایسی تمام چھوٹی چھوٹی خدمات کے لیے وہ اس کا سہارا لینے کو ترجیح دیتی تھیں۔

''کوسیمو، میری شالیں دینا۔''

اور وہ اپنے ہارپون کی مدد سے آرام کرسی پر بکھری ہوئی چیزوں میں تلاش کر کے شالیں اٹھاتا اور ان کے حوالے کر دیتا۔ ''یہ رہیں، اماں۔''

''شکریہ، کوسیمو، میرے بیٹے!'' وہ ہمیشہ اس طرح بات کرتیں گویا کہ وہ فقط گز دو گز کی دوری پر ہو لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ایسے کاموں کے لیے کبھی نہ کہتی تھیں جنھیں وہ درخت پر سے نہیں کر سکتا تھا۔ ایسی صورتوں میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتیں یا پھر عورتوں سے۔

ہماری والدہ رات کو نہ سو سکیں۔ کوسیمو، ایک چھوٹی سی لالٹین شاخ سے لٹکائے کہ وہ بھی اندھیرے میں اسے دیکھ سکیں، درخت سے ان کی خبر گیری کرتا رہا۔

صبح کا وقت ان کے مرض کے لیے بدترین تھا۔ واحد علاج کوشش کر کے ان کی توجہ بانٹنا تھا۔ سو کوسیمو بانسری پر چھوٹی چھوٹی دھنیں بجا رہا تھا، یا پرندوں کے گیت کی نقل کر رہا تھا، یا تتلیاں پکڑ کر انھیں

کمرے کے اندر چھوڑ رہا تھا، یا تخم دان کے پھولوں سے لڑیاں بنا رہا تھا۔

وہ ایک دھوپ بھرا دن تھا۔ کوسیمو ایک نرسل سے صابن کے بلبلے بنا کر، انھیں کھڑکی کے ذریعے بیمار عورت کے بستر کی طرف پھونکوں سے اُڑانے لگا۔ ہماری والدہ نے ان قوس قزحی رنگوں کو اڑتے اور کمرے کو پُر کرتے دیکھا تو بولیں، ''ارے، تم کون سے کھیل کھیل رہے ہو!'' اس بات سے مجھے وہ دن یاد آ گئے جب ہم چھوٹے بچے تھے اور وہ ہمیشہ ہمارے کھیلوں کو، بے کار اور بچگانہ کہہ کر ناپسند کرتی تھیں، لیکن اب، اور غالباً پہلی بار، وہ ہمارے کھیلوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ صابن کے بلبلے ان کے چہرے تک جا پہنچتے تھے اور وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ انھیں پھونک مار کے پھوڑ دیتیں۔ ایک بلبلہ ان کے ہونٹوں تک بھی پہنچا اور وہ وہاں جم گیا۔ ہم ان پر جھکے۔ کوسیمو کے ہاتھ سے نرسل گر پڑا۔ وہ گزر چکی تھیں۔

نوحہ گری، جلد یا بدیر، خوش آئند واقعات کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ زندگی کا قانون ہے۔ ہماری والدہ کی وفات کے ایک سال بعد مقامی اشرافیہ کی ایک لڑکی سے میری منگنی ہو گئی۔ میری منگیتر کو اومبروسا میں رہنے کے تصور سے مانوس کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ میرے بھائی سے خائف تھی۔ یہ خیال ہی اسے دہشت زدہ کرنے کو کافی تھا کہ پتوں کے درمیان ایک متحرک آدمی، جو کسی پل بھی نمودار ہو سکتا ہے، کھڑکیوں میں سے ہر حرکت دیکھ رہا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس نے کوسیمو کو کبھی نہیں دیکھا تھا اور اسے ایک طرح کا وحشی تصور کرتی تھی۔ اس کے ذہن سے یہ خوف نکالنے کے لیے میں نے کھلی فضا میں، درختوں کے نیچے، ایک ظہرانے کا انتظام کیا، جس میں کوسیمو بھی مدعو تھا۔ کوسیمو کی نشست عین ہمارے اوپر ایک گل خطمی کے درخت پر تھی جہاں ایک چھوٹی سی سینی میں اسے کھانا دیا گیا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ، سماجی تقریبات کا عادی نہ ہونے کے باوجود، اس نے بھی عمدہ طور طریقے کا مظاہرہ کیا۔ میری منگیتر کسی حد تک مطمئن ہو گئی اور اس نے محسوس کیا کہ درختوں پر رہنے سے قطع نظر وہ دوسرے لوگوں جیسا ہی ایک انسان ہے۔ اس کے باوجود بے اعتمادی کا ایک ناقابلِ تسخیر احساس میری منگیتر پر طاری رہا۔

شادی کے بعد، جب ہم اومبروسا والی کوٹھی میں رہنے لگے، تو بھی وہ نہ صرف اپنے جیٹھ سے بات کرنے سے گریز کرتی بلکہ جہاں تک ممکن تھا اس کا سامنا کرنے سے بھی کتراتی، حالانکہ وہ بے چارہ

گا ہے بگا ہے اس کے لیے پھولوں کے گچھے اور نادر سمور لایا کرتا تھا۔ جب بچے پیدا ہونے اور بڑے ہونے لگے تو اس کے دماغ میں یہ خبط سما گیا کہ تایا کی قربت ان کی تعلیم پر برا اثر مرتب کرے گی۔ وہ اس وقت تک خوش نہ ہوئی جب تک ہم نے رونڈو والی جاگیر میں اپنے پرانے قلعے کو، جو مدت سے غیر آباد تھا، رہنے کے قابل نہ بنا لیا، اور اومبروسا کی نسبت وہاں زیادہ مقیم نہ رہنے لگے تاکہ بچے برے اثرات سے دور رہیں۔

وقت گزرنے کا احساس کوسیمو کو بھی ہونے لگا۔ اس کی ایک علامت بجو کتے اوتیمو ماسیمو کی سن رسیدگی تھی، جو غول کی کتیوں میں شامل ہو کر لومڑیوں کے پیچھے جانے کی خواہش کھو چکا تھا، اور نہ ہی اب مقامی دوغلی کتیوں سے بے تکے معاشقوں کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ زمین پر لیٹا رہتا تھا، کہ سیدھا کھڑا ہونے کی صورت میں اس کا پیٹ زمین سے اس قدر قریب ہوتا تھا کہ سیدھا کھڑا ہونا اس کے لیے سودمند نہیں تھا۔ اور اس درخت کے دامن میں جس پر کوسیمو ہوتا، تھوتھنی سے دم تک پھیل کر لیٹا ہوا وہ اپنے مالک پر ایک تھکی ہوئی نظر ڈالتا اور بمشکل اپنی دم ہلاتا۔ کوسیمو غیر مطمئن ہوتا جا رہا تھا۔ گزرتے وقت کا احساس اسے اپنی زندگی سے، جو انھیں پرانے درختوں پر متواتر اوپر نیچے بھٹکنے میں گزری تھی، ایک طرح کی بے اطمینانی میں مبتلا کرنے لگا۔ اب کوئی بھی چیز اسے مکمل طمانیت نہیں دیتی تھی — کیا شکار، کیا عارضی آشنائیاں، کیا کتابیں۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ایسی ہی کسی کیفیت کے زیر اثر وہ کمزور اور سب سے نازک ٹہنیوں پر تیزی سے چڑھ جاتا، گویا کہ ابھی اور اونچا اگنے والے درختوں کی تلاش میں ہو، تاکہ انھیں بھی تسخیر کرے۔

ایک دن اوتیمو ماسیمو بے چین تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بہار کی ہوا چل پڑی ہو۔ کتے نے اپنی تھوتھنی اٹھا کر سونگھا اور پھر اپنے آپ کو نیچے گرا دیا۔ وہ دو تین بار اٹھا، ارد گرد گھوما اور دوبارہ لیٹ گیا۔ اچانک اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سانس لینے کے لیے رکتا ہوا، وہ آہستہ آہستہ دلکی چلتا رہا۔ کوسیمو شاخوں پر اس کا پیچھا کرتا رہا۔

اوتیمو ماسیمو جنگل کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن میں ایک بالکل صحیح سمت لیے ہوئے لگتا تھا، کیونکہ جب وہ پیشاب کرنے کے لیے کبھی کبھار رکتا، تو زبان نکالے اپنے مالک کو دیکھتا رہتا۔ پھر اپنے

آپ کو کھجاتا اور ایک بار پھر تیقن کے ساتھ چل پڑتا۔ وہ جنگل کے ایسے حصوں میں جا رہا تھا جہاں کوسیمو کا گزر بہت کم تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ علاقہ اس کے لیے تقریباً نا معلوم تھا۔ اس کا رخ ڈیوک تولیما ٹیکو کی مخصوص شکارگاہوں کی سمت تھا۔ ڈیوک تولیما ٹیکو ایک برباد شدہ بوڑھا اوباش تھا۔ وہ مدت سے شکار پر نہیں نکلا تھا مگر کوئی چور شکاری اس کی شکارگاہ میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا، کہ شکارگاہ کے محافظ بے شمار اور چوکس تھے۔ سو، کوسیمو جس کا سابقہ ان سے پڑ چکا تھا، دور رہنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اب اوتیمو ما سیمو اور کوسیمو ڈیوک کی شکارگاہوں میں آگے ہی آگے بڑھتے جا رہے تھے، لیکن نہ ایک نے نہ دوسرے نے نایاب شکار کا تعاقب کرنے کے بارے میں سوچا۔ کتا اپنے ہی کسی پوشیدہ تقاضے کے تحت چلتا جا رہا تھا اور بیرن اس دریافت کے بے چین تجسس کی گرفت میں تھا کہ آخر کتا جا کہاں رہا ہے۔

یوں، بجو کتا ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں جنگل ختم ہو گیا اور آگے ایک کھلا میدان تھا۔ ستونوں پر بیٹھے پتھر کے دو شیر ایک نوابی نشان سنبھالے ہوئے تھے۔ ان سے پرے کوئی سیرگاہ، باغ یا تولیما ٹیکو جاگیر کا کوئی زیادہ نجی حصہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہاں دو پتھر کے شیروں کے سوا، جن کے پرے میدان تھا، اور کچھ نہ تھا۔ وہ چھوٹی سبز گھاس کا ایک وسیع وعریض میدان تھا جس کی حدود سیاہ بلوطوں کے پس منظر میں، دور فاصلے میں اوجھل ہو رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کی جھلی سی چھائی تھی۔ کوئی پرندہ نہیں چہچہا رہا تھا۔

کوسیمو کے لیے میدان ایک ایسا منظر تھا جو اسے بے آرام کر گیا۔ بیرن، جو ہمیشہ اومبروسا کی گھنی نباتات کے درمیان رہا تھا، اور کسی بھی جگہ اپنے راستوں کے ذریعے پہنچنے کا یقین رکھتا تھا، اپنے سامنے آسمان تلے ایک خالی اور ناقابل عبور، عریاں خلا دیکھ کر چکرا گیا۔

اوتیمو ما سیمو تیزی سے میدان میں داخل ہوا اور پورے زور کے ساتھ، گویا کہ وہ پھر سے جوان ہو گیا ہو، دوڑنے لگا۔ کوسیمو دیودار کے درخت سے، جہاں وہ بیٹھا تھا، کتے کو سیٹی اور آواز سے بلانے لگا۔ ''ادھر، یہاں آؤ، اوتیمو ما سیمو، واپس آؤ! کہاں جا رہے ہو؟'' لیکن کتے نے تعمیل نہیں کی، بلکہ مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ وہ میدان میں دوڑتا چلا گیا یہاں تک کہ سکتے کے نشان کی طرح ایک مبہم نقطے کے سوا، جو اس کی دم تھی کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور پھر وہ نقطہ بھی معدوم ہو گیا۔

دیودار کے درخت پر کوسیمو ہاتھ مل رہا تھا۔ وہ کتے کے گریز اور اس کے غیاب کا عادی تھا لیکن اب اوتیمو ما سیمو اس میدان میں غائب ہو رہا تھا جہاں وہ اس کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا، اور یہ فرار اس تشویش

سے مربوط ہو گیا جو اس نے کچھ دیر قبل محسوس کی تھی۔ توقع کا ایک مبہم احساس اس پر چھا گیا اور وہ میدان میں کسی چیز کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ ان خیالوں پر سوچ بچار کر رہا تھا کہ اس نے اپنے بلوط کے درخت تلے قدموں کی چاپ سنی اور شکارگاہ کے ایک محافظ کو جیبوں میں ہاتھ ڈالے، سیٹی بجاتے گزرتے دیکھا۔ اس آدمی کا انداز اتنا لا اُبالی اور آشفتہ تھا کہ وہ شکارگاہ کے خوفناک محافظوں میں سے نہیں ہو سکتا تھا، مگر اس کی وردی پر نوابی ملازمین کا نشان موجود تھا۔ سو کوسیمو نے اپنے آپ کو درخت کے تنے سے چپکا لیا۔ پھر کتے کا خیال اس کے خوف پر غالب آ گیا۔ اس نے محافظ کو آواز دی، ''اے سارجنٹ، تم نے آس پاس کوئی کتا دیکھا ہے؟''

شکارگاہ کے محافظ نے اوپر دیکھا۔ ''ارے، یہ تم ہو! لڑھکتے کتے والا اڑن شکاری! نہیں، میں نے کتے کو نہیں دیکھا۔ آج صبح تم نے کیا شکار کیا ہے؟''

کوسیمو پہچان گیا کہ وہ اس کے مستعدترین حریفوں میں سے ایک ہے۔ اس نے کہا ''ارے، کچھ نہیں۔ کتا میرے پاس سے بھاگ گیا ہے اور مجھے اس کے پیچھے یہاں تک آنا پڑا ہے... میری بندوق خالی ہے۔''

محافظ ہنس پڑا، ''ارے اسے بھر لو، بلکہ تمھارا جی چاہے تو گولی بھی چلاؤ۔ اب کوئی فرق نہیں پڑتا!''

''اب فرق کیوں نہیں پڑتا؟''

''اب جب کہ ڈیوک مر چکا ہے، یہاں مداخلت کی کون پروا کرتا ہے؟''

''ارے، وہ مر گیا، واقعی؟ مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔''

''اسے مرے اور دفن ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ اور اس کی پہلی دو شادیوں کے وارثوں اور نئی بیوہ کے درمیان جھگڑا چل رہا ہے۔''

''اس کی تیسری بیوی بھی تھی، واقعی؟''

''اس نے اسّی سال کی عمر میں شادی کی تھی، موت سے ایک سال پہلے۔ لڑکی کی عمر لگ بھگ اکیس سال تھی۔ بالکل پاگل پن کی حرکت تھی یہ۔ اس بے چاری نے ایک دن بھی اس کے ساتھ نہیں گزارا۔ اس نے تو جائیداد بھی اب دیکھنا شروع کی ہے، جس کو وہ پسند نہیں کرتی۔''

''ہائیں، پسند نہیں کرتی؟''

Scanned with CamScanner

''ارے، وہ کسی محل یا قلعے میں مسند نشیں ہوتی ہے اور اپنے پورے مقربین کے ساتھ آتی ہے کیونکہ چاہنے والوں کی ایک ٹولی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے۔ تین دن بعد اسے ہر چیز بدنما اور افسوسناک دکھائی دینے لگتی ہے، اور وہ پھر سے چل پڑتی ہے۔ پھر دوسرے وارث آگے آجاتے ہیں بلکہ اس جائیداد میں درآتے ہیں اور اس پر اپنے حق کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور وہ کہتی ہے، 'اچھا اگر تمھیں پسند ہے تو لے لو۔' اب وہ یہاں شکار گاہ کے بنگلے میں آئی ہے۔ لیکن کب تک رہے گی؟ میرے خیال میں زیادہ دن نہیں۔''

''اور یہ بنگلہ کہاں ہے؟''

''میدان کے پار، بلوط کے درختوں سے اُدھر۔''

''پھر میرا کتا وہاں گیا ہے...''

''وہ ضرور ہڈیوں کی تلاش میں گیا ہوگا... معاف کرنا، مجھے لگتا ہے جناب اسے ٹھیک سے کھانے کو نہیں دیتے!'' اور وہ کھلکھلا کے ہنس پڑا۔

کوسیمو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بجو کتے کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے ناقابلِ عبور میدان کو دیکھتا رہا۔

وہ تمام دن نہیں لوٹا۔ اگلے دن کوسیمو، جیسے وہ کسی اندرونی ہیجان سے مجبور ہو، پھر سے دیودار کے درخت پر بیٹھا میدان میں نظریں دوڑا رہا تھا۔

شام کے قریب، کوسیمو کی تیز نظروں نے میدان میں ایک چھوٹا سا نقطہ دیکھا جو دم بہ دم واضح ہوتا جا رہا تھا۔ کتا واپس آرہا تھا۔ ''اوتیمو ماسیمو! یہاں آؤ! تم کہاں تھے؟'' کتا رک گیا اور اپنی دم ہلا کر اپنے مالک کو دیکھنے لگا۔ وہ اسے پیچھے آنے کو کہتا ہوا لگ رہا تھا، لیکن پھر اس خلا کو محسوس کر کے جسے کوسیمو عبور نہیں کر سکتا تھا، وہ پیچھے مڑ گیا۔ اس نے چند جھجکتے ہوئے قدم اٹھائے اور دوبارہ کوسیمو کو دیکھا۔ ''اوتیمو ماسیمو! یہاں آؤ! اوتیمو ماسیمو!'' لیکن کتا دوبارہ دوڑنے لگا اور فاصلے میں گم ہو گیا۔

بعدازاں دو محافظ گزرے۔ ''ابھی تک کتے کا انتظار ہو رہا ہے، جناب والا! لیکن میں نے اسے بنگلے میں اچھے ہاتھوں میں دیکھا ہے...''

''کیا؟''

"ہاں، ماکویزا بلکہ بیوہ ڈچز کے پاس۔ ہم اسے مارکویزا کہتے ہیں کیونکہ شادی سے پہلے وہ مارکویزینا کہلاتی تھی۔ وہ اسے اس طرح رکھ رہی ہے جیسے وہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ رہا ہو۔ وہ گود کا کتا ہے، اگر آپ مجھے ایسا کہنے کی اجازت دیں، جناب والا۔ اب اسے ایک ملائم جگہ مل گئی ہے، سو وہاں ٹکا ہوا ہے..."

دونوں محافظ کھیسیں نکالتے ہوئے چلے گئے۔ اوتیمو ماسیمو پھر واپس نہیں آیا۔ کوسیمو ہر دن دیودار کے درخت پر گزار رہا تھا۔ وہ میدان کو یوں دیکھتا رہتا جیسے اس میں کسی ایسی چیز کو سمجھ سکتا ہو جو خود اس کے اندر مدت سے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، جو فاصلے کا، غیر محسوسیت کا اور زندگی سے پرے تک طول پکڑ جانے والے انتظار کا تصور تھا۔

۲۱

ایک روز کوسیمو دیودار کے درخت سے نیچے دیکھ رہا تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ ایک کرن نے میدان کو قطع کیا اور سبزے سے زمردی ہو گئی۔ دور بلوطوں کے جھنڈ کی سیاہی میں، زیر درختی میں ہلچل ہوئی اور گھوڑا چھلانگ مار کے باہر آیا۔ اس کی زین پر سیاہ لباس میں ایک شہسوار تھا، جس نے چوغہ —— نہیں، اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ وہ شہسوار نہیں تھا بلکہ شہسوار خاتون تھی۔ وہ لگامیں ڈھیلی چھوڑے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا رہی تھی، اور وہ گوری تھی!

کوسیمو کا دل زور سے دھڑکا اور اس نے اپنے کو یہ خواہش کرتے پایا کہ شہسوار خاتون اتنی قریب آ جائے کہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے، اور یہ کہ وہ چہرہ بہت حسین ہو۔ لیکن اس کے قریب آنے اور خوبصورت نکلنے کے انتظار کے علاوہ، وہ ایک تیسری بات کا منتظر تھا، جو امید کی پہلی دو شاخوں سے لپٹی ہوئی ایک تیسری شاخ تھی، جو یہ آرزو تھی کہ شاید یہ دائمی تابندہ حسن اُس ضرورت کو پورا کرے جو اسے کسی جانی پہچانی، مگر اب فراموش شدہ، یاد کو تازہ کرنے کے لیے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یاد، جو اب صرف ایک دھوئیں کی سی لکیر، ایک مدھم سا رنگ ہو کر رہ گئی تھی، اور یہ کہ اس کی بدولت باقی سب کچھ ایک بار پھر ظہور پذیر ہو، بلکہ کسی موجود و زندہ شے میں پھر سے دریافت ہو۔

Scanned with CamScanner

اس آرزو میں کہ شہسوار خاتون شیروں والے دو بلند و بالا ستونوں کے پاس، اس کی سمت والے میدان کے سرے کے ذرا اور قریب آئے، وہ درخت پر بیٹھا رہا۔ لیکن یہ انتظار اذیت ناک ہوتا جا رہا تھا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ میدان کو براہ راست شیروں کی طرف قطع نہیں کر رہی، بلکہ وتری طور پر طے کر رہی ہے، اور یوں جلد ہی جنگل میں دوبارہ غائب ہونے والی ہے۔

وہ اس کی نظر سے اوجھل ہونے والی تھی کہ خاتون نے اپنے گھوڑے کو تیزی سے موڑا اور ایک دوسرے وتر سے میدان کو قطع کرنے لگی۔ یہ راستہ اسے یقیناً تھوڑا سا نزدیک تو لاتا، لیکن اس کے باوجود اسے میدان کے پرلی طرف اوجھل ہونے پر مجبور کر دیتا۔

اور اس لمحے کوسیمو نے برہمی کے ساتھ دیکھا کہ دو بھورے گھوڑے جن پر مصاحب سوار تھے، جنگل سے نکل کر میدان میں آ رہے ہیں۔ لیکن اس نے جلدی سے اپنی برہمی پر قابو پانے کی کوشش کی اور طے کیا کہ یہ مصاحب کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ صرف یہ دیکھنا ہی بہت تھا کہ وہ خاتون شہسوار کے پیچھے پیچھے آنے کے لیے کس طرح ٹیڑھے میڑھے چل رہے ہیں۔ اسے ان کو اپنے ذہن پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے باوجود، اسے تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اسے برہم کر رہے ہیں۔

اور پھر خاتون شہسوار نے، میدان سے اوجھل ہونے سے ذرا ہی قبل اپنے گھوڑے کو دوبارہ موڑا، مگر کوسیمو سے اور پرے، دوسری سمت میں... نہیں، اب گھوڑا اس سمت میں گھومتا ہوا سرپٹ دوڑ رہا تھا، اور یہ چال دونوں تعاقب کنندگان کو دنگ کرنے کے لیے قصداً چلی ہوئی لگتی تھی، جو اب حقیقت میں سرپٹ دوڑتے ہوئے دور نکلے جا رہے تھے اور یہ محسوس نہ کر سکے تھے کہ وہ مخالف سمت میں دوڑی جا رہی ہے۔

اب سب کچھ اسی طرح ہو رہا تھا جس طرح وہ چاہتا تھا۔ خاتون شہسوار دھوپ میں سرپٹ گھوڑا دوڑا رہی تھی۔ وہ ہر لحظہ حسین سے حسین تر اور کوسیمو کی کھوئی ہوئی یادوں کے مماثل ہوتی جا رہی تھی۔ چونکانے والی بات اس کا مسلسل ترچھا راستہ تھا، جس کے باعث وہ اس کے عزائم کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ دونوں شہسوار بھی یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اس کی منزل کیا ہے اور اس کی گھمیریوں کو سمجھنے کی کوشش میں، اچھا خاصا فاصلہ بے کار طے کر رہے تھے، لیکن ہمیشہ نیک نیتی اور مہارت کے ساتھ۔

اب گھوڑے پر سوار خاتون اس سے بھی کم وقت میں جتنی کوسیمو کو توقع تھی، اس سے نزدیک

میدان کے کنارے تک آ پہنچی تھی۔ وہ شیروں والے دوستونوں کے درمیان سے گزر کر، جو لگتا تھا اس کے اعزاز میں نصب کیے گئے ہیں، ایک وسیع الوداعی اشارے کے ساتھ میدان اور اس سے پرے کی ہر چیز کی جانب مڑی، اور گھوڑا دوڑاتی ہوئی دیودار کے نیچے سے گزر گئی۔ اب کوسیمو اس کا چہرہ اور جسم واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ زین پر بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ بیک وقت ایک مغرور عورت اور ایک بچی کا چہرہ تھا۔ اس کی پیشانی ان آنکھوں کے اوپر ہونے میں، اور آنکھیں اس پیشانی کے نیچے ہونے میں خوش تھیں؛ ناک، منھ، ٹھوڑی، ہنسلی، غرضیکہ اس کی ہر چیز، اس کے ہر دوسرے حصے کے ساتھ ہونے میں خوش تھی۔ یہ سب کچھ، ہاں سب کچھ، کوسیمو کو اس چھوٹی سی لڑکی کی یاد دلا رہا تھا جسے اس نے درخت پر گزارے ہوئے اپنے پہلے دن، جھولے پر دیکھا تھا، جس کا نام سنفوروزا، یا ویولا ویولا نتے اوندار یوا تھا۔

اس دریافت سے، بلکہ اسے اپنے ذہن کے ایک غیر تسلیم کردہ گمان سے اس مقام تک لانے سے جہاں وہ اس کے بارے میں اپنے آپ سے اعتراف کر سکے، کوسیمو کو گویا ایک تپ سی چڑھ گئی۔ اس نے آواز دینے کی کوشش کی تاکہ وہ دیودار کی طرف نظریں اٹھائے اور اسے دیکھ لے، لیکن اس کے حلق سے محض ایک بھاری غرغراہٹ ہی نکل سکی اور خاتون نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اب سفید گھوڑا شاہ بلوطوں کے جھنڈ میں سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اس کے سموں کی ضربیں زمین پر جابجا بکھرے ہوئے مخروطیوں کو توڑ کر جوز کی چمکیلی گریوں کو آشکار کر رہی تھیں۔ خاتون نے اپنے گھوڑے کو پہلے ایک سمت میں ڈالا، پھر دوسری میں؛ شجر در شجر کودتا ہوا کوسیمو ایک لمحے اسے دور اور رسائی سے باہر خیال کرتا، دوسرے لمحے حیرت سے اسے تنوں کے پس منظر میں دوبارہ ظاہر ہوتے دیکھتا۔ اس کا انداز تحرک کوسیمو کے ذہن میں بھڑکتی یاد کو دم بہ دم ہوا دے رہا تھا۔ اس نے ویولا تک ایک آواز، اپنی موجودگی کی ایک علامت کے ذریعے پہنچنے کی کوشش کی، لیکن جو آواز اس کے ہونٹوں تک آئی وہ فقط چکور کی سیٹی تھی۔ ویولا نے اسے سنا بھی نہیں۔

اس کے پیچھے آنے والے دونوں مصاحب اس کے ارادوں کو اس کے اختیار کردہ راستے سے بھی کم سمجھتے ہوئے لگتے تھے۔ وہ پے بہ پے غلط سمتیں اختیار کر رہے تھے۔ وہ کبھی زیر درختی میں الجھ رہے تھے اور کبھی دلدل میں پھنس رہے تھے، جبکہ وہ تیر کی طرح، محفوظ و ناقابل گرفت، آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ

مصاحبوں کو بار بار کوئی حکم دیتی یا ان کی حوصلہ افزائی کرتی، کبھی اپنا چابک بلند کر کے، کبھی کوئی توڑا ہوا جوز پھینک کر، گویا انھیں اُس طرف جانے کو کہہ رہی ہو۔ مصاحب میدانوں اور نشیبوں میں سرپٹ گھوڑے دوڑاتے ہوئے فوراً اس طرف دوڑ پڑتے لیکن وہ ایک اور سمت میں مڑ جاتی، اور انھیں دیکھتی بھی نہ تھی۔

''یہ وہی ہے، یہ وہی ہے!'' لمحہ بہ لمحہ امید سے بے چین ہوتا ہوا کوسیمو سوچ رہا تھا۔ اس نے نام لے کر اسے پکارنا چاہا لیکن اس کے ہونٹوں سے جو کچھ نکلا وہ ایک لمبی اداس چیخ تھی، جیسے کسی مرغ باراں کے حلق سے نکلی ہو۔

اب یہ اِدھر اُدھر بھٹکنا، یہ مصاحبوں کو فریب دینا اور یہ دل لگیاں، ان سب کا رخ، کڈھب اور متلون ہی سہی، ایک ہی جانب لگتا تھا۔ اس مقصد کو بھانپتے ہوئے کوسیمو نے اس کے تعاقب کا ناممکن کام ترک کر دیا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا، ''اگر یہ وہی ہے تو میں اُس جگہ جاؤں گا جہاں اسے جانا ہے، اگر یہ وہی ہے تو۔ حقیقت میں یہ کہیں اور جا ہی نہیں سکتی۔'' اور اپنے راستوں پر کودتا پھاندتا وہ اوندار یوا خاندان کے متروک باغ کی طرف بڑھنے لگا۔

اس سائے میں، اس معطر فضا میں، اس چمن میں جہاں پتوں اور کونپلوں کا بھی کچھ اور رنگ تھا، کچھ اور جوہر تھا، وہ اپنے بچپن کی یادوں میں ایسا کھویا گیا کہ خاتون شہسوار کو کم و بیش بھول گیا، یا اگر بھولا نہیں تو کم سے کم اپنے کو یہ بتانے لگا کہ ہو سکتا ہے یہ خاتون وہ نہ ہو، اور یہ کہ اس کا انتظار اور اس کی امید اتنے حقیقی لگتے ہیں کہ جیسے وہ یہیں کہیں ہو۔

پھر اس نے بجری پر گھوڑے کے سموں کی آواز سنی، جو باغ میں آ رہا تھا اور اب سرپٹ نہیں دوڑ رہا تھا، گویا کہ سوار کی خواہش ہر ایک چیز کو ٹھیک سے دیکھنے اور پہچاننے کی ہو۔ بے وقوف مصاحبوں کا کوئی سراغ نہ تھا۔ انھوں نے یقیناً اس کا سراغ کھو دیا ہوگا۔

کوسیمو نے اسے دیکھا۔ وہ فواروں، پھول دانوں اور شہ نشینوں کے گرد گھوم رہی تھی اور اس کی نظریں نباتات پر تھیں، جو اپنی لٹکتی ہوئی بیلوں کے ساتھ اب بہت بڑی ہو گئی تھیں۔ میگنولیا کے درختوں نے پھل پھول کر ایک جھنڈ سا بنا لیا تھا۔ لیکن اس نے کوسیمو کو نہیں دیکھا جو اسے کوئلوں کی سی کوک اور ایسی آوازوں سے بلانے کی کوشش کر رہا تھا جو باغ میں پرندوں کی قریبی چہچہاہٹ میں مدغم ہو رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

وہ گھوڑے سے اتر چکی تھی اور اسے لگام پکڑ کر چلا رہی تھی۔ وہ کوٹھی تک پہنچی اور گھوڑے کو چھوڑ کر بارہ دری میں داخل ہوگئی۔ پھر اچانک وہ پکار پکار کر نوکروں کو بلانے لگی: ''اور تنسیا! گائیتانو! تارکینیو! یہاں سفیدی کرنے کی ضرورت ہے، جھلملیوں کو رنگا جانا ہے، پردے ٹانگے جانے ہیں۔ اور بڑی میز مجھے یہاں چاہیے، بغلی وہاں، پیانو درمیان میں! ساری تصویریں نئے سرے سے لگنی ہیں۔''

تب کو سیمو کو احساس ہوا کہ وہ گھر جو اس کی بے کل نظروں کو ہمیشہ کی طرح بند اور خالی لگا تھا، اب، حقیقت میں، کھلا تھا اور لوگوں سے پُر تھا۔ نوکر جھاڑ پونچھ کرنے، چمکانے اور سامان پھر سے جمانے میں مصروف تھے۔ بند کھڑکیاں کھل رہی تھیں، فرنیچر کھسکایا جا رہا تھا، قالین جھاڑے جا رہے تھے۔ سو یہ ویولا تھی جو واپس آ رہی تھی، جو اومبروسا میں پھر سے آباد ہو رہی تھی، جو ایک بار پھر اس کوٹھی کا قبضہ لے رہی تھی جسے اس نے بچی کی حیثیت سے چھوڑا تھا! کو سیمو کے دل میں تھرتھراتی ہوئی مسرت تھرتھراتے ہوئے خوف سے زیادہ مختلف نہ تھی، کیونکہ ویولا کی واپسی، اور عین اس کی نظروں تلے اس کی ناپیش بیں اور فخر یہ موجودگی کا مطلب اسے ہمیشہ کے لیے کھو دینا بھی ہو سکتا تھا، اپنی یادوں میں بھی، اور معطر پتوں اور چتلی سبز روشنی والے اس پُر اسرار مقام میں بھی۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس سے، اور لڑکی کی حیثیت سے اس کی اوّلیں یاد سے، دور بھاگنے پر مجبور ہوگا۔

اس باہم بدلتی ہوئی دل کی دھڑکن کے ساتھ کو سیمو اسے نوکروں کے درمیان چکر کھاتے، ان سے صوفوں، باجوں اور الماریوں کی جگہیں بدلواتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ جلدی جلدی باغ میں گئی اور اپنے گھوڑے پر دوبارہ بیٹھ گئی۔ مزید احکامات کی منتظر ٹولیاں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔ پھر وہ مالیوں کی طرف متوجہ ہوئی اور انھیں چھوڑی ہوئی کیاریاں آراستہ کرنے، بارشوں کی بہائی ہوئی بجری روشوں پر دوبارہ بچھانے، بید کی کرسیاں رکھنے اور جھولا ڈالنے کے بارے میں ہدایتیں دینے لگی۔

اس نے بازوؤں کی حرکت سے اس شاخ کی جانب اشارہ کیا جہاں کبھی جھولا ہوا کرتا تھا اور جہاں اب پھر سے ڈالا جانا تھا، اور بتایا کہ رسیاں کتنی لمبی ہوں گی اور جھولے کی پینگ کتنی۔ جس دوران وہ یہ سب کچھ کہہ رہی تھی، اس کے ہاتھ کی جنبش اور نگاہ میگنولیا کے اس درخت پر گئی جس پر کبھی کو سیمو نمودار ہوا تھا۔ اور کو سیمو میگنولیا کے درخت پر موجود تھا، اور ویولا نے اسے دوبارہ دیکھا۔

وہ حیران ہوگئی — حد درجہ۔ اس امر میں کوئی شک نہ تھا، حالانکہ اس کی آنکھیں اس کی حیرانی

Scanned with CamScanner

میں سے ہنس رہی تھیں۔ لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور دھیان نہ دینے کا حیلہ کیا، اور ایک دانت عیاں کرتے ہوئے، جو بچپن میں ٹوٹ گیا تھا، اپنے چشم ودہن سے مسکرانے لگی۔

''تم!'' اور پھر جس قدر بھی اس کے بس میں تھا فطری لہجہ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، لیکن اپنے اشتیاق ومسرت کو چھپانے میں ناکام رہ کر، اس نے بات جاری رکھی۔ ''افوہ، سو تم بالکل نیچے آئے بغیر درختوں پر ہی ٹکے ہوئے ہو؟''

کوسیمو اپنے گلے میں چڑیا کی چہک کو بہ مشکل اس جملے میں ڈھال پایا۔ ''ہاں، ویولا، یہ میں ہوں، کیا میں تمھیں یاد ہوں؟''

''تم نے کبھی، واقعی ایک بار بھی زمین پر قدم نہیں رکھا؟''

''کبھی نہیں۔''

پھر، گویا کہ پہلے ہی بہت زیادہ تسلیم کر چکی ہو، وہ کہنے لگی، ''واہ، تم نے یہ معرکہ سر کر ہی لیا، دیکھا! پھر تو یہ اتنا مشکل نہیں رہا ہوگا۔''

''میں تمھاری واپسی کا انتظار کر رہا تھا...''

''بہت خوب!... ارے تم، یہ پردہ کہاں لیے جا رہے ہو؟ اسے یہاں رکھ دو۔ میں اس کا انتظام کرتی ہوں!'' وہ پھر سے کوسیمو کو دیکھنے لگی۔ اس دن کوسیمو شکار کے لیے ملبوس تھا اور جنگلی بلی والی ٹوپی اور بندوق کے ساتھ، سر سے پاؤں تک سمور میں لپٹا تھا۔ ''تم کروزو جیسے لگتے ہو!''

''تم نے یہ کتاب پڑھی ہے؟'' یہ دکھانے کے لیے اس کی معلومات بالکل تازہ ہیں، کوسیمو نے فوراً پوچھا۔

ویولا پہلے ہی دوسری سمت مڑ چکی تھی۔ ''گائیتانو! امپیلیو! خشک پتے! باغ خشک پتوں سے بھرا ہوا ہے!'' پھر اس سے بولی، ''ایک گھنٹے بعد سبزہ زار کے سرے پر میرا انتظار کرو۔'' اور گھوڑے پر سوار، وہ مزید احکامات دینے کے لیے جلدی سے آگے بڑھ گئی۔

کوسیمو نے اپنے آپ کو جنگل کے گھنے پن میں پھینک دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ یہ ہزار گنا زیادہ گھنا ہوتا، شاخوں اور پتوں، جھاڑوں اور باچھڑوں کا ایک پرا ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو اس میں گم کر سکتا، چھپا سکتا اور مکمل طور پر محصور ہونے کے بعد یہ سمجھنے کا اہل ہو سکتا کہ آیا وہ خوش ہے یا خوف سے بدحواس۔

Scanned with CamScanner

سبزہ زار کے کنارے بڑے درخت کی ایک شاخ کو اپنے گھٹنوں سے مضبوطی کے ساتھ جکڑے ہوئے کوسیمو نے ایک پرانی گھڑی میں، جو اس کے نانا جنرل فان کرتیوتز کی تھی، وقت دیکھ کر اپنے آپ سے کہا، وہ نہیں آئے گی۔ لیکن گھوڑے پر سوار دونا ویولا تقریباً پابندیِ وقت کے ساتھ پہنچی اور اوپر نگاہ اٹھائے بغیر درخت کے نیچے رک گئی۔ اب وہ شہسواری کا ہیٹ یا جیکٹ نہیں بلکہ لیس کے کام والا ایک سفید بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ، جو قریب قریب راہباؤں جیسا تھا، پہنے ہوئے تھی۔ رکابوں میں اپنے آپ کو اٹھاتے ہوئے اس نے شاخ پر بیٹھے کوسیمو کی طرف ایک ہاتھ بڑھایا، اور یوں زین پر پیر رکھ کر شاخ تک پہنچ گئی۔ پھر، ابھی تک اس کی طرف دیکھے بغیر، اس نے تیزی سے شاخ پر آ کر ایک آرام دہ دوشاخہ دیکھا اور بیٹھ گئی۔ کوسیمو اس کے قدموں میں دبک گیا اور محض یہ کہہ کر گفتگو شروع کر سکا، ''سو تم لوٹ آئیں؟''

ویولا نے اس پر ایک طنز بھری نظر ڈالی۔ اس کے بال اب بھی اتنے ہی خوبصورت تھے جتنے کہ اس وقت جب وہ بچی تھی۔ ''تمھیں کیسے پتا چلا؟'' وہ بولی۔

کوسیمو نے اس کا مذاق سمجھے بغیر کہا، ''میں نے تمھیں ڈیوک کی شکارگاہ والے میدان میں دیکھا تھا۔''

''وہ شکارگاہ میری ہے۔ میری بلا سے وہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھر جائے۔ تم اس کے بارے میں جانتے ہو؟ میرا مطلب ہے میرے بارے میں؟''

''نہیں... میں نے بس ابھی سنا کہ تم اب بیوہ ہو...''

''ہاں، بے شک میں بیوہ ہوں۔'' اس نے اپنے سیاہ اسکرٹ کو تھپتھپایا، اس کی شکنیں نکالیں اور تیزی سے بولنے لگی، ''تم کچھ بھی نہیں جانتے۔ تم سارا دن درختوں پر رہ کر لوگوں کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہو، اور پھر بھی تم کچھ نہیں جانتے۔ میں نے بوڑھے تولیما ٹیکو سے اس لیے شادی کی کہ میرے خاندان نے مجھے مجبور کیا، مجھ پر دباؤ ڈالا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں مردوں سے عشق بازی کرتی ہوں، سو مجھے ایک عدد شوہر درکار ہے۔ میں سال بھر ڈچز تولیما ٹیکو رہی ہوں اور وہ میری زندگی کا سب سے زیادہ اکتا دینے والا سال تھا، حالانکہ اس بڈھے کے ساتھ میں کبھی ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رہی۔ میں کبھی ان کے کسی قلعے یا کھنڈر یا چوہے کے بل میں قدم نہیں رکھوں گی۔ خدا کرے وہ سانپوں سے بھر جائیں! آج کے بعد سے میں یہیں رہوں گی جہاں میرا بچپن گزرا ہے۔ جب تک میرا جی چاہے گا میں

یہیں رہوں گی۔ پھر میں چل دوں گی۔ آخر میں بیوہ ہوں، جو چاہوں کر سکتی ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ وہی کیا ہے جو چاہا ہے۔ تو لیمانیکو سے شادی بھی اس لیے کی کہ اس سے شادی کرنا مجھے راس تھا۔ یہ درست نہیں ہے کہ مجھے اس پر مجبور کیا گیا۔ وہ لوگ ہر قیمت پر میری شادی کر دینا چاہتے تھے اور یوں، سب سے نحیف امیدوار جو مجھے مل سکتا تھا، میں نے چن لیا۔ اس طرح میں جلدی بیوہ ہو جاؤں گی، میں نے سوچا، اور اب دیکھ لو، میں بیوہ ہوں۔''

اس اطلاع اور فیصلہ کن بیانات کے بر فشار سے نیم حواس باختہ کوسیمو وہاں بیٹھا تھا اور ویولا ہمیشہ سے زیادہ دور تھی: عشق بازی کرنے والی، بیوہ، ڈچز، وہ ایک ایسی دنیا کا حصہ تھی جو دسترس سے باہر تھی، کوسیمو فقط یہ کہہ پایا، ''اور اب تم کس کے ساتھ عشق بازی کرتی ہو؟''

''لو، تم تو حسد کرنے لگے! ہشیار رہنا، میں تمھیں کبھی حسد نہیں کرنے دوں گی،'' ویولا نے کہا۔

کوسیمو نے اس تکرار سے انگیخت پایا ہوا حسد کا ایک شعلہ یقیناً محسوس کیا، مگر فوراً ہی سوچا، کیا؟ حسد؟ اس نے یہ کیوں تسلیم کیا کہ میں اس کے سلسلے میں حسد بھی کر سکتا ہوں؟ یہ کیوں کہا، ''میں تمھیں کبھی حسد نہیں کرنے دوں گی؟'' اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے خیال میں ہم...

پھر، تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ، اس نے ویولا کو بتانے، اس سے پوچھنے اور اس کا جواب سننے کی ایک شدید خواہش محسوس کی، مگر اس کی بجائے یہ ویولا ہی تھی جس نے روکھے لہجے میں پوچھا، ''اب مجھے اپنے بارے میں بتاؤ، تم نے کیا کیا؟''

''اوہ، میں نے بہت سے کام کیے ہیں،'' اس نے بات شروع کی، ''میں نے شکار کیا ہے، جنگلی سؤر تک کا، لیکن زیادہ تر لومڑیوں، خرگوشوں، چکوروں اور ظاہر ہے، ترغوں اور کستوروں کا، اور ہاں، قزاقوں کا — ترک قزاقوں کا۔ ہم نے ایک بڑی جنگ لڑی۔ اس میں میرے چچا مارے گئے۔ اور میں نے بہت ساری کتابیں پڑھی ہیں، اپنے لیے اور اپنے ایک ڈاکو دوست کے لیے جسے پھانسی چڑھا دیا گیا۔ میرے پاس دیدرو کا پورا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ میں نے اسے خط بھی لکھا اور اس نے مجھے جواب دیا، پیرس سے۔ اور بھی بہت سارے کام کیے ہیں، فصلیں اُگائی ہیں، ایک جنگل کو آگ سے بچایا ہے۔''

''اور تم ہمیشہ مجھے چاہو گے، مکمل طور پر، ہر شے سے زیادہ؟ اور میرے لیے سب کچھ کرو گے؟''

اس کے اس سوال پر کوسیمو نے، اپنے دل پر ایک گرفت کے ساتھ جواب دیا، ''ہاں۔''

Scanned with CamScanner

''تم ایسے شخص ہو جو صرف میری خاطر درختوں پر رہے ہو، مجھے پیار کرنا سکھنے کے لیے...؟''

''ہاں... ہاں...''

''مجھے چومو۔''

کوسیمو نے تنے کے سہارے اسے بھینچا، اور اسے بوسہ دیا۔ اپنا چہرہ اٹھاتے ہوئے اسے ویولا کے حسن کا احساس ہوا گویا اس حسن کو اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ ''کس قدر حسین ہو تم...''

''تمھارے لیے...'' اس نے اپنے سفید بلاؤز کے بٹن کھول دیے۔ اس کے پستان نوخیز اور سرِ پستان گلابی تھے۔ کوسیمو نے اپنے ہونٹوں سے انھیں صرف مس ہی کیا تھا کہ ویولا شاخوں پر سے پھسلتی ہوئی، گویا کہ محوِ پرواز ہو، اس سے دور ہوگئی۔ افتاں و خیزاں کوسیمو اس کے عقب میں تھا اور ویولا کی سیاہ اسکرٹ دائماً اس کے چہرے پر تھی۔

''لیکن تم مجھے لے کہاں جا رہے ہو؟'' ویولا نے پوچھا، جیسے وہ نہیں بلکہ کوسیمو اسے راستہ دکھا رہا ہو۔

''اس طرف؛'' کوسیمو نے کہا اور اس کی رہنمائی کرنے لگا۔ شاخوں کی ہر گزرگاہ پر وہ اس کا ہاتھ یا اس کی کمر تھامتا اور اسے راستہ دکھاتا۔

''اس طرف؛'' اور یوں وہ ایک چٹان سے باہر کو نکلے ہوئے بعض مخصوص زیتون کے درختوں تک چلے گئے۔ ان درختوں کی چوٹیوں سے اُدھر سمندر تھا، جس کے ایک ٹکڑے کی وہ اب تک محض ایک جھلک ہی دیکھ پائے تھے اور وہ ٹکڑا ابھی پتوں اور شاخوں سے نیم پوشیدہ تھا۔ لیکن اب اچانک انھوں نے پُرسکون اور شفاف آسمان کی طرح وسیع سمندر کو اپنے مقابل پایا۔ افق عریض و بلند تھا اور سمندر پھیلا ہوا، اور کسی بادباں کے بغیر، عریاں تھا، اور وہ لہروں کے ہلکوروں کو جو مشکل ہی سے قابلِ محسوس تھے، گن سکتے تھے۔ محض ایک ہلکی سی سرسراہٹ، جیسے کوئی آہ ہو، ساحل کے سنگ ریزوں پر دوڑ رہی تھی۔

نیم خیرہ نگاہیں لیے کوسیمو اور ویولا پتوں کے گہرے سبز سائے میں پلٹ گئے۔ ''اس طرف۔''

اخروٹ کے ایک درخت پر تنے کے دوشاخے میں کلھاڑے کے ایک پرانے گھاؤ سے بنی ہوئی ایک کھوہ تھی، اور یہ کوسیمو کی پناہ گاہوں میں سے ایک تھی۔ اس پر ریچھ کی کھال بچھی ہوئی تھی اور اس کے آس پاس ایک صراحی، ایک آدھ اوزار اور ایک پیالہ تھا۔

Scanned with CamScanner

ویولا بے صبری سے ریچھ کی کھال پر دراز ہوگئی۔ ''کیا تم دوسری عورتوں کو بھی یہاں لاتے ہو؟''
اس نے تامل کیا۔ اور ویولا نے کہا، ''اگر نہیں لائے تو تم کیا مرد ہوے!''
''ہاں... ایک دو...''
اس نے کوسیمو کے منھ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ''اس طرح میرا انتظار کیا ہے تم نے؟''
کوسیمو نے اپنے سرخ رخسار پر اپنا ہاتھ پھرایا اور کہنے کے لیے کوئی لفظ نہ سوچ سکا۔ لیکن اب وہ دوبارہ اچھے موڈ میں نظر آرہی تھی۔ ''کیسی تھیں وہ؟ مجھے بتاؤ، وہ کیسی تھیں؟''
''تم جیسی نہیں، ویولا، تم جیسی نہیں...''
''تم کیسے جانتے ہو کہ میں کیسی ہوں، کیسے جانتے ہو؟''
اب وہ نرم پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کی ان اچانک تبدیلیوں پر کوسیمو کی حیرانی غیر مختتم تھی۔ وہ اس کے نزدیک ہوگیا۔ ویولا تمام سونا اور شہد تھی۔
''کہو...''
''کہو...''

وہ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔ وہ اسے جان گیا، اور یوں اپنے آپ کو، کیونکہ حقیقت میں اس نے اپنے آپ کو کبھی نہیں جانا تھا۔ اور وہ اسے جان گئی اور یوں اپنے آپ کو، کیونکہ اپنے آپ کو جانتی تو وہ ہمیشہ سے تھی لیکن اب سے پہلے اس کے ادراک کی اہل نہ تھی۔

۲۲

پہلی 'زیارت' جو انھوں نے کی، وہ اس درخت کی تھی جس کی چھال پر ایک گہرے کٹاؤ میں، جو اب اتنا کہنہ اور بدہیئت تھا کہ انسانی ہاتھوں کا کام نہیں لگتا تھا، بڑے حروف میں کوسیمو، ویولا، اور نیچے اوتیمو ماسیمو کے نام کندہ تھے۔
''یہاں، اوپر؟ کس نے لکھا؟ کب؟''
''میں نے، تب۔''

Scanned with CamScanner

ویولا متاثر ہوئی۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے اوتیموماسیمو کے الفاظ کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا کتا۔تمھارا کتا ہے۔بجو کتا ہے۔''

''ترکارت؟''

''میں نے اس کا نام اوتیموماسیمو رکھا ہے۔''

''ترکارت! میں اس کے لیے کتنا روئی ہوں، جب چلتے وقت مجھے یہ احساس ہوا کہ اسے گاڑی میں نہیں رکھا گیا ہے!...ارے، مجھے تمھارے دوبارہ نہ ملنے کی پروا نہیں تھی، لیکن کتے کو کھو کر میں قطعاً مایوس تھی۔''

''اگر یہ کتا نہ ہوتا تو میں تمھیں دوبارہ نہیں پا سکتا تھا! اس نے ہوا میں سونگھ لیا کہ تم کہیں نزدیک ہو، اور جب تک تمھیں ڈھونڈ نہ لیا، چین سے نہیں بیٹھا۔''

''میں نے جونہی اسے شکارگاہ کے بنگلے میں آتا دیکھا، فوراً پہچان لیا۔ بری طرح ہانپ رہا تھا بے چارہ...اور دوسروں نے کہا، 'یہ آیا کہاں سے ہے؟' میں نے نیچے جھک کر اس کا رنگ اور نشان دیکھے۔ارے یہ تو ترکارت ہے! بجو کتا، جو بچپن میں، اومبروسا میں میرے پاس تھا!''

کوسیمو ہنس پڑا۔ ویولا نے اچانک برا سا منھ بنایا۔ ''اوتیموماسیمو! کیسا واہیات نام ہے! ایسے واہیات نام کہاں سے ملتے ہیں تمھیں؟'' اور کوسیمو کے چہرے پر ملال چھا گیا۔

لیکن اوتیموماسیمو کے لیے اب کوئی پریشانی نہ تھی جو اس کی مسرت کو برباد کرتی۔ اس عمر رسیدہ کتے کا دل جو دو مالکوں کے درمیان منقسم رہا تھا، مارکوئیزا ویولا کو شکارگاہ کے کناروں کی طرف اس دیودار کے درخت کی جانب جہاں کوسیمو کی نشست تھی، روزانہ کوشش سے متوجہ کرانے کے بعد، بالآخر چین پا گیا تھا۔ وہ مارکوئیزا کو اسکرٹ سے پکڑ کر کھینچتا یا اس کی کوئی چیز اٹھا کر میدان کی طرف بھاگ نکلتا تا کہ وہ اس کے پیچھے آئے۔ مارکوئیزا اس پر چلا کر کہتی، ''لیکن تم کیا چاہتے ہو؟ مجھے کہاں گھسیٹے لیے جا رہے ہو؟ کیسے پاگل کر دینے والے کتے سے پالا پڑا ہے!''

لیکن بجو کتے کو دیکھ کر اس کے بچپن کی یادیں اور اومبروسا کی ہڑک پھر سے لوٹ آئی تھی، اور اس نے نوابی بنگلے سے رخصت ہونے اور عجیب وغریب نباتات والی پرانی کوٹھی میں واپسی کی تیاریاں فوراً

شروع کر دی تھیں۔

ویولا لوٹ آئی تھی۔ کوسیمو کے لیے اب اس کی زندگی کا بہترین دور شروع ہوا، اور اس کے لیے بھی، جو دیہی علاقے میں اپنا سفید گھوڑا سرپٹ دوڑاتی پھرتی، اور جب اس کی نظر شاخوں اور آسمان کے درمیان بیرن پر پڑتی، وہ گھوڑے سے اتر جاتی، اور ترچھے درختوں اور شاخوں پر چڑھ جاتی، جن کے سلسلے میں وہ تقریباً اتنی ہی ماہر ہو گئی تھی جتنا کوسیمو، جو خواہ کہیں بھی ہو وہ اس تک پہنچ سکتی تھی۔

''اف، ویولا، میں نہیں جانتا! میں نہیں جانتا کہ اب کس اونچائی پر جاؤں...''

''میری اونچائی پر...'' ویولا چپکے سے کہتی، اور وہ اپنے کو تقریباً دیوانگی میں محسوس کرتا۔

محبت اس کے لیے ایک دلیرانہ ریاضت تھی، جس کا لطف، جرأت اور فراخ دلی کی آزمائشوں، اپنے آپ کو وقف کر دینے اور اپنے وجود کی تمام تر صلاحیتوں کو بروے کار لانے میں خلط ملط تھا۔ ان کی دنیا درختوں کی دنیا تھی، پیچیدہ، گرہ دار اور غیر اثر پذیر۔

''وہاں!'' وہ شاخوں میں ایک بلند دوشاخے کی طرف اشارہ کرتے ہوے اعلان کرتی اور اس تک پہنچنے کے لیے وہ اکٹھے چل پڑتے۔ یوں ان کے درمیان بازی گری کا ایک مقابلہ شروع ہو جاتا جو نئی ہم آغوشیوں پر منتج ہوتا۔ اپنے آپ کو شاخوں کے سہارے سنبھالے یا شاخوں پر تھامے ہوے وہ خلا میں مباشرت کرتے۔ وہ تقریباً ہوا میں اڑتی ہوئی اپنے آپ کو اس پر گرا دیتی۔

گو محبت میں ویولا کی ثابت قدمی کوسیمو کے استقلال سے مطابقت رکھتی تھی، مگر بعض اوقات اس سے ٹکرا بھی جاتی۔ کوسیمو استفسارات، نفیس چونچلوں اور بے لگام کج رویوں سے احتراز کرتا تھا۔ محبت میں کوئی بات، جو فطری نہ ہوتی اسے خوش نہ کرتی تھی۔ فضا رپبلک کی خوبیوں سے مملو تھی؛ وہ زمانہ آنے کو تھا جسے بیک وقت اخلاق باختہ اور سخت گیر ہونا تھا۔ کوسیمو، جو ناشکیب عاشق تھا، راضی بہ رضا، تارک الدنیا اور مذہب پرست بھی تھا۔ گو محبت میں وہ ہمیشہ مسرت کی تلاش میں رہتا مگر محض عیاش کبھی نہ بنا۔ وہ اس مقام تک آ گیا تھا جہاں بوسوں، اختلاط، زبان کے کھیل، غرضیکہ فطرت کی افادیت کو بدلنے یا دھندلانے والی ہر چیز سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ یہ ویولا تھی جس نے اسے اس کی بھرپور صورت میں آشکار کیا۔ اور ویولا کے ساتھ وہ ماہرین دینیات کی بتائی ہوئی پس از محبت اداسی سے کبھی آشنا نہ ہوا۔ بلکہ اس موضوع پر اس نے روسو کو ایک فلسفیانہ خط بھی لکھا جس نے، غالباً اس سے پراگندہ

Scanned with CamScanner

ہو کر، جواب نہیں دیا۔

لیکن ویولا ایک شائستہ، راز دار، من موجی عورت بھی تھی، جو ہمہ وقت اپنے جسم و روح کی خواہشوں سے مغلوب تھی۔ کوسیمو کی محبت نے اس کے جسمانی تقاضوں کی تکمیل تو کی لیکن اس کا تصور نا آسودہ ہی رہا۔ اس کمی نے مخاصمتوں اور مبہم آزردگیوں کو جنم دیا۔ لیکن ان کی زندگی اور گرد و پیش کی دنیا اتنی متنوع تھی کہ یہ صورتِ حال زیادہ دن نہیں رہی۔

جب وہ تھک جاتے تو پتوں کے دبیز ازدحام میں واقع اپنی پناہ گاہوں میں لوٹ جاتے، جوان کے جسموں کو لپیٹے ہوئے پتوں کی طرح چھپا لینے والے جھولنے، یا ہلکی ہوا میں پھڑ پھڑاتے پردوں والے آویزاں شامیانے، یا پروں کے بچھونے ہوتے تھے۔ ایسی اختراعوں میں دونا ویولا حد درجہ باصلاحیت تھی۔ وہ چاہے جہاں بھی ہوتی، اسے اپنے اطراف آسائش، تکلفات اور مفصل آرام پیدا کرنے میں ملکہ حاصل تھا اور یہ سب کچھ جو ظاہری طور پر مفصل ہوتا، وہ معجز نما سہولت سے مکمل کر لیتی، کیونکہ جو کچھ وہ چاہتی اسے فوراً اور ہر قیمت پر پورا کیا جاتا۔

ان کی فضائی خلوت گاہوں پر لال چڑیاں چہچہانے کو بسیرا کر لیتیں، اور پردوں کے درمیان تتلیوں کے جوڑے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے پرافشانی کرتے۔ گرمیوں کی سہ پہروں میں، جب ان چاہنے والوں کو پہلو بہ پہلو نیند آ لیتی تو کوئی گلہری کترنے کو کوئی چیز ڈھونڈتی ہوئی آ نکلتی اور اپنی نازک دُم سے ان کے چہروں کو سہلاتی یا کسی کے انگوٹھے میں اپنے دانت گڑو دیتی۔ تب وہ پردوں کو زیادہ احتیاط سے بند کر لیتے، لیکن شجری چوہوں کے ایک خاندان نے شامیانے کی چھت کترنی شروع کر دی اور ایک بار بہت سے چوہے ان کے سروں پر آ گرے۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ایک دوسرے کو اپنی زندگیوں کے بارے میں بتاتے ہوئے، باہم سوالات کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو دریافت کر رہے تھے۔

"کیا تم نے اپنے کو تنہا محسوس کیا؟"

"میرے پاس تم نہیں تھیں۔"

"باقی دنیا کے سامنے تنہا؟"

"نہیں۔ کیوں؟ دوسرے لوگوں سے میرا رابطہ ہمیشہ رہا ہے۔ میں نے پھل توڑے ہیں،

درختوں کی کاٹ چھانٹ کی ہے، ایپے کے ساتھ فلسفے کا مطالعہ کیا ہے، قزاقوں سے لڑا ہوں۔ کیا ہر کوئی یہی کچھ نہیں کرتا؟''

''اس طرح کے فقط ایک تم ہو۔ اسی لیے میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

لیکن بیرن نے ابھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ ویولا اس کی کون سی بات مانے گی اور کون سی نہیں۔ بعض اوقات محض کوئی بیچ بات، کوئی لفظ یا اس کا کوئی لہجہ مارکویزا کے غضب کو دعوت دینے کے لیے کافی ہوتا۔

مثال کے طور پر وہ کہہ سکتا تھا: ''جیان دائی بروگی کے ساتھ میں ناولیں پڑھا کرتا تھا، کوا لیئے کے ساتھ میں آب پاشی کے منصوبے بناتا تھا...''

''اور میرے ساتھ؟''

''تمھارے ساتھ میں مباشرت کرتا ہوں۔ پھل توڑنے یا درخت چھانٹنے کی طرح...''

وہ خاموش اور بے حس و حرکت ہو جاتی۔ کوسیمو کو ایک دم احساس ہوتا کہ اس نے مارکویزا کے غصے کو جگا دیا ہے، جس کی نظریں یک بارگی برف کی طرح یخ ہو جاتیں۔

''کیا ہوا، ویولا، میں نے کیا کہہ دیا؟''

وہ بہت دور تھی، گویا دیکھنے یا سننے سے قاصر ہو، کوسیمو سے کوسوں دور اور اس کا چہرہ مرمر کی طرح تھا۔

''نہیں، ویولا، کیا ہوا؟ سنو تو سہی...''

ویولا، اس کا سہارا لیے بغیر، پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور درخت سے نیچے اترنے لگی۔

کوسیمو ابھی تک نہیں سمجھا تھا کہ اس کی کیا غلطی ہو سکتی ہے، اسے یہ سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا، غالباً اس کے بارے میں قطعاً سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا، سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا، اپنی معصومیت کا اعلان کرنا ہی بہتر تھا۔ ''نہیں، نہیں، تم سمجھیں نہیں! ویولا، سنو...''

وہ ایک نچلی شاخ تک اس کے پیچھے آیا۔ ''ویولا، مت جاؤ! خدا کے لیے مت جاؤ! اس طرح نہیں، ویولا...''

اس بار وہ بولی لیکن گھوڑے سے مخاطب ہوئی جس کے نزدیک پہنچ کر وہ لگام سنبھال چکی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

سوار ہوئی اور روانہ ہو گئی۔

کوسیمو کے ہاتھ سے امید کا دامن چھوٹنے لگا۔ وہ ایک درخت سے دوسرے پر چھلانگ لگانے لگا، ''نہیں، ویولا، خدا کے لیے رک جاؤ، ویولا!''

وہ گھوڑا دوڑا کر دور جا چکی تھی۔ کوسیمو شاخوں پر اس کا تعاقب کر رہا تھا، ''خدا کے لیے ویولا، مجھے تم سے محبت ہے!'' لیکن ویولا اوجھل ہو چکی تھی۔ خطرناک طریقے سے چھلانگیں لگاتے ہوئے وہ اپنے کو نامعلوم شاخوں پر پٹخ رہا تھا۔ ''ویولا! ویولا!''

جب اسے ویولا کو کھو دینے کا یقین ہو گیا اور وہ اپنی سسکیاں قابو میں نہ رکھ سکا تو اچانک گھوڑے کو دلکی چلاتی ہوئی وہ دوبارہ نمودار ہوئی۔ وہ اپنی نظریں نہیں اٹھا رہی تھی۔

''دیکھو، خدا کے لیے دیکھو، ویولا۔ دیکھو میں کیا کر رہا ہوں!'' اور وہ اپنا ننگا سر ایک تنے سے ٹکرانے لگا (جو واقعی بہت سخت تھا)۔

ویولا نے اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ دور جا چکی تھی۔

کوسیمو درختوں کے درمیان ٹیڑھا میڑھا ہوتا ہوا، اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔

''ویولا! میں کچھ بھی کر گزروں گا!'' اور اس نے ٹانگوں سے ایک شاخ کو پکڑتے ہوئے اپنے آپ کو سر کے بل خلا میں پھینک دیا۔ اور اپنے سر اور چہرے پر گھونسے برسانے لگا۔ پھر وہ تخریب کے دورے سے مغلوب ہو کر شاخیں توڑنے لگا اور چند ہی ثانیوں میں ایک گھنے بوقیدار کی جگہ محض ننگی چھال رہ گئی گویا کہ ژالہ باری کا کوئی طوفان گزرا ہو۔

لیکن اپنے آپ کو ہلاک کر لینے کی دھمکی اس نے کبھی نہیں دی۔ درحقیقت اس نے کسی بات کی بھی دھمکی کبھی نہیں دی۔ جذباتی سودے بازی اس کی سرشت میں نہیں تھی۔ اس نے جو کرنا چاہا سو کیا اور کرتے ہوئے اس کا اعلان کیا، اس سے قبل نہیں۔

پھر اچانک، اپنے غصے کی طرح ناپیش بیں، دونا ویولا دوبارہ نمودار ہوئی۔ کوسیمو کی ساری حماقتوں میں سے، جو کبھی ویولا تک رسائی حاصل نہ کرتی نظر آتی تھیں، اچانک ایک حرکت نے اسے ترحم اور محبت سے بھر دیا۔ ''نہیں، کوسیمو، میری جان، رک جاؤ!'' اور وہ اپنی زین سے کود کر ایک تنے پر چڑھنے کو دوڑ پڑی۔ کوسیمو کے بازو اسے اوپر اٹھانے کو تیار تھے۔

Scanned with CamScanner

محبت نے ایک تندی کے ساتھ، جو مخاصمت کے مساوی تھی، پھر سے کام سنبھال لیا۔ حقیقت میں یہ ایک ہی بات تھی، لیکن کوسیمو نے اسے سمجھا نہیں تھا۔

''تم مجھے اذیت کیوں دیتی ہو؟''

''کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔''

اب ناراض ہونے کی باری کوسیمو کی تھی۔ ''نہیں، نہیں، تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں! محبت کرنے والے مسرت چاہتے ہیں، کرب نہیں!''

''محبت کرنے والے صرف محبت چاہتے ہیں، چاہے وہ کرب کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔''

''پھر تو تم مجھے جان بوجھ کر اذیت دے رہی ہو۔''

''ہاں یہ یقین کرنے کے لیے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔''

بیرن کا فلسفہ یہاں جواب دے گیا۔ ''کرب روح کی ایک منفی حالت ہے۔''

''محبت سب کچھ ہے۔''

کرب کی ہمیشہ مزاحمت کی جانی چاہیے۔''

محبت کسی بات سے انکار نہیں کرتی۔''

''بعض باتیں میں کبھی نہیں مانوں گا۔''

''تم مانو گے، بات یہ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور اس لیے اذیت جھیلتے ہو۔''

کوسیمو کی مایوسی کے ہیجانوں کی طرح اس کی ناقابلِ ضبط مسرت کے غل غپاڑے بھی پُرشور ہوتے تھے۔ بعض اوقات اس کی خوشی ایسے مقام پر پہنچ جاتی کہ اسے ویولا کو چھوڑ کر کودتے پھاندتے شور مچاتے دنیا کے آگے اس کی حیرتوں کا اعلان کرنے جانا پڑتا۔

''میں دنیا کی سب سے حیرت انگیز عورت سے محبت کرتا ہوں۔''

اومبروسا میں بنچوں پر بیٹھنے والے کاہل یا بڑے تجربہ کار بوڑھے اس کے اس طرح اچانک آدھمکنے کے عادی سے ہو گئے تھے۔ وہ دیودار کے درختوں میں سے لپکتا ہوا پُرجوش انداز سے اشعار پڑھتا ہوا آتا:

جمیکا کے جزیرے پر

سحر تک شام سے لے کر
مرے پہلو میں ہو دلبر
میں چاہوں اس سے کیا بڑھ کر

یا:

ہے وہ مرغزار ایسا جہاں گھاس ہے سنہری
مجھے لے چلو وہیں تم کہ یہاں تو مر چلا میں

اور پھر غائب ہو جاتا۔

کلاسیکی اور جدید زبانوں کا اس کا مطالعہ، کتنا ہی کم جاری کیوں نہ رہا ہو، اپنے جذبات کے اس پُرخروش اظہار میں خود کو ڈبونے کے لیے کافی تھا۔ وہ شدید جذبات سے جتنا زیادہ انگیخت ہوتا، اس کی زبان اتنی ہی مہمل ہو جاتی۔ یہاں کے لوگوں کو یاد ہے کہ ایک دفعہ پیٹرن سینٹ کے تہوار پر جب اومبروسا کے لوگ شجرِ فراوانی، علم چوب اور پھولوں کی لڑیوں کے گرد چوک میں جمع تھے، تو بیرن کس طرح ایک چنار کے درخت کی چوٹی پر نمودار ہوا، اور اپنی ایک اس جست کے ذریعے، جو صرف اس کی بازی گرانہ چستی ہی پیدا کر سکتی تھی، شجرِ فراوانی پر کود کر، اس کی چوٹی تک جا پہنچا اور چلّا کر کہا، ''زندہ باد اے حسیں، زہرہ سرین۔'' پھر وہ چوب پر سے پھسلتا ہوا تقریباً زمین تک آ کر ٹھہرا اور اپنا راستہ ٹٹولتا ہوا دوبارہ چوٹی تک جا پہنچا، آرائش میں سے ایک گول گلابی پنیر کا ٹکڑا اچھٹا، اور اپنی ایک اور مخصوص جست کے ذریعے چنار کے درخت پر لوٹ کر، اومبروسا کے لوگوں کو دنگ چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ان پُرجوش کیفیات سے زیادہ کوئی شے مارکویزا کو خوش نہیں کرتی تھی، اور کوسیمو کو نوازنے کے لیے اسے محبت کے ایسے اعلانات پر اکساتیں جو خود ان کیفیات سے بھی شدید ہوتے۔ جب اومبروسائی اسے لگامیں ڈھیلی چھوڑے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتے، اپنا چہرہ اس کی سفید ایال میں تقریباً چھپائے، دیکھتے تو جان لیتے کہ وہ بیرن سے ملنے کو دوڑی جا رہی ہے۔ اس کے اندازِ شہسواری سے بھی محبت کی قوت کا اظہار ہوتا تھا، لیکن یہاں کوسیمو اس کا پیچھا کرنے سے قاصر تھا، اور اس کا شوقِ شہسواری، حالانکہ وہ اسے بہت سراہتا تھا، کوسیمو کے حسد اور کینے کی ایک پوشیدہ وجہ تھی، کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ ویولا اس کے مقابلے میں ایک وسیع تر دنیا کے تسلط میں ہے اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اسے صرف اپنے تک اور اپنی

مملکت کی حدود تک محدود رکھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو پائے گا۔ دوسری طرف مارکوئیزا، بیک وقت شیدائی اور شہسوار ہونے کی اپنی معذوری کا غالباً دکھ سہہ رہی تھی۔ وہ بار بار اس مبہم ضرورت سے مغلوب ہوتی کہ اس کی اور کوسیمو کی محبت ایسی محبت بن جائے جو گھوڑے کی پشت پر ہو۔ اسے ہر پل یہ احساس تھا، کہ اب درختوں پر دوڑنا اس کے لیے کافی نہیں ہے، اور یہ آرزو تھی کہ اپنے راکب کے پیچھے پر بیٹھ کر پوری رفتار سے دوڑتی چلی جائے۔

اور حقیقت میں اس کا گھوڑا دیہی علاقے کی تمام ڈھلانوں اور نشیبوں میں دوڑنے سے چکارے کی طرح پھرتیلا ہو رہا تھا، اور اب ویولا اسے بعض درختوں، مثال کے طور پر خمیدہ تنوں والے پرانے زیتونوں پر چڑھنے کو اکسانے لگی تھی۔ بعض اوقات گھوڑا شاخوں میں واقع پہلے دوشاخے تک پہنچ جاتا اور ویولا اسے زمین پر نہ باندھنے کی عادی سی ہوگئی تھی۔ وہ اسے اوپر زیتون میں باندھتی تھی۔ گھوڑے سے اتر کر وہ اسے پتے اور کونپلیں چبانے کے لیے چھوڑ دیتی۔

اور یوں جب زیتونوں کے جھنڈ سے گزرتے اور متجسس نظریں اٹھاتے کسی بڈھے گپی نے بیرن اور مارکوئیزا کو ایک دوسرے کی بانہوں میں دیکھا اور بستی کے لوگوں کو یہ بھی بتایا کہ اوپر ایک شاخ پر سفید گھوڑا بھی تھا، تو اسے سودائی سمجھا گیا اور کسی نے بھی اس کا یقین نہ کیا اور اس بار، ایک بار پھر، چاہنے والوں کا راز محفوظ رہا۔

۲۳

یہ آخری کہانی ظاہر کرتی ہے کہ اومبروسا کے لوگ، جو قبل ازیں میرے بھائی کی حیاتِ عشق کے بارے میں افواہوں سے پُر تھے، اب اس تعشق کے مقابل، جو عین ان کے سروں پر شدت کے ساتھ جاری تھا، ایک باوقار سرد مہری قائم رکھے ہوئے تھے گویا کہ ان کا سامنا اپنے سے بالاتر کسی شے سے ہو رہا ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ مارکوئیزا کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی نہ کرتے ہوں، لیکن زیادہ تر اس کا تعلق خارجی پہلوؤں سے تھا، جیسے کہ خطرناک رفتار سے گھوڑے کو دوڑانا (''ایسی رفتار سے وہ کہاں جا سکتی ہے؟'') اور درختوں کی پھننگوں پر متواتر فرنیچر چڑھانا۔ ان میں پہلے ہی ان سب باتوں کو اشرافیہ کا ایک انداز اور

ان کا ایک عجوبہ سمجھنے کا رجحان تھا۔("ان دنوں سب لوگ درختوں پر ہیں، عورتیں، مرد۔ ان کا اگلا اقدام کیا ہوگا؟") درحقیقت، وہ دور آنے کو تھا جسے زیادہ متحمل، مگر ساتھ ہی زیادہ منافقانہ بھی ہونا تھا۔

اب بیرن چوک میں گل خطمی کے درختوں پر کبھی کبھار ہی ظاہر ہوتا، اور جب وہ نظر آتا تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ ویولا چلی گئی ہے۔ کیونکہ ویولا اپنی جائیداد کا انتظام دیکھنے کے لیے، جو سارے یورپ میں بکھری ہوئی تھی، بعض اوقات مہینوں دور رہتی، حالانکہ اس کے یہ سفر ان کے رشتے میں پڑنے والی دراڑوں سے مطابقت رکھتے تھے، جب وہ کوسیمو سے اس بات پر آرزدہ ہوتی کہ وہ محبت کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر سمجھنے سے قاصر ہے۔ یہ نہیں کہ ویولا اسی ذہنی حالت میں روانہ ہوتی۔ وہ ہمیشہ اس کے روانہ ہونے سے پہلے صلح کرنے میں کامیاب رہتے حالانکہ اسے شبہ رہتا کہ ویولا نے یہ خاص سفر کرنے کا فیصلہ یوں کیا ہے کہ وہ اس سے اکتا گئی ہے، اور وہ اسے جانے سے روک نہیں سکا؛ شاید وہ اس سے علیحدہ ہونا شروع کر رہی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس سفر میں پیش آنے والا کوئی واقعہ یا غور و فکر کا کوئی لمحہ اس کے واپس نہ آنے کا فیصلہ کر دے۔ سو میرا بھائی ایک عالم تشویش میں رہتا۔ وہ اس زندگی کی طرف لوٹنے کی کوشش کرتا جس کا وہ ویولا کے ملنے سے پہلے عادی رہا تھا: شکار کرنا اور مچھلیاں پکڑنا چاہتا، کھیتوں میں ہوتے کاموں کو سمجھنا چاہتا، اپنی پڑھائی کرنا چاہتا، چوک میں ہونے والی گپ شپ میں حصہ لینا چاہتا، گویا کہ اس نے کبھی کچھ اور نہ کیا ہو (اپنے آپ کو کسی دوسرے کے زیر اثر کبھی تسلیم نہ کرنے کی نوجوانی کی ہٹیلی نخوت اس میں برقرار رہتی تھی)۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس بات پر اپنے آپ کو مبارک باد دیتا کہ محبت اسے کتنا کچھ دے رہی ہے، یہ مستعدی، یہ فخر؛ لیکن دوسری طرف وہ محسوس کرتا کہ بہت ساری باتیں اب اس کے لیے بے معنی ہوگئی ہیں، یہ کہ ویولا کے بغیر زندگی میں کوئی مزہ نہیں ہے، یہ کہ اس کے خیالات ہمیشہ ویولا کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ ویولا کی موجودگی کے بگولے سے دور، وہ ذہن کی دانش مندانہ تنظیم میں جذبوں اور مسرتوں پر پھر سے قابو پانے کی جس قدر بھی کوشش کرتا، اتنی ہی شدت سے ویولا کی غیر موجودگی کا خلا یا اس کی واپسی کے لیے بے کلی محسوس کرتا۔ درحقیقت اس کی محبت بالکل ویسی ہی تھی جیسی ویولا چاہتی تھی، ویسی نہیں جیسی وہ ظاہر کرتا تھا۔ یہ ہمیشہ عورت ہی تھی جو فاصلے سے بھی فتح یاب ہوتی اور کوسیمو نہ چاہنے کے باوجود انجام کار اس سے لطف اندوز ہوتا۔

پھر اچانک مارکوئیز الوٹ آتی۔ محبت کا موسم درختوں میں پھر سے آغاز ہوتا، لیکن ساتھ ہی

بدگمانی کی رت بھی۔ ویولا کہاں گئی تھی؟ کیا کرتی رہی تھی؟ کوسیمو کو یہ جاننے کی حسرت تھی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ جانے وہ اس کے سوالوں کا کیا جواب دے۔ وہ کنایوں میں جواب دیتی اور ہر کنایہ اس کے شبہات کو مزید ابھارتا، اور وہ محسوس کرتا کہ ہر چند وہ اسے ستانے کے لیے جان بوجھ کر اس انداز میں جواب دے رہی ہے، تاہم یہ سب باتیں بالکل درست بھی ہو سکتی ہیں۔ ان بے یقینیوں میں، وہ ایک لمحے اپنی بدگمانی کو چھپاتا تو دوسرے لمحے بے قابو ہو کر پھٹ پڑتا۔ ویولا کبھی یکساں انداز میں جواب نہیں دیتی تھی، اس کے جواب ہمیشہ مختلف ہوتے تھے، ہمیشہ ناپیش بیں۔ ایک لمحے کوسیمو سوچتا کہ وہ ہمیشہ سے زیادہ اس سے وابستہ ہے، دوسرے لمحے اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس کا احساس جگانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوگا۔

مارکیزا اپنی سیاحت کے دوران کیا کرتی تھی، ہم اومبروسا والے، بڑے شہروں اور ان کی گپ شپ سے دور ہونے کے سبب یہ جاننے سے قاصر تھے۔ لیکن اسی زمانے میں مجھے دوسری بار پیرس جانے کا اتفاق ہوا۔ میرا یہ سفر لیموؤں کے کچھ ٹھیکوں کے سلسلے میں تھا، کہ اشرافیہ کے بہت سے لوگ تجارت کو اپنا رہے تھے، اور میں اولیں لوگوں میں شامل تھا۔

ایک شام، پیرس کی ایک درخشاں ترین آرائش گاہ میں دوناویولا سے میری ملاقات ہوئی۔ اس کا سرپوش اتنا شاندار اور اس کی عبا اتنی بیش قیمت تھی کہ اگر میں نے اسے فوراً پہچان لیا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ ایسی عورت تھی جسے کسی اور سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا تھا، حالانکہ میں پہلے تو اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ اس نے بے اعتنائی سے میرا خیر مقدم کیا، لیکن جلد ہی مجھے ایک طرف لے جانے کا راستہ نکال لیا اور ایک سوال اور دوسرے کے درمیان کسی جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھنے لگی، ''تمھارے پاس اپنے بھائی کی کوئی خبر ہے؟ کیا تم جلدی اومبروسا واپس پہنچو گے؟ لو، اسے میری یاد دلانے کو یہ دے دینا۔'' اور اس نے اپنے سینے سے ایک ریشمی رومال نکالتے ہوئے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر اس نے تیزی سے اپنے آپ کو چاہنے والوں کے مجمعے میں گھر جانے دیا، جو ہر جگہ اس کے جلو میں چلتا تھا۔

''کیا تم مارکویزا کو جانتے ہو؟'' مجھ سے پیرس کے ایک دوست نے چپکے سے پوچھا۔

''بس معمولی سا،'' میں نے جواب دیا، اور یہ بات درست بھی تھی؛ دوناویولا جب اومبروسا میں

قیام کرتی تو ویرانوں میں کوسیمو کی زندگی کے زیر اثر، مقامی اشرافیہ کے کسی شخص سے ملنے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔

"ایسا حسن شاذ ہی ایسی بے قرار روح سے وابستہ ہوتا ہے،" میرے دوست نے کہا، "افواہ یہ ہے کہ وہ پیرس میں ایک چاہنے والے سے دوسرے تک اتنے تیز تواتر میں گزرتی ہے کہ کوئی اسے اپنا کہہ سکتا ہے نہ اپنے آپ کو مقدم سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ بار بار ایک وقت میں مہینوں کو غائب ہو جاتی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ کفارہ ادا کرنے کے لیے کسی خانقاہ میں جاتی ہے۔"

یہ جان کر کہ پیرس والے اومبروسا کے درختوں پر مارکویزا کی زندگی کو ادوارِ کفارہ سمجھتے ہیں، میں مشکل ہی سے اپنی ہنسی روک پایا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس افواہ نے مجھے پریشان کر دیا اور میں اپنے بھائی کے دورِ تاسف کی پیش بینی پر مجبور ہو گیا۔

ناخوشگوار اچنبھوں کی پیش بندی کے طور پر میں نے اسے خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور جونہی میں اومبروسا لوٹا، اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے میرے سفر اور فرانس کی خبروں کے بارے میں تفصیل سے سوالات کیے، مگر میں سیاست و ادب کے بارے میں اسے کوئی ایسی بات نہیں بتا سکا جس سے وہ پہلے ہی آگاہ نہ ہو۔

بالآخر میں نے دونا ویولا کا رومال اپنی جیب سے نکالا۔ "پیرس کے ایک سالون میں میں تمھاری جاننے والی ایک خاتون سے ملا تھا۔ اس نے اپنے سلام کے ساتھ تمھارے لیے یہ دیا ہے۔"

اس نے تیزی کے ساتھ رسّی سے بندھی ٹوکری نیچے گرائی، ریشمی رومال اٹھایا اور اسے اپنے چہرے پر یوں رکھا جیسے اس میں بسی خوشبو سونگھنا چاہتا ہو۔ "اخاہ، تم اس سے ملے تھے؟ کیسی تھی وہ؟ مجھے بتاؤ وہ کیسی تھی؟"

"بہت حسین اور بہت ذہین،" میں نے آہستہ سے جواب دیا، "لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یہ خوشبو بہت سوں نے سونگھی ہے۔"

اس نے رومال کو سینے سے یوں لگایا جیسے اس کے چھن جانے کا خوف ہو، پھر میری طرف مڑا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "تمھارے پاس تلوار نہیں تھی کہ تم ان تمام دروغ گوئیوں کو کہنے والے کے حلق میں ٹھونس دیتے؟"

Scanned with CamScanner

مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ یہ بات میرے ذہن میں بھی نہیں آئی تھی۔

وہ پل بھر خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنے کندھے اُچکائے۔ ''سب جھوٹ ہے۔ صرف میں ہی جانتا ہوں کہ وہ صرف میری ہے۔'' اور وہ الوداع کا ایک لفظ بھی کہے بغیر شاخوں پر دوڑ گیا۔ اپنی دنیا سے باہر نکلنے پر مجبور کرنے والی کسی بھی بات کو یکسر نہ ماننے کا اس کا عمومی انداز میں پہچان گیا۔

اس واقعے کے بعد سے میں نے جب بھی اسے دیکھا تو اداس اور بے چین دیکھا، اِدھر اُدھر کودتے ہوئے اور کچھ نہ کرتے ہوئے دیکھا۔ اگر کستوروں کے مقابلے میں اسے کبھی کبھی سیٹی بجاتے سنا تو اس کی لَے کو کہیں زیادہ بے چین اور غمگین پایا۔

مارکوئیز الوٹ آئی۔ ہمیشہ کی طرح کوسیمو کی بدگمانی نے اسے خوش کیا۔ اس نے بھی تھوڑی سی اسے ہوا دی، تھوڑی سی ہنسی اڑائی۔ یوں محبت کے خوبصورت دن پھر سے لوٹ آئے، اور میرا بھائی خوش ہو گیا۔

لیکن اب مارکوئیزا کوسیمو پر یہ الزام لگانے کا کوئی موقع نہ جانے دیتی کہ محبت کے بارے میں اس کا تصور بہت محدود ہے۔

''کیا مطلب ہے تمھارا؟ میں جلتا ہوں؟''

''جلنے میں تم حق بجانب ہو۔ لیکن تم جلن کو عقل کے تابع کرنے کی کوشش کرتے ہو۔''

''یقیناً، اس لیے کہ اس بارے میں کچھ زیادہ کر سکوں۔''

''تم استدلال بہت کرتے ہو۔ محبت کے بارے میں استدلال کیا ہی کیوں جائے؟''

''تم سے اور زیادہ محبت کرنے کے لیے۔ جو بات بھی استدلال کے ساتھ کی جائے اس کی شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔''

''تم رہتے درختوں پر ہو لیکن تمھاری ذہنیت کسی گٹھیا کے مارے وثیقہ نویس کی سی ہے۔''

''مشقت طلب کام لازمی طور پر ذہن کی سادہ ترین حالتوں میں کیے جانے چاہییں۔''

وہ مقولے بیان کرتا رہا یہاں تک کہ ویولا بھاگ گئی۔ پھر وہ اپنے بال نوچتا ہوا، کچھ بھی کر گزرنے کی حالت میں، اس کے پیچھے دوڑ پڑا۔

Scanned with CamScanner

انھیں دنوں ایک برطانوی پرچم بردار جہاز ہماری بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا۔ امیر البحر نے اومبروسا کے ممتاز شہریوں اور بندرگاہ میں موجود دوسرے جہازوں کے افسروں کو ضیافت پر بلایا۔ مارکویئزا بھی گئی اور اس شام سے کوسیمو حسد کا کرب از سرِ نو محسوس کرنے لگا۔ دو مختلف جہازوں کے دو افسر دوناویولا کے گرویدہ ہوگئے، اور اسے رجھانے اور توجہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے متواتر ساحل پر دیکھے جانے لگے۔ ایک، برطانوی پرچم بردار جہاز کا پرچمی افسر تھا، جب کہ دوسرے کا تعلق نیپو لیتی بیڑے سے تھا، مگر تھا وہ بھی پرچمی افسر۔ انھوں نے دو سرخی مائل بھورے گھوڑے کرائے پر لیے اور مارکویئزا کی بالکونیوں کے نیچے باری باری موجود رہنے لگے اور جب وہ ملتے تو نیپو لیتی ایسی شعلہ بار نظروں سے انگریز کو دیکھتا کہ اسے جل کر راکھ ہو جانا چاہیے تھا، جبکہ انگریز کے نیم باز پپوٹوں میں سے اس کی نگاہ ایسی چمکتی جیسے تلوار کی نوک۔

اور دوناویولا؟ وہ شوخ چشم کیا کرتی، سوائے اس کے کہ دن بھر غسل کا لبادہ پہنے، گویا کہ نئی نئی بیوہ ہوئی ہو اور اس کا سوگ ابھی ابھی ختم ہوا ہو، کھڑکی کی دہلیز پر جھکی، گھر پر موجود رہتی۔ اسے درختوں پر اپنے ساتھ نہ پا کر، اس کے سفید گھوڑے کو اپنی طرف سرپٹ آتا نہ سن کر، کوسیمو پاگل ہو رہا تھا۔ انجام کار اس نے بھی، ویولا اور دونوں پرچمی افسروں پر نظر رکھنے کے لیے اسی کھڑکی کے آگے ڈیرا ڈال دیا۔

وہ اپنے حریفوں کو ان کے متعلقہ جہازوں پر فوراً واپس بھیجنے کے لیے کوئی خوفناک جال تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ اس نے محسوس کیا کہ ویولا ان دونوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی علامات ظاہر کر رہی ہے۔ وہ یہ توقع کرنے لگا کہ ویولا محض انھیں، اور اسے بھی، ستا رہی ہے۔ تاہم اس نے ویولا پر چوکسی کی نظر برقرار رکھی، اور اس کی طرف سے کسی ایک پر دوسرے کو ترجیح دیے جانے کے آثار نظر آتے ہی بیچ میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس دوران، ایک صبح، انگریز آتا ہے۔ ویولا کھڑکی پر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ مارکویئزا ایک رقعہ گراتی ہے۔ افسر اسے ہوا میں ہی پکڑ لیتا ہے۔ وہ رقعہ پڑھ کر آداب بجالاتا ہے۔ وفورِ جذبات سے سرخ ہو جاتا ہے اور پھر گھوڑے کو ایڑ لگا کر یہ جا وہ جا۔ ملاقات! سو، خوش نصیب شخص انگریز تھا! کوسیمو نے قسم کھائی کہ وہ انگریز کو چین سے رات نہیں گزارنے دے گا۔

اسی لمحے نیپو لیتی بھی آجاتا ہے۔ ویولا اس کی جانب بھی ایک رقعہ پھینکتی ہے۔ افسر رقعہ پڑھتا

Scanned with CamScanner

ہے۔اسے ہونٹوں سے لگا کر بوسہ دیتا ہے۔ سو کوسیمو نے سوچا کہ منتخب شخص وہ ہے۔ واقعی؟ تو پھر دوسرا؟ کوسیمو کو کس کے خلاف کام کرنا تھا؟ دوناویولا نے یقیناً ان میں سے ایک ہی کے ساتھ ملاقات طے کی ہوگی، دوسرے کو یقیناً بے وقوف بنایا ہوگا۔ یا وہ ان دونوں کے ساتھ کھلواڑ کرنا چاہتی ہے؟

جہاں تک جائے ملاقات کا تعلق ہے تو کوسیمو نے اپنے شبہات سیر گاہ کے آخر میں واقع ایک بنگلے پر مرکوز کیے۔ مارکوئیزا نے کچھ عرصے قبل ہی اسے درست اور آراستہ کیا تھا، اور کوسیمو، اس وقت کے خیال میں جب اس نے درختوں کی پھننگوں کو صوفوں اور پردوں سے بھر دیا تھا، بدگمانی سے کڑھ رہا تھا۔ اب وہ ایسی جگہوں پر توجہ صرف کر رہی تھی جہاں وہ داخل ہی نہیں ہوسکتا تھا۔ ''میں بنگلے کی نگرانی کروں گا،'' کوسیمو نے اپنے آپ سے کہا، ''اگر اس نے ان دونوں افسروں میں سے ایک کے ساتھ ملاقات طے کی ہے تو یہ صرف وہیں ہوسکتی ہے۔'' اور وہ موترا کے پتوں میں چھپ گیا۔

جھٹ پٹے سے ذرا پہلے ایک سرپٹ دوڑتے گھوڑے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہ نیپو لینی ہے۔ اب میں اسے طیش میں لاؤں گا! کوسیمو یہ سوچ کر اپنی غلیل اٹھاتا ہے اور مٹھی بھر گلہری کی مینگنیاں اس کی گردن پہ مارتا ہے۔ افسر اپنے آپ کو جھٹکا دیتا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے۔ کوسیمو شاخ سے باہر نکلتا ہے اور جونہی کھلے میں آتا ہے، ایک باڑ کے پرے انگریز افسر کو اپنے گھوڑے سے اترتے اور اسے ایک چوبی ستون سے باندھتے دیکھتا ہے۔ ''پھر تو یہ ہے۔ ہوسکتا ہے نیپو لینی محض اتفاقاً اِدھر سے گزر رہا ہو۔'' اور ڈھیر ساری مینگنیاں انگریز کی ناک پر پڑتی ہیں۔

''کون ہے وہاں؟'' انگریز آواز لگاتا ہے۔ وہ باڑ عبور کیا ہی چاہتا ہے کہ اپنے نیپو لینی ہم کار کو اپنے روبرو پاتا ہے، جو گھوڑے سے اتر گیا ہے اور خود بھی پکار رہا ہے۔ ''کون ہے وہاں؟''

''میں معافی چاہتا ہوں، جناب!'' انگریز کہتا ہے، ''آپ یہاں سے فوراً رخصت ہوجایئے!''

''مجھے یہاں ہونے کا پورا حق ہے،'' نیپو لینی کہتا ہے، ''لہٰذا میں حضورِ والا سے کہتا ہوں کہ یہاں سے تشریف لے جائیں!''

''کوئی حق میرے حق سے زیادہ نہیں ہوسکتا،'' انگریز جواب دیتا ہے، ''مجھے افسوس ہے، لیکن میں آپ کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''یہ وقار کا سوال ہے،'' دوسرا کہتا ہے، ''میں اپنے گھرانے کے وقار پر بھروسا کرتا ہوں۔

Scanned with CamScanner

سلواتوردی سان کا تالدو، دی ساننا ماریا کا پواوتیرے، جس کا تعلق دونوں سسلیوں کے بادشاہ کی بحریہ سے ہے!"

"سراوبرٹ کاسل فیلڈ کی تیسری پشت!" انگریز خود کو متعارف کراتا ہے، "میرے وقار کا تقاضا ہے کہ میں آپ سے میدان خالی کرنے کا مطالبہ کروں۔"

"آپ کو اس وفادار تلوار سے زیر کرنے سے پہلے نہیں!" اور وہ اپنی تلوار کو بے نیام کرتا ہے۔

"جناب، آپ لڑنے کی خواہش رکھتے ہیں!" سراوبرٹ یہ کہتے ہوئے چوکس ہو جاتا ہے۔

وہ لڑنے لگتے ہیں۔

"یہ وہ جگہ ہے جہاں بہت دنوں سے میں تمھیں لانا چاہتا تھا، میرے ہم کار!" مپو لینی حملہ کرتا ہے۔

سراوبرٹ وار بچاتے ہوئے کہتا ہے، "جناب، میں بھی کچھ وقت سے آپ کی نقل وحرکت پر نظر رکھے ہوں۔ مجھے بھی اسی بات کا انتظار تھا!"

مہارت میں ہم سر، دونوں افسروں نے اپنے کو حملوں اور دھوکے کے داؤ پیچ میں جھونک دیا۔ وہ اپنے غیظ کے عروج پر تھے کہ ایک آواز نے پکار کر کہا، "خدا کے واسطے رک جاؤ!" بنگلے کی سیڑھیوں پر دوناویولا کھڑی تھی۔

"مارکویزا، یہ شخص..." دونوں افسروں نے اپنی تلواریں نیچی کرلیں اور ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم آواز ہو کر کہا۔

دوناویولا بولی، "میرے عزیز دوستو! میں التجا کرتی ہوں، اپنی تلواریں نیام میں رکھ لو۔ یہ طریقہ ہے کسی خاتون کو متوجہ کرنے کا؟ میں نے اس بنگلے کا انتخاب اپنے باغ کی سب سے خاموش اور خفیہ جگہ کے طور پر کیا تھا، اور ابھی مشکل ہی سے میری آنکھ لگی تھی کہ ہتھیاروں کے ٹکرانے کی آواز آنے لگی!"

"لیکن، ملادی،" انگریز نے کہا، "کیا آپ نے مجھے نہیں بلایا تھا؟"

"آپ یہاں میری منتظر تھیں، سینورا..." مپو لینی نے کہا۔

دوناویولا کے حلق سے ایسی ہنسی نکلی جو پروں کی پھڑپھڑاہٹ جیسی نازک تھی۔ "خدایا! ہاں۔ ہاں، میں نے آپ کو بلایا تھا... یا آپ کو۔ توبہ، میں بھی کتنی بدحواس ہوں۔ خیر، صاحبو، اب کیا انتظار

Scanned with CamScanner

ہے؟ ازراہِ کرم اندر تشریف لایئے...''

''ملادی، میرا خیال تھا دعوت صرف میرے لیے ہے۔ میں مایوس ہوا ہوں۔ کیا میں سلام پیش کرتے ہوئے رخصت ہونے کی اجازت لے سکتا ہوں؟''

''سینورا، میں بھی یہی کچھ کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے الوداع کہتا ہوں!''

مارکوئیزا ہنس پڑی۔ ''میرے اچھے دوستو... میرے اچھے دوستو... میں بھی کتنی پریشان دماغ ہوں... میرا خیال تھا میں نے سراوبرٹ کو الگ بلایا تھا... اور دون سلواتور کو الگ... نہیں۔ نہیں معاف کیجیے ایک ہی وقت بلایا تھا، مگر مختلف مقامات پر... ارے نہیں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟... خیر۔ بہرحال، یہ دیکھتے ہوئے کہ آپ دونوں یہاں موجود ہیں، ہم بیٹھ کر مہذب گفتگو کیوں نہیں کر سکتے؟''

دونوں لیفٹیننٹوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اسے دیکھنے لگے۔ ''مارکوئیزا، کیا ہم یہ سمجھیں کہ آپ محض ہم دونوں کا مذاق اڑانے کے لیے ہماری توجہ قبول کرنے کا بہانہ کر رہی ہیں؟''

''ایسا کیوں، میرے اچھے دوستو؟ اس کے برعکس، بالکل اس کے برعکس... آپ کی توجہ مشکل ہی سے لاتعلق رہنے دے سکتی ہے... اتنے پیارے لوگ ہیں آپ دونوں... اور یہی میری پریشانی ہے... اگر میں سراوبرٹ کی خوش وضعی کا انتخاب کرتی ہوں تو آپ کو گنواتی ہوں، میرے جذباتی دون سلواتور... اور سان کاتالدو کے افسر کی گرمی جذبات کو چنتی ہوں تو جناب، آپ سے دستبردار ہونا پڑتا ہے... اُف آخر کیوں... آخر کیوں...''

''آخر کیوں کیا؟'' دونوں افسروں نے بیک آواز پوچھا۔

دوناویولا اپنی نظریں جھکاتے ہوئے بولی، ''آخر کیوں دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے؟''

اوپر موترا کے درخت سے شاخیں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ یہ کوسیمو تھا، جو اپنی خاموشی مزید برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔

لیکن دونوں برہمی افسر اتنے الجھے ہوئے تھے کہ یہ آواز نہیں سن سکے۔ دونوں ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ''کبھی نہیں، مادام۔''

مارکوئیزا نے اپنی سب سے درخشاں مسکراہٹ کے ساتھ اپنا دل فریب چہرہ اٹھایا۔ ''تو پھر میں اپنے کو آپ میں سے اس کو سونپوں گی جو مجھے ہر بات میں خوش کرنے کے لیے، مجھے اپنے حریف کے

ساتھ بانٹنے پر تیار ہونے کا اقرار کرے گا!''

''سینورا!''

''ملادی!''

دونوں افسر سرد مہری سے ویولا کے آگے جھکے۔ پھر مڑ کر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے اور آپس میں ہاتھ ملایا۔

''مجھے یقین تھا کہ آپ بھلے آدمی ہیں، سینور کا تالدو،'' انگریز نے کہا۔

''مجھے آپ کے وقار میں کبھی شک نہیں تھا، مسٹر اوبرتو،'' نیپولینی نے کہا۔

انھوں نے مارکوئیزا سے منھ موڑا اور اپنے گھوڑوں کی طرف بڑھے۔

''میرے دوستو... ایسی ناگواری کیوں... بے وقوف لڑکو...'' ویولا کہہ رہی تھی مگر دونوں افسر اس وقت تک رکابوں میں پاؤں رکھ چکے تھے۔

اپنے تیار کردہ انتقام کا پیشگی لطف اٹھاتے ہوئے کوسیمو دیر سے اس لمحے کا منتظر تھا جب وہ دونوں ایک انتہائی دردناک حیرت سے دوچار ہوتے، تاہم اب، بے حیا مارکوئیزا کو الوداع کہنے میں ان کا مردانہ رویہ دیکھتے ہوئے، کوسیمو نے اپنے آپ کو اچانک ان کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کیا۔ مگر اب تو بہت دیر ہو چکی تھی! انتقام کے لیے رکھی گئی خوفناک چیزوں کو ہٹانا اب ممکن نہیں تھا۔ اس نے لمحے بھر کو سوچا اور فراخ دلی سے انھیں متنبہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

''رک جاؤ!'' وہ درخت پر سے چلایا، ''سوار مت ہو!''

دونوں افسروں نے بھونچکا ہو کر سر اٹھائے۔ ''تم وہاں اوپر کیا کر رہے ہو؟ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ نیچے آؤ!''

ان کے عقب میں دونا ویولا کی ہنسی، اس کی پرندے کے بازوؤں والی ہنسی، سنائی دی۔

دونوں حیران نظر آرہے تھے۔ سو ایک تیسرا بھی تھا، جو لگتا تھا اس تمام واقعے میں موجود رہا ہے۔ صورتِ حال پہلے سے زیادہ پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

''بہرحال،'' انھوں نے ایک دوسرے سے کہا، ''ہم دونوں کلی طور سے متفق ہیں!''

''اپنی عزت کی قسم!''

Scanned with CamScanner

''ہم دونوں میں کوئی بھی ملادی کو کسی کے ساتھ بانٹنے پر اتفاق نہیں کرے گا!''

''کبھی نہیں!''

''لیکن اگر ہم دونوں میں سے کوئی یہ منظور کرنے کا فیصلہ...''

''اس صورت میں بھی ہم متفق ہیں! ہم دونوں ایک ساتھ منظور کریں گے!''

''یہ معاہدہ ہے! اب، چلتے ہیں!''

اس نئے مکالمے پر کوسیمو، کہ اس نے خود اپنا انتقام ٹالنے کی کوشش کی تھی، طیش میں آ کر اپنا سر پیٹنے لگا۔ ''تو پھر یونہی سہی!'' وہ خود سے کہتے ہوئے دوبارہ پتوں میں چھپ گیا۔ دونوں افسر اچھل کر اپنی زینوں پر بیٹھ گئے۔ اب یہ بلبلائیں گے، کوسیمو نے سوچا اور اپنے کان بند کر لیے۔ فضا دُہری چیخوں سے گونج اٹھی۔ دونوں برہمی افسر اپنی زینوں کے آرائشی ساز و سامان میں چھپے ہوئے خارپشتوں پر بیٹھ گئے تھے۔

''دغا ہو گئی!'' چیخوں اور اچھل کود اور پریشانی کے ایک دھماکے میں وہ زمین پر آ رہے، اور وہ یوں نظر آ رہے تھے گویا مارکوئیزا کو الزام دینے والے ہوں۔

لیکن دوناویولا، جو ان دونوں سے زیادہ برہم تھی، چلا کر بولی، ''کینہ پرور، عفریت صفت بندر!'' وہ تیزی سے موترا کے تنے کی طرف بڑھی اور سرعت کے ساتھ دونوں افسروں کی نظر سے غائب ہو گئی، جن کا خیال تھا کہ اسے زمین نگل گئی ہے۔ اوپر شاخوں میں ویولا کوسیمو کے مقابل تھی۔ وہ ایک دوسرے کو شعلے برساتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کا غیظ انھیں ایک طرح کی پاکیزگی دے رہا تھا جو بلند منصب فرشتوں جیسی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے پرزے اڑانا چاہتے ہیں کہ عورت نے بے ساختہ کہا، ''ہائے میری جان! اسی طرح، ہاں، اسی طرح میں تمھیں پسند کرتی ہوں۔ حاسد، کٹھور!...'' وہ پہلے ہی سے اپنا ایک بازو اس کی گردن میں ڈال چکی تھی۔ وہ ہم آغوش تھے اور اب کوسیمو کو کچھ یاد نہیں تھا۔

وہ اس کے بازوؤں میں تھی۔ پھر اس نے اپنا چہرہ کوسیمو کے چہرے سے ہٹایا، گویا اس کے ذہن میں کوئی خیال کوندا ہو، اور بولی، ''لیکن وہ دونوں بھی، وہ مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ تم نے دیکھا؟ وہ مجھے آپس میں بانٹنے پر بھی تیار ہیں...''

ایک لمحے کے لیے کوسیمو نے چاہا کہ اپنے آپ کو اس پر پٹخ ڈالے۔ پھر اس نے شاخوں پر اپنے

آپ کو سنبھالا اور دانتوں سے پتے نوچتے ہوئے اپنا سر تنے سے ٹکرانے لگا،'' وہ کمینے ہیں...''

ویولا دور ہٹ گئی تھی اور اس کا چہرہ کسی مجسّمے کے چہرے کی طرح ساکن تھا۔ ''تمھیں ان سے بہت کچھ سیکھنا ہے!'' وہ مڑی اور تیزی کے ساتھ درخت سے اتر گئی۔

دونوں التفات طلب اپنے پچھلے اختلافات کو بالکل بھلا چکے تھے اور اب صبر و سکون کے ساتھ ایک دوسرے کے کانٹے نکالنے میں محو تھے۔ دونا ویولا نے انھیں چونکا دیا۔ ''جلدی! میری گاڑی میں بیٹھو!'' وہ سب بنگلے کے عقب میں غائب ہو گئے۔ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کوسیمو اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے، موترا کے درخت پر رہ گیا۔

اب کوسیمو کے لیے، اور ان دو سابق حریفوں کے لیے بھی، ایک دورِ اذیت کا آغاز ہوا۔ اور ویولا کے لیے کیا اسے دورِ مسرت کہا جا سکتا تھا؟ مجھے یقین ہے کہ مارکوئیزا دوسروں کو اذیت اس لیے دیتی تھی کہ وہ خود کو اذیت دینا چاہتی تھی۔ وہ عالی نسب افسر، ہمہ وقت حقیر اور ناقابلِ علیحدگی، اس کی کھڑکیوں کے نیچے رہتے یا اس کی بیٹھک میں، یا پھر مقامی شراب خانے میں پینے پلانے کے طویل ادوار میں محو رہتے۔ وہ ان دونوں کی مدح سرائی کرتی اور محبت کے دائمی نئے ثبوتوں میں ایک دوسرے کی مسابقت پر اکساتی، اور وہ ہر بار ایسا کرنے پر اپنے آمادہ ہونے کا اظہار کرتے اور اب تو وہ اسے آپس میں آدھا آدھا تقسیم کرنے پر بھی تیار تھے۔ بلکہ یہی نہیں، وہ اسے کسی اور کے ساتھ بھی بانٹنے پر آمادہ تھے، اور رعایتوں کے پھسلواں ڈھلوانوں پر بس ایک بار لڑھکنے کی دیر تھی، اب رکنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ ہر ایک ویولا کو متاثر کرنے اور یوں اس کے وعدوں کی تکمیل حاصل کرنے میں کامیاب ہونے کی خواہش سے مغلوب تھا، اور ساتھ ہی اتحاد کے ایک معاہدے میں اپنے حریف سے وابستہ بھی۔ اس کے حسد میں بھی مبتلا تھا اور اس کی جگہ لینے کا امیدوار بھی، اور، مجھے ڈر ہے کہ ہر ایک پر اس غیر واضح ذلت کے کھچاؤ کا بھی اثر تھا جس میں وہ دونوں اپنے کو ڈوبتا محسوس کر رہے تھے۔

بحری افسروں سے جھپٹی گئی ہر نئی رعایت پر، ویولا اپنے گھوڑے پر سوار ہوتی اور کوسیمو کو جا کر اس کے بارے میں بتاتی۔

''کیا تم جانتے ہو کہ انگریز یہ کرنے پر آمادہ ہے... اور نیپولیٹی بھی...'' وہ جونہی کوسیمو کو کسی درخت پر اداسی سے بسیرا لیے دیکھتی تو چلا کر کہتی۔

Scanned with CamScanner

کوسیمو جواب نہیں دیتا تھا۔

''یہ مطلق محبت ہے،'' وہ اصرار کرتی۔

''مطلق غلاظت، جو تم سب ہو!'' کوسیمو چلّایا اور غائب ہو گیا۔

یہ ان کا ایک دوسرے سے محبت کرنے کا ظالمانہ انداز تھا۔ اور انھیں اس سے نجات کا کوئی راستہ نہ سوجھتا تھا۔

برطانوی پرچم بردار جہاز لنگر اٹھانے والا تھا۔ ''آپ رک رہے ہیں نا؟'' ویولا نے سر اوبرٹ سے پوچھا۔ سر اوبرٹ جہاز پر حاضر نہیں ہوا اور اسے بھگوڑا اقرار دے دیا گیا۔ اتحاد اور ہم سری کے جذبے میں دون سلواتورے نے بھی یہی کیا۔

''وہ جہاز چھوڑ کر بھاگ آئے ہیں!'' ویولا نے فاتحانہ طور سے کوسیمو کو اطلاع دی، ''میری خاطر! اور تم...''

''اور میں؟'' کوسیمو ایسے سفاک انداز سے چلّایا کہ ویولا کو ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

اپنے اپنے بادشاہ کی بحری فوجوں کے بھگوڑے، زرد رو اور بے چین سر اوبرٹ اور سلواتور دی سان کاتالدو، اب اپنے شب و روز شراب خانے میں جوا کھیلتے ہوئے گزارتے اور ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتے، جبکہ ویولا کی اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش کی ہر شے سے بے اطمینانی انتہا پر تھی۔

اس نے اپنا گھوڑا لیا اور جنگل کی سمت گئی۔ کوسیمو ایک بلوط پر تھا۔ وہ نیچے، ایک میدان میں رک گئی۔

''میں اکتا گئی ہوں۔''

''ان سے؟''

''تم سب سے۔''

''ہونہہ!''

''انھوں نے مجھے محبت کے بڑے بڑے ثبوت دیے ہیں...''

کوسیمو نے تھوکا۔

''...لیکن یہ میرے لیے کافی نہیں ہے۔''

Scanned with CamScanner

کوسیمو نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈالنے کے لیے نیچی کیں۔

وہ بولی، ''کیا تم نہیں سمجھتے کہ محبت کو مکمل سپردگی، بکمل ترکِ ذات ہونا چاہیے؟''

ہمیشہ کی طرح حسین، وہ میدان میں کھڑی تھی اور سرد مہری محض اس کے خدوخال کو چھو رہی تھی۔ اس کے رویے کی نخوت ایک لمس سے پگھل جاتی اور وہ پھر سے اس کے بازوؤں میں ہوتی... یہ دکھانے کے لیے کہ وہ سرِ تسلیم خم کرنے کو آمادہ ہے، کوسیمو کے لیے کچھ بھی کہنا ٹھیک ہوتا، ''مجھے بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو، میں تیار ہوں... '' اور مسرت کسی غبار کے بغیر مسرت، ایک بار پھر اس کے دل میں اتر آتی۔ لیکن اس نے کہا، ''اگر کوئی اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنا آپ برقرار نہیں رکھ سکتا تو محبت ہو ہی نہیں سکتی۔''

ویولا نے جھلاہٹ میں کندھے اُچکائے لیکن اس کا باعث تکان بھی تھی۔ اور اس کے باوجود وہ اسے سمجھ سکتی تھی، جیسا کہ وہ اس وقت اسے واقعی سمجھ رہی تھی، اور یہ الفاظ اس کی نوکِ زبان پر تھے، ''تم ویسے ہی ہو جیسا میں تمھیں چاہتی ہوں،'' جنھیں ادا کر کے وہ پھر سے اس کے پاس آجاتی... لیکن اس نے اپنے ہونٹ کاٹے اور بولی، ''پھر ٹھیک ہے، خود ہی اپنا آپ برقرار رکھو۔''

''لیکن، پھر اپنا آپ برقرار رکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا،'' کوسیمو یہ کہنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے بجائے اس نے کہا، ''اگر تم ان بدمعاشوں کو ترجیح دیتی ہو...''

''میں تمھیں اپنے دوستوں سے نفرت کرنے کی اجازت نہیں دوں گی!'' چلّانے کے باوجود وہ اب تک یہ سوچ رہی تھی، ''میرے لیے اگر کوئی اہم ہے تو وہ تم ہو، اور میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں صرف تمھارے لیے کر رہی ہوں!''

''سو، نفرت کے قابل صرف میں ہی ہوں۔''

''کیا انداز ہے تمھارے سوچنے کا!''

''یہ میرے وجود کا حصہ ہے۔''

''پھر خدا حافظ، میں آج رات روانہ ہو رہی ہوں۔ تم دوبارہ مجھے نہیں دیکھو گے۔''

وہ تیزی سے گھر آئی، اپنا سامان باندھا اور افسروں سے بھی کوئی بات کیے بغیر رخصت ہو گئی۔ اس نے اپنا قول نبھایا اور وہ کبھی اومبروسا نہیں لوٹی۔ وہ فرانس گئی اور وہاں تاریخی واقعات کے ایک تواتر

نے، جب اسے لوٹنے سے زیادہ کسی بات کی خواہش نہیں تھی، اس کا راستہ روک لیا۔ انقلاب کا آغاز ہوا، پھر جنگ شروع ہوگئی۔ پہلے تو مارکویئزا نے واقعات کے نئے رخ میں دلچسپی لی ——وہ لفایت (Lafayette) کے وفد میں شامل تھی—— پھر وہ بلجیم میں جا بسی اور وہاں سے انگلستان چلی گئی۔ لندن کی کہر میں، نپولین کے خلاف جنگوں کے طویل سالوں کے دوران، وہ اومبروسا کے درختوں کے خواب دیکھا کرتی۔ پھر اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے وابستہ طبقۂ امرا کے ایک انگریز سے شادی کرلی اور کلکتہ میں آباد ہوگئی۔ وہاں وہ اپنی انگنائی سے جنگلوں کو دیکھا کرتی جن کے درخت اس کے بچپن کے باغوں میں لگے درختوں سے بھی عجیب تر تھے۔ ہر لحظہ یہ لگتا کہ وہ کوسیمو کو پتوں میں سے ظاہر ہوتے دیکھ سکتی ہے، مگر وہ کسی بندر یا تیندوے کا سایہ ہوتا۔

سر اوبرٹ کاسل فیلڈ اور سلواتور دی سان کا تالدو جینے مرنے میں ایک دوسرے سے وابستہ رہے اور انھوں نے مہم جوئی کو اپنا ذریعۂ معاش بنالیا۔ وہ وینس کے قمار خانوں، گوٹنگن کے شعبۂ دینیات اور پیٹرزبرگ میں کیتھرین دوم کے دربار میں دیکھے گئے۔ اس کے بعد ان کا سراغ نہیں ملا۔

گریاں، شکستہ حال اور کھانا کھانے سے منکر، کوسیمو ایک زمانے تک جنگل کے اطراف بے مقصد بھٹکتا رہا۔ وہ نوزائیدہ بچوں کی طرح بلند آواز سے سسکیاں بھرتا۔ پرندے جو کبھی اس حتمی نشانہ باز کے نزدیک آنے پر اڑ جایا کرتے تھے، اب اس کے پاس آجاتے اور قریبی درختوں کی چوٹیوں پر، یا اس کے سر پر اڑتے رہتے۔ اور چڑیاں چوں چوں کرتیں، سہرے نغمہ سرا ہوتے، فاختائیں کوکتیں، ترغے سیٹیاں بجاتے، درج چہچہاتے اور اسی طرح پھدکیاں اور بلندی پر اپنے بھٹوں میں گلہریاں، شجری چوہے، میدانی چوہے اس کورس میں اپنی چیخوں کا اضافہ کرتے، اور یوں میرا بھائی اس ماتمی فضا میں نقل و حرکت کرتا۔

پھر اس پر ایک تخریبی تشدد طاری ہوگیا۔ وہ چوٹی سے آغاز کرتے ہوئے ہر درخت کو پتا پتا کرکے تیزی سے نوچ ڈالتا، یہاں تک کہ وہ عریاں نظر آنے لگتا جیسا کہ جاڑوں میں ہوتا ہے، چاہے عام طور پر اس کے پتے بالکل بھی نہ جھڑتے ہوں۔ پھر، چوٹیوں پر دوبارہ جاکر وہ تمام چھوٹی شاخیں اور کونپلیں توڑ ڈالتا، یہاں تک کہ اصل لکڑی کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ وہ اور اوپر جاتا اور جیبی چاقو سے چھال اتارنے لگتا، اور متاثرہ درخت اپنے خوفناک زخموں کی سفیدی عیاں کرتے ہوئے نظر آتے۔

Scanned with CamScanner

کوسیمو کے اس تمام اضطراب میں ویولا کے خلاف کوئی آزردگی نہیں تھی، فقط اسے کھونے کی پشیمانی تھی، اسے اپنے سے وابستہ نہ رکھ پانے کی ندامت تھی، اس کو اپنے ناروا اور احمقانہ غرور سے ٹھیس پہنچانے کی شرمندگی تھی۔ کیونکہ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ہمیشہ باوفا رہی تھی، اور اگر وہ دوسرے مردوں کے ساتھ گھومتی تھی تو اس کا مطلب محض یہ تھا کہ وہ کوسیمو کے سوا کسی کو اپنا محبوب ہونے کا اہل نہیں سمجھتی تھی، اور اس کے تمام وہم اور ناآسودگیاں ان کی محبت میں اضافے کی حد سے فزوں خواہش اور یہ تسلیم کرنے سے انکار کے سوا کچھ اور نہ تھیں کہ محبت کی کوئی حد ہوسکتی ہے، اور یہ کوسیمو، فقط کوسیمو تھا، جو اس بات کو ذرا بھی نہ سمجھ پایا تھا، اور اسے اس حد تک انگیخت کیا کہ آخر اسے کھودیا۔

کچھ ہفتوں تک وہ جنگل میں رہا۔ ایسا تنہا وہ کبھی پہلے نہ تھا۔ اب اس کے ساتھ اوتیمو ماسیمو بھی نہیں تھا، کہ ویولا اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ جب دوبارہ میرا بھائی اومبروسا میں ظاہر ہوا تو وہ بدل چکا تھا۔ اب میں بھی اپنے آپ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ اس دفعہ کوسیمو واقعی پاگل ہوگیا تھا۔

۲۴

اس وقت سے لے کر جب وہ بارہ سال کی عمر میں درختوں پر چڑھا تھا اور نیچے آنے سے انکار کردیا تھا، اومبروسا میں یہ بات ہمیشہ کہی جاتی رہی تھی کہ کوسیمو پاگل ہے۔ لیکن بعد میں، جیسا کہ ہوتا ہے، اس کا پاگل پن سبھی نے قبول کرلیا تھا۔ میں صرف اس کے اوپر رہنے کے عزم کی بات نہیں کررہا ہوں، بلکہ میرا اشارہ اس کے کردار کی کئی بوالعجبیوں کی طرف ہے۔ کوئی بھی اسے ایک اختراعی کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتا تھا۔ پھر ویولا کے لیے اس کی محبت کے پورے طغیان میں، ناقابل فہم زبانوں میں وہ جوش بھری تقریریں تھیں، خاص طور پر پیٹرن سینٹ کے تہوار کے دوران والی، جنھیں کچھ لوگ، اس کے الفاظ کو ملحدانہ پکار کے معنی پہناتے ہوئے، بے حرمتی سے تعبیر کرتے، یا پولستانی زبان میں سوسینیت (Socinianism) کا اعلان سمجھتے۔ اس وقت سے یہ افواہ کہ بیرن پاگل ہوگیا ہے، عام ہوگئی، اور تقلید پرستوں نے اضافہ کیا، ”جو ہمیشہ سے پاگل ہو، وہ کیسے پاگل ہوسکتا ہے؟“

ان مختلف بیانوں کے درمیان کوسیمو واقعی پاگل ہوگیا تھا۔ اگر پہلے، وہ سر سے پاؤں تک سمور میں ملبوس رہتا تھا تو اب امریکی پراچین کی طرح ہدہد یا کھٹ بڑھئی کے شوخ رنگوں والے پروں سے

Scanned with CamScanner

اپنے سر کو سجانے لگا تھا، اور اپنے سر کے پروں کے علاوہ وہ انھیں اپنے سارے کپڑوں پر بکھیر دیتا تھا۔ آخر آخر اس نے اپنے لیے ایسی جیکٹیں بنائیں جو ساری کی ساری پروں سے بھری تھیں۔ وہ مختلف پرندوں کی عادتوں کی نقل کرنے لگا اور ہدہد کی طرح درختوں کے تنوں سے کیڑے مکوڑے نکال کر لن ترانی کرتا کہ اس نے کیا دولت حاصل کی ہے۔

ان لوگوں کے سامنے جو اسے سننے اور دل لگی کرنے کے لیے درختوں کے نیچے جمع ہوتے، وہ پرندوں کے دفاع میں تقریریں بھی کرتا۔ وہ نشانہ باز سے پردار قبیلے کا وکیل بن گیا۔ وہ کبھی اپنے پھدکی ہونے کا اعلان کرتا، کبھی الو ہونے کا، اور کبھی لال چڑیا ہونے کا۔ وہ انسانوں کے خلاف، جو نہیں جانتے تھے کہ پرندوں کو اپنا حقیقی دوست کیسے تسلیم کریں، طویل استغاثی تقریریں کرتا اور اس کی تقریریں سارے انسانی سماج کے خلاف، تمثیلوں کی شکل میں، الزامات کا طومار تھیں۔ پرندے بھی اس کے خیالات کی اس تبدیلی کو محسوس کرتے تھے اور، بھلے ہی نیچے لوگ سن رہے ہوں، وہ اس کے نزدیک آجاتے۔ یوں وہ اپنی تقریروں کو جیتی جاگتی مثالوں سے، جن کی طرف وہ آس پاس کی شاخوں پر اشارہ کرتا، مزین کر سکتا تھا۔

اس کے اس مخصوص کمال کی وجہ سے، اومبروسا کے شکاریوں میں، اسے دام کے طور پر استعمال کرنے کے بارے میں کافی بحث رہی۔ مگر کسی نے اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے پرندوں پر گولی چلانے کی کبھی ہمت نہیں کی۔ کیونکہ اب بھی، جب کہ وہ اپنے ہوش وحواس کم و بیش کھو چکا تھا، بیرن انھیں متاثر کرتا تھا۔ وہ اس کی ہنسی اڑاتے، اور اکثر اس کے درختوں تلے مذاق کرتے ہوئے بازاری لڑکوں اور خوش فکروں کا ایک جلوس رہتا۔ اس کے باوجود اس کا احترام بھی کیا جاتا تھا اور اس کی بات ہمیشہ توجہ سے سنی جاتی تھی۔

اب اس کے درخت کاغذ کے ٹکڑوں اور دفتی کے پرزوں سے، جن پر شکستہ تحریر میں سینیکا (Seneca) اور شیفٹس بری (Shaftesbury) کے اقوال درج ہوتے، اور ایک خاص ترتیب میں ایک دوسرے سے بندھی مختلف چیزوں سے بھرے رہتے تھے، جیسے پروں کے گچھے، کلیسائی شمعیں، چنوں کے تاج، عورتوں کے شکم بند، پستول، ترازو۔ اومبروسائی یہ اندازہ لگانے کی کوشش میں گھنٹوں صرف کرتے کہ ان علامتوں کے معانی کیا ہیں۔ روسا، اسقفِ اعظم، نیکی، جنگ؟ میرے خیال میں

ان میں چند کے تو سرے سے کچھ معانی تھے ہی نہیں۔ ان کا مقصد صرف اس کی یادداشت کو ٹھوکا دینا اور یہ احساس دلانا تھا کہ انتہائی غیر معمولی خیالات بھی صحیح ہو سکتے ہیں۔

کوسیمو نے خود بھی کئی ادبی چیزیں، جیسے کستورے کا گیت، کھٹ بڑھئی کی ضرب، الوؤں کا مکالمہ، لکھنے اور انھیں عوام میں تقسیم کرنے کا آغاز کیا۔ درحقیقت، فتورِ دماغ کے اسی زمانے میں اس نے فنِ طباعت سیکھا اور کچھ پمفلٹ یا گزٹ (جن میں ''میگ پائی گزٹ'' شامل تھا) چھاپنے شروع کیے جو سارے کے سارے بعد ازاں Biped's Monitor (''دوپایوں کا نگراں'') کے عنوان سے چھاپے گئے۔ وہ ایک اخروٹ کے درخت پر طباعتی میز، فرمہ، چھاپا خانہ، حروف دان اور سیاہی کا مٹکا لے آیا تھا، اور اپنا وقت صفحے کمپوز کرنے اور کاپیاں نکالنے میں گزارتا تھا۔ بعض اوقات کاغذ اور ٹائپ کے درمیان مکڑیاں اور تتلیاں پھنس جاتیں، اور ان کے نشان صفحے پر چھپ جاتے۔ بعض اوقات، جبکہ سیاہی تازہ ہوتی، کوئی چھپکلی شیٹ پر کود پڑتی، اور ہر چیز کو اپنی دم سے لیس دیتی۔ بعض اوقات گلہریاں حروفِ تہجی میں سے کوئی یہ سوچ کر لے لیتیں کہ یہ کھانے کی کوئی چیز ہے، اور اسے اپنی کھوہ میں لے جاتیں، جیسا کہ حروف Q کے ساتھ ہوا، جسے اس کی گول شکل اور ڈنٹھل کے باعث انھوں نے غلطی سے کوئی پھل سمجھا، اور یوں کوسیمو کو اپنے کچھ مضمون Cueer سے شروع اور C.E.D سے ختم کرنے پڑے۔

یہ سب کچھ یقیناً بہت عمدہ تھا لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ اس زمانے میں میرا بھائی صرف پاگل ہی نہیں ہوا تھا بلکہ فاتر العقل بھی ہو رہا تھا۔ یہ بات زیادہ گمبھیر اور غم ناک تھی کیونکہ پاگل پن، نیکی یا بدی کے لیے، فطرت کی ایک طاقت ہے، جب کہ ضعفِ عقل، کسی متقابل شے کے بغیر، فطرت کی ایک کمزوری ہے۔

تاہم جاڑوں میں وہ اپنے کو غنودگی کی حالت میں لانے پر قادر لگتا تھا۔ وہ اپنے استر دار سونے کے تھیلے میں، جس میں سے صرف اس کا سر باہر ہوتا، کسی ٹہنے سے لٹکا رہتا، گویا کسی بڑے سارے گھونسلے سے جھانک رہا ہو۔ اور یہ شاذ ہی ہوتا کہ وہ حوائجِ ضروریہ کے لیے مردانزو نالے پر بید کے درخت تک پہنچنے کے لیے دن کے گرم ترین حصوں میں دو چار سے زیادہ چھلانگیں لگاتا ہو۔ بے ترتیبی سے (اندھیرے میں ایک چھوٹا سا تیل کا لیمپ جلا کر) پڑھتا ہوا، یا اپنے آپ سے بڑبڑاتا یا گنگناتا ہوا،

وہ سونے کے تھیلے میں پڑا رہتا، لیکن زیادہ وقت وہ سونے میں گزارتا۔

کھانے کے لیے اس کے اپنے کئی پُر اسرار انتظام تھے۔ لیکن جب کوئی نیک دل سیڑھی کے ذریعے اس تک اوپر لے آتا، تو وہ یخنی یا کچوریوں کا نذرانہ قبول کر لیتا۔ درحقیقت مقامی کسانوں میں ایک طرح کا توہم پیدا ہو گیا تھا کہ بیرن کو نذرانہ پیش کرنا خوش قسمتی کا ضامن ہے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یا تو لوگ اس سے خوف کھاتے تھے یا اس کے تئیں خیر سگالی کا جذبہ رکھتے تھے۔ میرے خیال میں بعد والی بات درست تھی۔ یہ بات کہ حاضر بیرن دی روندو عوامی خیرات پر گذارا کرے، مجھے نامناسب محسوس ہوئی اور سب سے بڑھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ اگر ہمارے مرحوم والد کو پتا چلتا تو وہ کیا کہتے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، تو اس وقت تک میرے لیے اپنے آپ کو ملامت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، کیونکہ میرے بھائی نے گھریلو آسائشوں سے ہمیشہ نفرت کی تھی۔ اس نے میرے حق میں مختارنامہ لکھ دیا تھا جس کی رو سے اسے ایک معمولی سا وظیفہ دینے کے بعد (جو تقریباً سارا کا سارا وہ کتابوں پر خرچ کرتا تھا) اس کے تئیں میرا کوئی اور فرض باقی نہیں تھا۔ لیکن اب، اپنے لیے کھانا حاصل کرنے کی اہلیت سے اسے محروم دیکھ کر، میں نے وردی اور سفید وِگ پہنے اپنے ایک ملازم کو طشت میں رکھے چوتھائی ٹرکی اور بوردو کے ایک گلاس کے ساتھ، سیڑھی کے ذریعے اس تک بھیجنے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے پُر اسرار اصولوں کی وجہ سے انکار کر دے گا، لیکن اس کے بجائے اس نے فوراً اور بڑی رضامندی سے کھانا لے لیا۔ اور اس وقت سے، جب بھی مجھے خیال آتا، ہم اس کے لیے اپنے عمدہ کھانوں کا ایک حصہ اوپر شاخوں پر بھیجنے لگے۔

ہاں، یہ ایک المناک زوال تھا۔ پھر، خوش قسمتی سے، بھیڑیوں نے حملہ کر دیا اور اس واقعے نے کوسیمو کو اپنی بہترین صلاحیتیں پھر سے دکھانے کا موقع دیا۔ وہ ایک یخ بستہ سرما تھا۔ ہمارے جنگلوں تک میں برف پڑی تھی۔ قحط کے مارے بھیڑیوں کے غول کوہِ آلپس سے نکل کر ہمارے ساحلوں پر آ گئے تھے۔ کچھ لکڑہاروں کی ان سے مڈبھیڑ ہوئی اور وہ دہشت زدہ ہو کر اس خبر کے ساتھ پلٹ آئے۔ اومبروسا کے لوگ، جو آگ کے خلاف حفاظت کرنے والوں کے زمانے سے خطرے کے لمحات میں ایک ہونا سیکھ چکے تھے، فاقہ زدہ درندوں کو نزدیک آنے سے روکنے کے لیے باری باری شہر کے گرد پہرہ دینے لگے۔ لیکن مکانوں سے پرے جانے کی جرأت، خاص طور پر رات میں، کوئی نہیں کرتا تھا۔

''کیا بدنصیبی ہے کہ بیرن وہ نہیں ہے جو وہ ہوا کرتا تھا!'' اومبروسا میں لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

وہ شدید جاڑے کوسیمو کی صحت پر انداز ہوئے بغیر نہیں گزرے۔ اپنی گٹھی میں کسی بیوپے کی طرح، وہ اپنی کھال میں دبکا ہوا لٹک رہا تھا۔ اس کی ناک بہہ رہی تھی اور وہ بدحواس اور پراگندہ لگ رہا تھا۔ بھیڑیوں کا دھڑکا بڑھ گیا تھا۔ نیچے گزرتے ہوئے لوگوں نے آواز لگائی، ''افسوس! بیرن، کبھی تم اپنے درختوں سے نگہبانی کیا کرتے تھے، مگر اب ہمیں تمھاری حفاظت کرنا پڑ رہی ہے۔''

وہ اپنی ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ ساکت رہا، گویا کہ وہ سمجھا نہ ہو، یا کسی بات کی پروا نہ کرتا ہو۔ پھر، اچانک اس نے اپنا سر اٹھایا، اپنی ناک صاف کی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا، ''بھیڑیں، بھیڑیوں کے لیے۔ دو چار کو درختوں پر رکھ دو، باندھ کر۔''

نیچے، لوگ یہ سننے کہ وہ کیا لغو باتیں نکالے گا، اور فقرے کسنے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔ اس کے بجائے وہ تیز تیز سانس لیتا اور کھانستا ہوا بستر سے اٹھا، اور کہنے لگا، ''میں بتاتا ہوں کہاں۔'' اور شاخوں کے درمیان آگے بڑھ گیا۔

اخروٹ یا بلوط کے کچھ درختوں پر، جو جنگل اور مزروعہ زمین کے درمیان بڑی احتیاط سے چنی گئی جگہوں پر واقع تھے، کوسیمو نے ان سے بھیڑیں یا بکرے لانے کو کہا۔ ان ممیاتی ہوئی زندہ بھیڑوں کو اس نے خود شاخوں سے باندھا، لیکن اس طرح کہ وہ نیچے نہیں گر سکتی تھیں۔ ان میں ہر ایک درخت پر اس نے گراب کے چھروں بھری بندوق چھپا دی۔ پھر اس نے بھیڑ کا بہروپ بھرا۔ اس کا سرپوش، کوٹ، پتلون سب کچھ بھیڑ کی گھنگھریالی کھال سے بنا تھا۔ اور وہ کھلے درختوں پر رات کا انتظار کرنے لگا۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ اس سے بڑی پاگل پن کی حرکت اس نے کبھی نہیں کی۔

تاہم، بھیڑیے اسی رات آ گئے۔ بھیڑوں کی بو سونگھ کر، ان کا ممیانا سن کر اور پھر انھیں اوپر دیکھ کر تمام غول درختوں تلے رک گیا۔ عریاں کی ہوئی فاقہ زدہ کچلیوں کے ساتھ مسلسل چیخیں مارتے ہوئے وہ اپنے پنجوں سے تنے کو کھکھیڑنے لگے۔ اور اب شاخوں پر چھلانگیں لگاتا ہوا کوسیمو آ پہنچا۔ بھیڑ اور انسان کی اس مخلوط نسل کو پرندوں کی طرح پھدکتا دیکھ کر بھیڑیے مبہوت ہو گئے۔ یہاں تک کہ دو فائروں نے ان کا گلا چھید دیا۔ دو اس لیے کہ ایک بندوق تو کوسیمو کے پاس تھی، جسے وہ ہر بار بھرتا تھا اور دوسری بھری

ہوئی، ہر درخت پر تیار تھی۔ سو، ہر بار جب وہ گولی چلاتا تو دو بھیڑیے یخ بستہ زمین پر ڈھیر ہو جاتے۔ اس طرح، اس نے ان کی ایک بڑی تعداد کو ختم کر دیا۔ ہر گولی چلنے پر غول، پراگندہ ہزیمت میں اِدھر اُدھر بھاگتا، جبکہ دوسرے بندوق بردار لوگ اس طرف بھاگتے جدھر چیخیں سنائی دیتیں، اور باقی کام ان کی گولیاں کر دیتیں۔

بعد ازاں، بھیڑیوں کے اس شکار کے بارے میں کوسیمو نے بہت سی کہانیاں مختلف صورتوں میں سنائیں، اور میں نہیں کہہ سکتا ان میں سے کون سی صحیح تھی۔ مثال کے طور پر: ''لڑائی اطمینان بخش طریقے سے جاری تھی۔ میں آخری بھیڑ والے درخت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میں نے تین بھیڑیوں کو دیکھا جو اوپر شاخوں پر چڑھ گئے تھے، اور ٹھیک اسی وقت بھیڑ کو ہلاک کر رہے تھے۔ چونکہ میں بخار سے نیم کور وحواس باختہ ہو رہا تھا، لہٰذا اس سے پہلے کہ وہ مجھے دیکھتے، میں قریب قریب ان کی تھوتھنیوں تک پہنچ گیا۔ پھر، اس دوسری بھیڑ کو شاخوں کے ایک سرے سے دوسرے تک دو پیروں پر چلتا دیکھ کر، وہ اپنی کچلیاں عریاں کرتے ہوے، جو ابھی تک خون سے سرخ تھیں، اس پر ٹوٹ پڑے۔ میری بندوق خالی تھی کیونکہ اس تمام فائرنگ کے بعد میرے پاس بارود ختم ہو گیا تھا اور اس درخت پر موجود بندوق تک میں بھیڑیوں کی وجہ سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں ایک چھوٹی بلکہ کمزور شاخ پر تھا، لیکن میرے اوپر گز بھر کی دوری پر ایک مضبوط شاخ تھی۔ اصل تنے سے پسپائی اختیار کرتے ہوے میں اپنی شاخ پر پیچھے کی طرف چلنے لگا۔ ایک بھیڑیا آہستہ آہستہ میرا تعاقب کرنے لگا۔ لیکن میں اپنے ہاتھوں کے ذریعے اوپر والی شاخ سے لٹکا ہوا تھا، اور اس دوسری شاخ پر اپنے پیروں کو حرکت دے رہا تھا۔ درحقیقت میں اوپر ٹنگا ہوا تھا۔ بھیڑیا دھوکے میں آ کر آگے بڑھا، اور اس کے وزن تلے شاخ خم کھا گئی۔ اس دوران میں نے ایک چھلانگ کے ذریعے خود کو اوپر والی شاخ پر کھینچ لیا۔ بھیڑیا، کتے جیسی ایک چھوٹی سی بھونک کے ساتھ نیچے گرا۔ زمین نے اس کی کمر توڑ دی اور وہ مر گیا۔''

''اور باقی دو بھیڑیوں کا کیا ہوا؟''

''... باقی دونوں بھیڑیے بے حس وحرکت، مجھے گھور رہے تھے۔ پھر اچانک میں نے بھیڑ کی کھال کا کوٹ اور سرپوش اتارا اور انھیں بھیڑیوں پر پھینک دیا۔ بھیڑ کے اس سفید بھوت کو اپنی طرف اڑتا دیکھ کر، ایک بھیڑیے نے اسے دانتوں میں پکڑنے کی کوشش کی، لیکن چونکہ وہ ایک بھاری وزن کی

توقع کر رہا تھا اور وہ محض ایک خالی کھال تھی، وہ اپنا توازن کھو بیٹھا اور انجام کار زمین پر گرنے سے اپنے پنجے اور گردن توڑ بیٹھا۔''

''ایک اب بھی باقی ہے۔''

''...ایک اب بھی باقی ہے — لیکن چونکہ کوٹ اتار پھینکنے سے میرے کپڑے اچانک بہت ہلکے ہو گئے تھے، مجھ پر چھینکوں کا دورہ پڑ گیا اور ہر چیز تھرتھرا اٹھی۔ اس اچانک غیر متوقع اخراج سے بھیڑیے کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ درخت سے گر پڑا، اور اس نے بھی اپنی گردن توڑ لی...''

یوں، اپنی لڑائی والی رات کا قصہ میرے بھائی نے سنایا۔ جو بات یقینی ہے وہ یہ کہ نتیجے کے طور پر جو تپ اسے چڑھی، پہلے سے بیمار ہونے کے باعث قریب قریب جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ کچھ دنوں تک زندگی اور موت کے درمیان معلق رہا، اور اس دوران اس کی خبر گیری، جذبۂ تشکر کے تحت، اومبروسا کی پنچایت کے خرچ پر ہوتی رہی۔ اسے ایک جھولنے میں لٹایا گیا تھا اور سیڑھیوں پر اوپر نیچے آتے ڈاکٹر اسے گھیرے رہتے تھے۔ مشورے کے لیے بہترین میسر ڈاکٹر بلائے گئے۔ کچھ نے انیما تجویز کیا، کچھ نے جونکیں، کچھ نے رائی کے پلستر، کچھ نے ٹکور۔ اب کوئی بیرن دی روندو کو پاگل نہیں کہتا تھا بلکہ سارے لوگ اس کا ذکر ایک عظیم دماغ اور صدی کے نمایاں ترین مظہر کی حیثیت سے کرتے۔

مگر یہ صورتِ حال اس کی بیماری کے دوران کی تھی۔ اس کی صحت یابی کے ساتھ ہی حالات بدل گئے۔ پہلے کی طرح، ایک بار پھر کچھ لوگ اسے دانا کہنے لگے اور کچھ پاگل۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ترنگیں اس پر دوبارہ حاوی نہیں ہوئیں۔ وہ ہفتہ وار اخبار چھاپتا رہا، اور اب اس کا نام **Biped's Monitor** (''دوپایوں کا نگراں'') نہیں بلکہ **'Reasonable Vertebrate'** (''معقول ریڑھ کی ہڈی والا'') تھا۔

۲۵

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آیا اس وقت اومبروسا میں فری میسن لاج پہلے سے قائم تھی۔ میں خود اس حلقے میں بہت بعد میں شامل ہوا، جب پہلی نپولینی مہم کے بعد، مقامی بالائی اشرافیہ اور چھوٹے امرا کے ایک بڑے حصے نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ لہٰذا میں نہیں بتا سکتا کہ لاج سے میرے بھائی

Scanned with CamScanner

کے اوّلیں روابط کب قائم ہوئے۔ اس سلسلے میں میں ایک واقعہ بیان کروں گا جو کم وبیش اسی زمانے میں رونما ہوا جس کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس واقعے کے سچ ہونے کی تائید بہت سے شاہد کریں گے۔

ایک روز دو ہسپانوی، جو گزرتے ہوئے مسافر تھے، اومبروسا میں وارد ہوئے۔ وہ بارتولومیو کاوانیا نامی کسی شخص کے ہاں گئے جو پیسٹریاں بناتا تھا اور ایک معروف فری میسن تھا۔ لگتا ہے انھوں نے اپنے کولاج آف مادرید کا رکن ظاہر کیا۔ اس طرح ایک شب وہ انھیں اومبروسائی اراکین کے اجلاس میں لے گیا، جو ان دنوں جنگل کے وسط میں ایک صاف کی ہوئی جگہ پر مشعلوں اور الاؤ کی روشنی میں منعقد ہوتا تھا۔ یہ سب سنی سنائی باتوں اور قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ تاہم جو بات یقینی ہے وہ یہ ہے کہ اگلے دن جونہی ہسپانوی اپنی سرائے سے باہر آئے تو کوسیمو نے، جو اوپر درختوں میں پوشیدہ انتظار کر رہا تھا، ان کا تعاقب کیا۔

دونوں مسافر شہر کے دروازے سے باہر ایک شراب خانے کے صحن میں داخل ہوئے۔ کوسیمو ایک جافری پر براجمان ہو گیا جس پر تخم دان کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ ایک میز پر ایک گاہک ان دونوں کا منتظر تھا۔ اس کا چہرہ، جس پر چوڑے چھجے والے سیاہ ہیٹ نے سایہ ڈال رکھا تھا، نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان تینوں کے سر، بلکہ ان تینوں کے ہیٹ، میز پوش کے سفید مربعے پر ہلتے رہے، اور کچھ باہم دگر بات چیت کے بعد نامعلوم شخص ایک کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھنے لگا، جو دوسرے دونوں بول رہے تھے۔ جس ترتیب میں الفاظ ایک دوسرے کے نیچے لکھے جا رہے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ ناموں کی فہرست بن رہی ہے۔

''صاحبو، آپ کو روز بخیر!'' کوسیمو نے کہا۔ تینوں ہیٹ ان کے چہروں کو آشکار کرتے ہوئے اوپر اٹھے۔ ان کی نظریں جافری پر بیٹھے آدمی پر جم کے رہ گئیں۔ لیکن ان میں سے ایک نے، جس کا ہیٹ چوڑے چھجے والا تھا، اپنا چہرہ فوراً نیچے کر لیا یہاں تک کہ اس کی ناک کا سرا میز سے مس ہونے لگا۔ مگر میرے بھائی کو اتنا وقت ضرور مل گیا کہ اس نے اس کے خط وخال کی ایک جھلک دیکھ لی، جو اسے نامانوس نہیں لگے۔

''روز بخیر!'' دونوں پکار اٹھے۔ ''مگر کیا یہ کوئی مقامی رواج ہے کہ آسمان سے کبوتر کی طرح نازل ہو کر اجنبیوں سے اپنا تعارف کرایا جائے؟ غالباً آپ اتنی مہربانی ضرور کریں گے کہ نیچے آ کر وضاحت

Scanned with CamScanner

کریں!''

''جو اوپر ہوتے ہیں واضح طور پر نظر آتے ہیں،'' بیرن نے کہا،''گو دوسرے اپنے چہرے چھپانے کے لیے خاک میں رینگتے ہیں۔''

''کیا میں کہہ سکتا ہوں، سینور، کہ ہم سے کوئی اپنا چہرہ دکھانے کا پابند نہیں ہے، بالکل اسی طرح جیسے ہم سے کوئی اپنے چوتڑ نہیں دکھائے گا۔''

''کئی قسم کے لوگوں کے لیے چہرہ چھپانا یقیناً عزت کا معاملہ ہوتا ہے۔''

''کون سی قسم، مثلاً؟''

''مثلاً جاسوس!''

دونوں ساتھی چونک گئے۔ خمیدہ آدمی بے حرکت رہا لیکن اس کی آواز پہلی بار سنائی دی۔''یا، ایک اور مثال، خفیہ تنظیموں کے رکن...'' وہ آہستگی سے بولا۔

اس تبصرے کی کئی وضاحتیں ہوسکتی تھیں۔ سو کوسیمو نے سوچا اور بلند آواز میں اس طرح بولا، ''جناب، یہ تبصرہ کئی وضاحتوں کو دعوت دے رہا ہے۔ کیا آپ نے خفیہ تنظیموں کے رکن، یہ اشارہ دیتے ہوئے کہا کہ میں خود ایک رکن ہوں، یا آپ کی مراد یہ تھی کہ آپ خود ہیں، یا یہ کہ ہم دونوں ہیں، یا یہ کہ ہم میں سے کوئی نہیں ہے، یا آپ نے ایسا اس لیے کہا کہ چاہے جو بھی معنی لیے جائیں، یہ تبصرہ میرے جواب کے لحاظ سے کارآمد ہے؟''

''کیا، کیا، کیا؟'' چھجے دار ہیٹ والا آدمی بوکھلا کر پکارا۔ وہ بوکھلاہٹ میں اپنا سر نیچا رکھنا بھول گیا اور اسے اتنا بلند کر لیا کہ اس کی نظریں کوسیمو سے مل گئیں۔ کوسیمو اسے پہچان گیا۔ وہ دون سلپیسیو یسوعی تھا، جو اولیوابا سا کے زمانے سے اس کا دشمن تھا!

''اخاہ! سو میری بات غلط نہیں تھی۔ نقاب اتار دو، مقدس فادر!'' بیرن بے ساختہ بول اٹھا۔

''تم! مجھے اس کا یقین تھا!'' ہسپانوی نے چلا کر کہا اور اپنا ہیٹ اتار کر اپنی منڈی ہوئی چندیا ظاہر کرتے ہوئے جھک گیا۔''دون سلپیسیو دی گوادالیتے، سوسائٹی آف جیسس کا عہدے دار۔''

''کوسیمو دی روندو، فری میسن!''

دوسرے دونوں ہسپانویوں نے بھی خفیف سی خمیدگی کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔

Scanned with CamScanner

"دون کالستو!"

"دون فلکیفسیو!"

"یسوعی؟"

"ہم بھی!"

"مگر کیا آپ کا سلسلہ حال ہی میں پوپ کے حکم سے منسوخ نہیں کر دیا گیا؟"

"تمھاری طرح کے اوباشوں اور کافروں کو مہلت دینے کے لیے نہیں!" دون سلپیسیو نے اپنی تلوار بے نیام کرتے ہوئے چلاّ کر کہا۔

وہ ہسپانوی یسوعی تھے جو اپنے سلسلے کے منتشر ہونے کے بعد روپوش ہو گئے تھے اور توحید پرستی اور نئے خیالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام دیہی علاقے میں ایک مسلح رضا کار فوج بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کوسیمو نے اپنی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھ لیا۔ لوگوں کی ایک تعداد نے ان کے گرد حلقہ بنا لیا تھا۔ "اگر تمھیں دو بدو لڑنے کی خواہش ہے تو نیچے آنے کی مہربانی کرو،" ہسپانوی نے کہا۔

قریب ہی اخروٹ کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ فصل کا وقت تھا، اور کسانوں نے اخروٹ اکٹھے کرنے کے لیے، جو وہ درختوں کو ہلا کر گراتے تھے، ایک سے دوسرے درخت تک چادریں باندھ رکھی تھیں۔ کوسیمو تیزی سے ایک اخروٹ کے درخت پر پہنچا اور نیچے چادر میں کود گیا۔ اس جھولنا نما سہارے پر اپنے پیر پھسلنے سے بچاتے ہوئے وہ جوں توں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑا رہا۔

"تم بھی ایک دو قدم اوپر آؤ، دون سلپیسیو، کیونکہ میں اپنے معمول سے زیادہ نیچے آیا ہوں!" اور اس نے بھی اپنی تلوار نکال لی۔

ہسپانوی بھی کود کر پھیلی ہوئی چادر پر آ گیا۔ سیدھا کھڑا رہنا مشکل تھا کیونکہ چادر ان کے جسموں کے گرد بوری کی طرح تہ ہوئی جا رہی تھی، لیکن دونوں مقابلہ جو اتنے پُر جوش تھے کہ وہ تلواریں ٹکرانے میں کامیاب رہے۔

"خدا کی عظیم تر شان کے لیے!"

"کائنات کے عظیم خالق کی شان کے لیے!"

Scanned with CamScanner

اور وہ ایک دوسرے پر پل پڑے۔

''اس سے پہلے کہ میں اپنی تلوار کا پھل تمھارے حلقوم میں اتاروں،'' کوسیمو نے کہا، ''مجھے سینور یتا ارسلا کے بارے میں بتاؤ۔''

''وہ ایک خانقاہ میں مر گئی۔''

کوسیمو اس خبر سے پریشان ہو گیا (جو، تاہم، میرے خیال میں موقعے پر ہی گڑھی گئی تھی) اور سابق یسوعی نے اس شیطانی چال سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے اخروٹ کے درخت کی شاخوں سے بندھی ہوئی ایک گانٹھ پر، جو کوسیمو کی سمت چادر کو سہارے ہوئی تھی، تلوار لہرائی اور اسے بیچ سے بالکل قطع کر دیا۔ اگر کوسیمو نے فوراً اپنے آپ کو دون سلپیسیو کے حصے والی چادر پر پھینک کر ایک رسّی نہ پکڑ لی ہوتی تو وہ گر گیا ہوتا۔ اس کی جست کے دوران اس کی تلوار ہسپانوی کی ڈھال کو چھیدتی ہوئی اس کے پیٹ میں اتر گئی۔ دون سلپیسیو دھڑام سے گرا اور چادر پر اس سمت پھسلتا ہوا، جہاں اس نے گانٹھ کاٹی تھی، زمین پر گر پڑا۔ کوسیمو واپس اخروٹ کے درخت پر چلا گیا۔ دوسرے دونوں سابق یسوعیوں نے اپنے ساتھی کو اٹھایا (وہ مر چکا تھا یا محض زخمی ہوا تھا، اس کا پتا کبھی نہیں چلا) اور تیزی سے روانہ ہو گئے۔ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے۔

خون آلود چادر کے گرد ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ اور اس دن سے میرا بھائی فری میسن کی حیثیت سے مشہور ہو گیا۔

تنظیم کی راز داری کی وجہ سے میں اس سے زیادہ معلوم نہیں کر سکا۔ جب میں اس کا رکن بنا تو، جیسا میں کہہ چکا ہوں، میں نے کوسیمو کا ذکر ایک پرانے رکن کی حیثیت سے سنا جس کا لاج سے تعلق یکسر واضح نہیں تھا۔ کچھ لوگ اسے غیر سرگرم بیان کرتے، کچھ ایسا بدعتی بتاتے جو کسی اور فرقے میں شامل ہو چکا تھا، کچھ اسے مرتد بھی کہتے، لیکن اس کی پرانی سرگرمیوں کا ذکر ہمیشہ بڑے احترام سے کیا جاتا تھا۔ وہ ایسا روایتی ''ماسٹر وڈ پیکر میسن'' بھی ہو سکتا تھا جس سے لاج کا قیام، جس کا نام ایسٹ آف اومبروسا تھا، منسوب تھا۔ اس لاج کی اوّلیں رسومات کی تفصیلات پر اس کے اثر کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ مبتدیوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک درخت پر چڑھایا جاتا، پھر ایک رسّی کے سرے پر نیچے گرا دیا جاتا۔

یہ بات یقینی ہے کہ ہم سے فری میسنوں کی ابتدائی ملاقاتیں رات کے وقت جنگل کے وسط میں

Scanned with CamScanner

ہوئی تھیں ۔ اس طرح کوسیمو کی موجودگی کا کافی سے زیادہ جواز تھا، خواہ وہ آپ وہی شخص تھا جو بیرونِ ملک کے مراسلہ نگاروں سے تنظیم کے دساتیر کی جلدیں وصول کرتا تھا، یا خواہ وہ کوئی اور شخص تھا جو ممکنہ طور پر فرانس یا انگلستان میں رکن بنایا گیا تھا، جس نے اومبروسا میں بھی رسومات متعارف کرائیں ۔ گو یہ ممکن ہے کہ یہاں تنظیم کا وجود کافی عرصے سے ہو، جس کا کوسیمو کو علم نہ ہو، اور یہ کہ ایک رات، جنگل میں درختوں پر گھومتے ہوئے، اس نے وہ قطعہ دیکھ لیا ہو جہاں شمعوں کی روشنی میں عجیب پوشاکوں اور آلات والے لوگوں کا اجلاس جاری تھا ۔ اور وہ سننے کے لیے اوپر ٹھہر گیا ہو اور پھر مخل ہو کر انھیں کسی غیر متوقع بات سے بوکھلا دیا ہو، جیسے، ''اگر تم دیوار اٹھاؤ تو یہ سوچ لینا کہ باہر کیا رہ گیا ہے!'' (یہ فقرہ میں نے اسے اکثر دہراتے سنا تھا)، یا ایسی ہی کوئی اور بات، اور انھوں نے اس کی اعلیٰ بصیرت کو پہچان کر اسے خاص فرائض سونپتے ہوئے اپنی لاج کا رکن بنا لیا ہو، اور اس نے بہت ساری رسومات اور علامتیں متعارف کرائی ہوں ۔

حقیقت یہ ہے کہ کوسیمو کی وابستگی کے اس تمام عرصے میں، یہ بے در و دیوار میسنری (جیسا کہ میں اسے اس میسنری سے ممیز کرنے کے لیے کہوں گا جسے بعد ازاں ایک بند عمارت میں منعقد ہونا تھا) کہیں زیادہ بھرپور رسومات کی حامل تھی، جن میں الوؤں، دوربینوں، مخروطیوں، پانی سے چلنے والے پمپوں، چھوٹے کارتیزی آسیبوں، مکڑی کے جالوں، اور فیثا غورثی جداول کا بھی ایک کردار تھا ۔ کھوپڑیوں کی ایک خصوصی نمائش بھی تھی، جس میں صرف انسانوں کی نہیں بلکہ گایوں، بھیڑیوں اور عقابوں کی کھوپڑیاں بھی تھیں ۔ ایسی اور دوسری چیزیں، جیسے کرنیاں، مسطر اور پرکاریں، جو فری میسنوں کے عام طریق عبادت کا حصہ ہیں، ان دنوں عجیب و غریب تقابل میں شاخوں سے لٹکی نظر آتی تھیں اور بیرن کی دیوانگی سے بھی منسوب کی جاتی تھیں ۔ صرف چند ہی لوگوں نے اشارتاً کہا کہ اب یہ معما زیادہ سنجیدہ معنی رکھتا ہے ۔ تاہم کوئی شخص بھی ابتدائی اور بعد والی علامتوں میں کوئی واضح فرق نہیں کر سکا، اور نہ ہی اس امکان کو خارج کر سکا کہ یہ چیزیں ابتدا ہی سے کسی خفیہ تنظیم کی محض علامتیں تھیں ۔

فری میسنوں میں شامل ہونے سے پہلے، کوسیمو مختلف حرفتوں اور پیشوں کی انجمنوں اور برادریوں میں طویل عرصے تک رہ چکا تھا، جیسے سینٹ کرسپنز جفت سازوں، پارسا پیپا سازوں، منصف مزاج بکتر سازوں، یا باضمیر کلاہ سازوں کی انجمنیں ۔ چونکہ ہر وہ چیز جو اسے جینے کے لیے درکار تھی، وہ

Scanned with CamScanner

خود بناتا تھا، وہ بہت سارے مختلف کام جانتا تھا اور بہت سی انجمنوں کا رکن ہونے پر فخر کر سکتا تھا، جبکہ یہ انجمنیں ایک امیرزادے کی شمولیت پر، جو غیر معمولی صلاحیتوں اور مسلمہ عدم مفاد کا حامل تھا، اپنے طور پر خوش تھیں۔

اجتماعی زندگی کے لیے کوسیمو کا یہ جذبہ، جس کا اظہار وہ ہمیشہ کیا کرتا تھا، سماج سے اس کی دائمی فراریت سے کیونکر میل کھاتا تھا، میں مناسب طور پر کبھی نہیں سمجھ پایا، اور میرے لیے یہ بات اس کے کردار کی یکتائیوں میں سب سے کم نہیں ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنی پتوں کی کھوہ میں چھپنے پر وہ جس قدر راغب تھا، اسی قدر نوعِ انساں سے نئے رابطے پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کہ وہ بار بار ایک نیا بھائی چارہ منظم کرنے میں اپنے آپ کو روح و بدن سمیت جھونک دیتا، اس کے لیے مفصل قواعد و مقاصد تجویز کرتا، ہر کام کے لیے موزوں ترین افراد چنتا، اس کے ساتھی کبھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ اس پر کس حد تک بھروسا کر سکتے ہیں، اسے کہاں مل سکتے ہیں اور وہ اچانک اپنی فطرت کے پرند پہلو میں کب لوٹ جائے گا اور اپنے آپ کو بالکل ہاتھ نہ آنے دے گا۔ غالباً اگر کوئی کوشش کرتا تو ان متضاد ترنگوں کو ایک واحد ترنگ میں دیکھ سکتا تھا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ اس زمانے کی ہر انسانی تنظیم کا اتنا ہی مخالف تھا، اور یوں، ان سے دور بھاگتا تھا اور نئی تنظیمیں بنانے کے تجربے کرتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی صحیح، یا دوسری تنظیموں سے زیادہ مختلف نہیں لگتی تھی۔ اس کی مکمل وحشت کے مستقل ادوار اسی دکھ سے پھوٹتے تھے۔

اس کے ذہن میں ایک عالم گیر سماج کا تصور تھا، اور ہر بار وہ لوگوں کو یکجا کرنے میں اپنے آپ کو مصروف کر دیتا۔ یہ یکجائی یا تو کسی حتمی مقصد کے لیے ہوتی، جیسے آگ سے حفاظت یا بھیڑیوں سے بچاؤ، یا پیشوں کی برادریوں کے لیے، جیسے بے عیب پہیہ سازوں یا روشن خیال چرم فروشوں کی انجمنیں۔ چونکہ وہ انھیں ہمیشہ جنگل میں رات کے وقت ایک درخت کے گرد اکٹھا کرتا، جہاں سے وہ ان سے مخاطب ہوتا تھا، لہٰذا ہمیشہ سازش، فرقے یا کفر کی فضا موجود رہتی۔ اس فضا میں اس کی تقریریں خصوصی کے بجائے آسانی سے عمومی انداز میں ل جاتیں، اور بڑی سہولت سے کسی جسمانی پیشے کے سادہ قواعد سے برابر، آزاد اور انصاف پسند لوگوں کی ایک عالمی جمہوریہ قائم کرنے کے منصوبے کی طرف مڑ جاتیں۔

Scanned with CamScanner

لہٰذا میسنری میں کوسیمو نے اسی عمل کو دہرانے کے سوا شاید ہی کچھ کیا ہو، جو دوسری خفیہ یا نیم خفیہ تنظیموں میں، جن کا وہ رکن رہا تھا، کر چکا تھا۔ جب یورپ میں اپنے بھائیوں سے ملنے کے لیے لندن کی گرینڈ لاج کا فرستادہ لارڈ لیور پلک نامی شخص، میرے بھائی کے ماسٹر ہوتے ہوئے، اومبروسا آیا تو اسے کوسیمو کے غیر روایتی پن سے اتنا دھچکا پہنچا کہ اس نے لندن کو لکھا کہ اومبروسا میسنری اسکاٹ لینڈ کی رسوم پر عامل ضرور کوئی نئی میسنری ہے، جسے ہینوور کے تخت کے خلاف بطور پروپیگنڈا استعمال کرنے کے لیے، اسٹوارٹ مالی مدد فراہم کر رہے ہیں تاکہ جیکو بن عہد کا احیا ہو سکے۔

اس کے بعد دو ہسپانوی مسافروں والا واقعہ پیش آیا، جنھوں نے بارتولومیو کاوانیا سے اپنا تعارف میسنوں کے طور پر کرایا، جس کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ لاج کے ایک اجلاس میں مدعو کیے جانے پر انھوں نے سب کچھ معمول کے مطابق پایا۔ درحقیقت انھوں نے کہا کہ یہ بالکل اورینٹ آف میڈرڈ کی طرح ہے۔ یہی وہ بات تھی جس نے کوسیمو کا شبہ ابھارا، جسے خوب معلوم تھا کہ کتنی رسومات اس کی اپنی ایجاد کردہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے جاسوسوں کا پیچھا کر کے انھیں بے نقاب کیا، اور اپنے پرانے دشمن دون سلپیسیو پر فتح پائی۔

بہرکیف، میری رائے یہ ہے کہ طریق عبادت میں یہ تبدیلیاں اس کی اپنی ذاتی ضرورت کا نتیجہ تھیں، کیونکہ معمار کی علامات کے سوا وہ ہر پیشے کی علامتیں اسی آسانی کے ساتھ اختیار کر سکتا تھا۔ درو دیوار والے مکانوں کی نہ تو اسے کبھی ضرورت تھی اور نہ ہی اس نے انھیں تعمیر یا آباد کیا۔

۲۶

اومبروسا کی سرزمین، سرزمین رز بھی تھی۔ میں نے اس کا ذکر کبھی پہلے نہیں کیا، کیونکہ کوسیمو کے تعاقب میں مجھے ہمیشہ اونچے تنوں والی نباتات تک محدود رہنا پڑتا تھا۔ لیکن اومبروسا میں انگور کی بیلوں کی وسیع و عریض ڈھلانیں تھیں اور اگست کے مہینے میں گجرے کی لڑیوں جیسے پتوں تلے، گلابی انگور گاڑھے رس کے خوشوں میں، جو پہلے ہی شراب رنگ ہوتا، ابھر آتے تھے۔ کچھ بیلیں منڈھوں پر تھیں۔ یہ ذکر میں اس لیے کر رہا ہوں کہ عمر گزرنے کے ساتھ کوسیمو اتنا چھوٹا اور ہلکا ہو گیا تھا، اور اس نے اپنا سارا

وزن کسی ایک جگہ ڈالے بغیر اس عمدگی سے حرکت کرنا سیکھ لیا تھا کہ منڈھوں کی افقی پٹیاں اس کا وزن سہار لیتی تھیں۔ یوں وہ بیلوں تک جا سکتا تھا اور اپنے کو ان بلّیوں پر سہارتے ہوئے جو اسکاراس' کہلاتی ہیں، کام کر سکتا تھا، جیسے سردیوں میں، جب بیلیں خاردار تار کے گرد عیاں قدیم تحریروں کی طرح ہوتی ہیں، شاخوں کو یا گرمیوں میں گھنے پتوں کو چھانٹ سکتا تھا یا کیڑے مکوڑوں پر نظر رکھ سکتا تھا، اور پھر ستمبر میں فصل کی جمع آوری میں مدد کر سکتا تھا۔

انگور جمع کرنے کے لیے اومبروسا کی ساری آبادی تاکستانوں میں نکل آتی تھی، اور بیلوں کا ہرا رنگ ہر کہیں سایوں اور پھندنے دار ٹوپیوں کے شوخ چمک دار رنگوں سے بیچ رنگا ہو جاتا۔ خچربان ٹوکریاں بھر بھر کے بڑے بڑے ٹوکروں میں ڈالتے اور انھیں ناندوں میں خالی کرتے۔ دوسری بھری ہوئی ٹوکریاں کئی محصول جمع کرنے والے لے جاتے، جو ناظروں کی ٹولیوں کے ساتھ مقامی اشرافیہ، حکومتِ جمہوریۂ جینوآ، پادریوں اور دیگر عشروں کے لیے وصولی کرنے آتے تھے۔ ہر سال کوئی نہ کوئی جھگڑا ہوتا تھا۔

یہ سوال کہ فصلوں کے کون سے حصے مختص کیے جائیں، انقلابِ فرانس کے وقت ''کتبِ شکایات'' میں احتجاجوں کی بنیادی وجہ کے طور پر درج تھا۔ اس طرح کی کتابیں، گو وہ یہاں قطعاً بے مصرف تھیں، محض آزمائش کے لیے اومبروسا میں بھی بھری گئیں۔ یہ تجویز بھی کوسیمو کی تھی۔ اس وقت وہ لاج کے جلسوں میں شرکت اور ان بوڑھے ٹھس میسنوں کے ساتھ بحث و مباحث کرنا چھوڑ چکا تھا۔ وہ چوک میں درختوں پر موجود رہتا، اور ساحلوں اور نواح کے دیہاتی علاقوں کے لوگ خبروں کی وضاحت کے لیے جوق در جوق نیچے جمع ہو جاتے، کیونکہ اس کے پاس ڈاک کے ذریعے اخبار آتے تھے، اس کے علاوہ کئی دوست اسے خط بھی لکھا کرتے تھے، جن میں ماہرِ فلکیات بیلی (Bailly)، جو بعد ازاں پیرس کا میئر بنایا گیا، اور انجمن کے دیگر اراکین بھی شامل تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی بات پیش آتی: نیکر (Necker)، اور ٹینس کورٹ، باستیل (Bastille) اور اپنے سفید گھوڑے پر لفایت (Lafayette)، اور اردلی کے بہروپ میں شاہ لوئی۔ کوسیمو ایک شاخ سے دوسری پر کودتے ہوئے، ہر خبر کو اداکاری سے واضح کر کے دکھاتا۔ ایک شاخ پر وہ سر منبر میرابو (Mirabeau) ہوتا، تو دوسری پر جیکوبنز میں مرات (Marat)، اور پھر ایک اور پر ورسائی میں شاہ لوئی، جو پیرس سے فوجی چال چلتی ہوئی آنے والی خواتینِ خانہ کو سرخ

Scanned with CamScanner

فرنجیائی ٹوپی پہن کر خوش کر رہا ہوتا۔
یہ واضح کرنے کے لیے کہ ''کتبِ شکایات'' کیا ہوتی ہیں، کوسیمو نے کہا، ''آؤ، ہم بھی ایک ایسی کتاب بنائیں۔'' اس نے ایک اسکول کی نوٹ بک لی اور اسے ڈوری کے ذریعے درخت پر لٹکا دیا۔ ہر کوئی وہاں آتا اور جو بھی اسے غلط لگتا، نوٹ بک میں لکھ دیتا۔ ہر طرح کی باتیں سامنے آنے لگیں: مچھیروں نے مچھلی کی قیمت کے بارے میں لکھا، انگور باغ والوں نے عشروں کے بارے میں اور چرواہوں نے چراگاہوں کی حدود کے بارے میں، اور جنگل باسیوں نے پنچایت کے جنگلوں کے بارے میں۔ اور پھر وہ لوگ تھے جن کے عزیز قید خانوں میں تھے، اور وہ جنھیں کسی جرم کی وجہ سے کوڑوں کی سزا ملی تھی، اور وہ جنھوں نے عورتوں کے چکر میں امرا کے لیے کوڑے کھائے تھے۔ یہ سلسلہ بے انت تھا۔ کوسیمو نے سوچا کہ بھلے یہ ''کتابِ شکایات'' ہی ہو، اسے اس درجہ اداس کن تو نہیں ہونا چاہیے۔ اور اسے یہ خیال آیا کہ ہر کسی سے اپنی سب سے پسندیدہ بات لکھنے کو کہا جائے۔ اور ہر کوئی دوبارہ اپنے خیالات لکھنے لگا، بلکہ کچھ لوگوں نے تو خاصی اچھی طرح لکھا۔ ایک شخص نے مقامی کیکوں کے بارے میں لکھا اور ایک دوسرے نے مقامی سوپ کے بارے میں۔ کسی کو ایک گوری حسینہ چاہیے تھی، کسی کو دو سانولیاں۔ کوئی سارا دن سو کر گزارنا چاہتا تھا۔ کوئی سال بھر کھمبیاں تلاش کرتا رہنا چاہتا تھا۔ کچھ کو چار گھوڑوں والی گاڑی چاہیے تھی، کچھ کے لیے ایک بکری ہی کافی تھی۔ کچھ اپنی مردہ ماں کو دوبارہ دیکھنے کے خواہاں تھے، کچھ اولمپس میں دیوتاؤں سے ملنے کے۔ درحقیقت، دنیا کی ہر اچھی بات اسکول کی کاپی میں لکھی گئی، یا اس کی تصویر بنائی گئی، یا رنگوں میں مصوری بھی کی گئی کیونکہ بہت سارے لوگ لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کوسیمو نے بھی ایک نام — ویولا کا نام — لکھا۔ وہ نام جسے برسوں سے وہ ہر کہیں لکھ رہا تھا۔

یہ ایک عمدہ بھری ہوئی اسکول کی کاپی تھی۔ کوسیمو نے اسے ''کتابِ شکایات و مشمولات'' کا نام دیا۔ لیکن جب یہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بھر گئی تو وہ اسمبلی ہی نہ رہی جہاں اسے بھیجا جاتا۔ اس طرح یہ ڈوری کے ذریعے درخت پر لٹکی رہی اور جب برسات آئی تو اس پر دھبے پڑنے لگے اور اس کا رنگ اڑنے لگا۔ اس منظر سے اومبروسائیوں کا خون اپنی خستہ حالی پر کھول اٹھتا، اور ان کے اندر بغاوت کی خواہش سر اٹھانے لگتی۔

Scanned with CamScanner

سچ تو یہ ہے کہ انقلابِ فرانس کے تمام اسباب ہمارے درمیان بھی موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہم فرانس میں نہیں تھے۔ اور ہمارے ہاں انقلاب نہیں تھا۔ ہم ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں ہمیشہ اسباب دیکھے جاتے ہیں، نتائج کبھی نہیں۔

بایں ہمہ ہم نے اومبروسا میں کافی سنسنی خیز زمانہ گزارا۔ ریپبلکن آرمی آسٹریا والوں سے عین ہماری ناک تلے برسرِ پیکار تھی۔ ماسینا (Massena) کولاردینٹے (Collardente) میں، لاآرپ (Laharpe) نرویا (Nervia) میں، اور موریت (Mouret) ساحلی سڑک پر محوِ جنگ تھے۔ نپولین اس وقت توپ خانے کا محض ایک جنرل تھا اور ہوا کے دوش پر اومبروسا پہنچنے والی وہ گڑگڑاہٹیں جو ہم بدحواس ہو کر سنتے تھے، اسی شخص کی پیدا کردہ تھیں۔

ستمبر میں انگور جمع کرنے کی تیاری پھر ہونے لگی۔ اور اس بار لوگ کوئی خفیہ و خوفناک منصوبہ بناتے لگ رہے تھے۔

ہر دروازے پر جنگ کے مشورے کیے جا رہے تھے:

''انگور تیار ہیں!''

''تیار! ہاں، واقعی!''

''تیار سے تیار! انھیں توڑنے کی ضرورت ہے!''

''ہم انھیں توڑنے جائیں گے!''

''ہم سب تیار ہیں۔ تم لوگ کہاں ہو گے؟''

''پُل کے ادھر انگور باغ میں۔ اور تم؟ اور تم؟''

''کاؤنٹ پینا کے ہاں۔''

''میں چکی کے ساتھ والے انگور باغ میں۔''

''تم نے ناظروں کی تعداد دیکھی؟ جیسے کستورے انگوروں پر ٹھونگیں مارنے کو اتر آئے ہوں!''

''لیکن اس سال وہ ٹھونگیں نہیں مار سکیں گے!''

''اگر کستورے بہت زیادہ ہیں تو ہم شکاری بھی اتنے ہی ہیں!''

''کچھ لوگوں میں ساتھ دینے کی جرأت نہیں ہے! کچھ لوگ فرار ہو رہے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

’’ایسا کیوں ہے کہ اتنے سارے لوگ اس سال انگور جمع کرنے سے خوش نہیں ہیں؟‘‘

’’وہ اس کام کو ملتوی کرنا چاہتے تھے۔لیکن اب انگور پک چکے ہیں!‘‘

’’انگور پک چکے ہیں!‘‘

تاہم اگلے روز انگور جمع کرنے کا کام خاموشی سے شروع ہوا۔انگور باغ، پتوں کی لڑیوں تلے لوگوں کی قطاروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔لیکن فضا میں کسی گیت کی گونج نہ تھی۔بس کبھی کبھار ایک آدھ آواز ابھرتی، یا ’’تم یہاں بھی؟انگور تیار ہیں!‘‘ کی صدا آتی۔یا لوگوں کی ٹولیاں ادھر سے ادھر ہوتیں۔اداسی کا تاثر آسمان میں بھی نمایاں تھا جو مکمل طور سے بادلوں سے بھرا نہ تھا بلکہ ابر آلود تھا۔اگر کوئی آواز کوئی گیت چھیڑتی بھی تو دوسری آوازوں کے ساتھ نہ دینے کی وجہ سے وہ جلد ہی فضا میں تحلیل ہو جاتا۔خچربان انگوروں سے بھری ٹوکریاں ناندوں تک لے جا رہے تھے۔دیگر سالوں میں اشرافیہ، پادری اور حکومت کے حصے پہلے ہی سے علیحدہ رکھ دیے جاتے تھے، مگر اس سال لوگ انھیں بھولے ہوئے لگتے تھے۔

محصول جمع کرنے والے، جو عشر وصول کرنے آئے تھے، گھبرائے ہوئے تھے۔وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اب کیا کریں۔جتنا زیادہ وقت گزر رہا تھا، اتنا ہی کم پیش آ رہا تھا۔کچھ پیش آنے کے بارے میں وہ جتنا زیادہ محسوس کر رہے تھے، انھیں اتنا ہی زیادہ یہ احساس ہو رہا تھا کہ انھیں کچھ کرنا ہے، مگر کیا کرنا ہے، وہ اس بارے میں اتنا ہی کم سمجھ رہے تھے۔

کوسیمو اپنی بلی جیسی چال سے منڈھوں پر چل رہا تھا۔وہ قینچی لیے ہوئے تھا، اور یہاں وہاں سے یونہی ایک آدھ گچھا کاٹ کے نیچے جمع کرتے ہوئے مرد و زن کو، ہر ایک سے دھیمی آواز میں کچھ کہتے ہوئے پیش کر رہا تھا۔

ناظروں کا سربراہ اس تناؤ کو مزید برداشت نہ کر سکا۔اس نے کہا، ’’ہوں، اچھا، تو پھر، عشروں کے بارے میں کیا خیال ہے؟‘‘ ابھی اس نے یہ الفاظ مشکل ہی سے ادا کیے ہوں گے کہ وہ ان پر افسوس کرنے لگا۔انگور باغ ایک گہری آواز سے، جو جزوی چیخ تھی اور جزوی سسکار، گونج اٹھے۔یہ ایک انگور جمع کرنے والا تھا جو گھونگھے کا خول بجا کر ساری وادی کو خبردار کر رہا تھا۔ہر پہاڑی سے مشابہ آوازیں جواب دے رہی تھیں۔انگور جمع کرنے والوں نے گھونگھوں کے خول بگل کی طرح بلند کر رکھے تھے، اور

Scanned with CamScanner

ایک منڈھے کی بلندی سے کوسیمو نے بھی۔

بیلوں کی قطاروں کے ساتھ ساتھ ایک گیت گونجنے لگا، جو پہلے پہل بے قاعدہ اور بے آہنگ تھا۔ یوں اسے سمجھنا مشکل تھا۔ پھر آوازیں ایک ہو کر ہم آہنگ ہو گئیں۔ انھوں نے دھن کو جذب کیا اور یوں گانے لگیں گویا کہ دوڑ رہی ہوں، اُڑ رہی ہوں اور مردوزن، جو بیلوں اور ہر بلّی پر بیلوں کے جھنڈ اور انگوروں کے درمیان نیم مستور، بے حس وحرکت کھڑے تھے، دوڑتے لگ رہے تھے۔ اور انگور اپنے کو ناندوں میں پھینک کر خود کچلتے ہوئے اپنے کو شراب بناتے ہوئے لگ رہے تھے۔ ہوا، بادل، دھوپ، سب کے سب غیر تخمیر شدہ رس میں ڈھل گئے تھے، اور اب گیت سمجھ میں آنے لگا تھا، پہلے پہل سُر اور پھر کچھ لفظ بھی، جو نوعمر مرد اپنے سرخ ننگے پیروں سے انگور کچلتے ہوئے گا رہے تھے۔ لڑکیاں گھنی ہریالی میں اپنی خنجر نما تیز قینچیاں گھونپتے ہوئے انگور کے خوشوں کے بل کھائے ڈنٹھلوں کو گھائل کرتے ہوئے گا رہی تھیں۔ شکنجے میں دبائے جانے کے لیے تیار ڈھیروں پھل کے اوپر اڑتے ہوئے مکھیوں کے بادل گا رہے تھے۔ ناظروں کا پیمانۂ صبر اب لبریز ہو گیا تھا۔ انھوں نے چلاّ کہا، ''بند کرو! خاموش! بہت ہو چکا! اب جو بھی گائے گا ہم گولی چلا دیں گے!'' اور وہ فضا میں گولیاں چلانے لگے۔

جواب میں توپوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی، جو پہاڑیوں پر جنگ کے لیے صف بستہ دستوں کی طرف سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اومبروسا پھٹ پڑا تھا۔ انجیر کے ایک اونچے درخت کی چوٹی سے گھونگھے کا خول بجا کر کوسیمو نے حملے کا اعلان کیا۔ پہاڑی کے ڈھلوانوں پر ہر طرف لوگ متحرک تھے۔ اب انگور کی فصل اور ہجوم میں تفریق کرنا غیر ممکن تھا۔ مرد، انگور، عورتیں، پتوں کی لڑیاں، بلّیاں، بندوقیں، ٹوکریاں، گھوڑے، خاردار تار، مٹھیاں، خچروں کی دولتیاں، چوچیاں... سب کے سب گا رہے تھے۔

''یہ رہے تمھارے عشر!'' اس کا اختتام یوں ہوا کہ ناظر اور محصول جمع کرنے والے انگوروں سے بھری ناندوں میں سر کے بل ٹھونس دیے گئے۔ ان کی باہر نکلی ہوئی ٹانگیں اندھادھند حرکت کر رہی تھیں۔ وہ سر سے پاؤں تک انگور کے رس میں لتھڑے، اپنی بندوقوں، بارود کی تھیلیوں اور مونچھوں پر چپکے ہوئے بیج، چھلکے اور ڈنٹھل لیے، کچھ بھی وصولی کیے بغیر لوٹ گئے۔

پھر انگوروں کی جمع آوری ایک تقریب مسرت میں ڈھل گئی۔ ان سب کو اس بات کا یقین تھا کہ انھوں نے جاگیردارانہ استحقاق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے ہیں۔ دریں اثنا ہم رئیسوں اور چھوٹے

Scanned with CamScanner

نوابوں نے خود کو اپنے گھروں میں مورچہ بند کر لیا تھا۔ ہم پوری طرح مسلح تھے اور آخری دم تک مقابلہ کرنے پر آمادہ تھے۔ (درحقیقت، میں نے فقط اپنی چار دیواری کے اندر رہنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ سب سے بڑھ کر یوں کہ میں دوسرے رئیسوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں اپنے دجال بھائی سے، جو سارے علاقے میں بدترین شورشی اور جیکو بن مشہور تھا، متفق ہوں۔) لیکن اس روز، جب ایک بار فوجی دستوں اور محصول جمع کرنے والوں کو اٹھا کر پھینک دیا گیا، کسی اور کو گزند نہیں پہنچا۔

ہر کوئی جشن منانے کی تیاری میں محو تھا۔ بلکہ انھوں نے محض فرانسیسی طرز کی تقلید میں ایک شجرِ آزادی بھی بنا ڈالا۔ بس انھیں یہ بات یقین سے نہیں معلوم تھی کہ فرانس کا شجرِ آزادی کیسا تھا۔ اور پھر ہمارے علاقوں میں اس قدر پیڑ تھے کہ نقلی پیڑ لگانا مشکل ہی سے سودمند تھا۔ سو انھوں نے ایک اصلی درخت کو، جو ایک بوقیذار تھا، پھولوں، انگور کے خوشوں، پتوں کی لڑیوں اور ''عظیم قوم زندہ باد!'' کے اعلان ناموں سے آراستہ کر دیا۔ عین اس کی چوٹی سے میرا بھائی، جس کی بلی کے سمور والی ٹوپی پر ایک سہ رنگا طرہ لگا تھا، روسو اور والتیئر پر لیکچر دے رہا تھا جس کا ایک لفظ بھی سنائی نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ نیچے ساری آبادی رقص کرتے ہوئے گا رہی تھی۔

یہ شادمانی مختصر تھی۔ فوجی دستے بڑی تعداد میں آ گئے۔ جینوائی، محصول وصول کرنے اور علاقائی غیر جانب داری کو یقینی بنانے کے لیے۔ اور آسٹریائی بھی، کیونکہ افواہ پھیل چکی تھی کہ اومبروسا کے جیکو بنی اس علاقے کا الحاق ''عظیم عالمی قوم'' یعنی جمہوریہ فرانس سے کرنے والے ہیں۔ باغیوں نے مزاحمت کی کوشش کی۔ دو ایک ناکہ بندیاں بھی کیں، شہر کے دروازے بند کیے... مگر نہیں اس سے زیادہ درکار تھا! فوجی دستے ہر طرف سے علاقے میں در آئے۔ انھوں نے ہر دیہاتی گلی پر چوکیاں بنا لیں اور کوسیمو کے سوا، جسے پکڑنے کے لیے خود ایک شیطان کی ضرورت تھی، اور اس کے ساتھ چند دوسروں کو چھوڑ کر، ان سب لوگوں کو جو شورشی مشہور تھے، قید کر لیا۔

انقلابیوں پر تیز رفتاری سے مقدمہ چلایا گیا، لیکن ملزم یہ دکھانے میں کامیاب رہے کہ اس قضیے سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اور اصل لیڈر وہی لوگ تھے جو فرار ہو گئے ہیں۔ سو ہر ایک کو چھوڑ دیا گیا، خاص طور پر یوں بھی کہ اومبروسا میں تعینات ان تمام دستوں کی وجہ سے مزید کسی شورش کا خوف نہ تھا۔ آسٹریا والوں کا بھی ایک محافظ دستہ بطور ضمانت ٹھہر گیا اور ان کی کمان ہمارے بہنوئی، کاؤنٹ

دیستومیک، باتیستا کے شوہر، کے ہاتھ میں تھی، جو فرانس سے ترکِ وطن کر کے پرووانس کے کاؤنٹ کے عملے میں شامل ہو کر آیا تھا۔

سو، میں نے اپنی بہن باتیستا کو پھر سے راستے میں حائل پایا۔ اس پر میرا ردِعمل کیا ہو سکتا تھا، یہ میں آپ کے تصور پر چھوڑتا ہوں۔ وہ شوہر، گھوڑوں اور اردلیوں کے ساتھ گھر میں بس گئی، اور ہر شام پیرس کی آخری گردن ماریاں بیان کرنے میں گزارنے لگی۔ اس کے پاس گلوٹین کا ایک نمونہ بھی تھا، جس میں سچ مچ کا پھل لگا تھا۔ اپنے دوستوں اور سسرالی عزیزوں کا انجام واضح کرنے کے لیے وہ چھپکلیوں، کنکھجوروں، کیڑوں اور چوہوں تک کے سر قلم کیا کرتی تھی۔ یوں ہم اپنی شامیں گزارتے تھے۔ مجھے کوسیمو پر رشک آتا تھا جو کسی جنگل میں چھپا اپنے شب و روز کھلے آسمان تلے جی رہا تھا۔

۲۷

جنگ کے دوران جنگل میں اپنی سرگرمیوں کے بارے میں کوسیمو کی سنائی ہوئی کہانیاں اتنی زیادہ اور اتنی ناقابلِ یقین ہیں کہ میں واقعی اس کے کسی ایک بیان کو سر بسر تسلیم نہیں کر سکتا۔ سو میں جھوٹ سچ کو اسی پر چھوڑتے ہوئے اس کی کچھ کہانیاں صرف اسی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں:

جنگل میں دونوں مخالف فوجوں کی نگراں ٹولیاں گشت لگایا کرتی تھیں۔ اوپر شاخوں پر سے میں ہر قدم زیرِ درختی میں ٹوٹ پھوٹ کا شور سنتا اور یہ اندازہ لگانے کو ہمہ تن گوش ہو جاتا کہ آیا وہ آسٹریائی ہیں یا فرانسیسی۔

ایک چھوٹے قد کا آسٹریائی لیفٹیننٹ جس کے بال بہت بھورے تھے، سپاہیوں کے ایک گشتی دستے کی کمان کر رہا تھا۔ وہ چوٹیوں، پھندنوں، تسنگے، بیٹوں اور ساق پوشوں سے آراستہ، سینوں پر ایک دوسرے کو قطع کرتی سفید پٹیاں لگائے، بندوقیں اور سنگینیں لیے، مکمل وردیوں میں تھے۔ لیفٹیننٹ انھیں ناہموار راستوں پر ہم آہنگ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے دوہری قطار میں دوڑا رہا تھا۔ جنگل کی حقیقت سے بے خبر مگر احکامات بجالانے میں پریقین، پستہ قد لیفٹیننٹ نقشے پر کھنچی ہوئی لکیروں کے مطابق بڑھ

رہا تھا اور اپنی ناک مسلسل درختوں کے تنوں سے ٹکرا رہا تھا۔ سپاہی موٹی کیلوں والے جوتوں کے ساتھ چکنے پتھروں پر پھسل رہے تھے یا جھاڑ بیریوں سے اپنی آنکھیں نکلوا رہے تھے مگر شاہی اسلحہ کی فوقیت سے ہر لحظہ باخبر تھے۔

وہ بڑے ٹھاٹ دار سپاہی تھے۔ ایک صاف کی ہوئی جگہ، میں صنوبر کے پیڑ پر چھپ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ میرے ہاتھ میں صنوبر کا ایک بھاری مخروط تھا جو میں نے قطار کے آخری آدمی کے سر پہ گرا دیا۔ سپاہی نے بے ساختہ اپنے ہاتھ بلند کیے۔ اس کے گھٹنے خم کھا گئے اور وہ زیرِ درختی کے پودوں کے درمیان زمین پر آ رہا۔ کسی کی نظر نہیں پڑی اور پلٹن آگے بڑھ گئی۔

میں نے پھر انھیں جا لیا۔ اس بار میں نے ایک کارپورل کے سر پہ ایک لپیٹا ہوا خار پشت گرایا۔ کارپورل کا سر پچک گیا اور وہ غش کھا گیا۔ اس بار لیفٹیننٹ نے دیکھ لیا۔ اس نے اسٹریچر لانے کے لیے دو سپاہی بھیج دیے اور آگے بڑھتا گیا۔

گشتی دستہ بڑھتا گیا، اور گویا کہ قصداً، سارے جنگل میں سب سے گھنی صنوبری جھاڑیوں میں الجھ گیا۔ وہاں بھی ایک نئی گھات ان کی منتظر تھی۔ میں نے کچھ سنڈیاں ایک کاغذ پر جمع کر رکھی تھیں۔ یہ نیلے رنگ کی بال دار سنڈیاں تھیں جن کے مس سے جلد اس طرح سوج جاتی ہے کہ بچھو بوٹی کو چھونے سے بھی نہ سوجتی ہوگی۔ میں نے لگ بھگ سو کے قریب سنڈیاں ان کے اوپر گرا دیں۔ پلٹن گزر گئی اور گھنی جھاڑیوں میں غائب ہو گئی۔ جب وہ دوبارہ ظاہر ہوئی تو ہر سپاہی اپنے کو کھجا رہا تھا اور ہر ایک کے ہاتھ اور گھٹنے چھوٹے چھوٹے سرخ چھالوں سے بھرے ہوئے تھے۔ تاہم وہ بڑھتے گئے۔

شاندار فوجی، شاندار افسر، اس کے لیے سارا جنگل اس قدر عجیب تھا کہ وہ یہاں کوئی غیر معمولی چیز شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح مفتخر اور غیر مغلوب، وہ اپنی نقصان رسیدہ جمعیت کے ساتھ بڑھتا گیا۔ پھر میں نے جنگلی بلیوں کے ایک خاندان سے رجوع کیا۔ میں نے انھیں کچھ دیر ہوا میں گھمایا تاکہ ان میں ہیجان پیدا ہو جائے اور پھر انھیں دُموں کے ذریعے پھینکا۔ بلا کا شور مچا، خاص کر بلیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ پھر خاموشی چھا گئی اور جنگ بندی ہو گئی۔ آسٹریائی اپنے زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ پھر پٹیوں سے سفید گشتی دستہ اپنی مسافت پر دوبارہ چل نکلا۔

''اب واحد راستہ یہ ہے کہ انھیں قیدی بنانے کی کوشش کی جائے!'' میں نے ان سے آگے نکلنے

کی جلدی کرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا، میں امید کر رہا تھا کہ کوئی فرانسیسی گشتی دستہ ملے تو اسے دشمن کی نزدیکی سے خبردار کروں۔ مگر فرانسیسی کچھ وقت سے اس محاذ پر زندگی کی کوئی علامت نہیں دکھا رہے تھے۔

ایک پھسلنی جگہ پر سے گزرتے ہوئے میں نے کوئی چیز حرکت کرتے دیکھی۔ میں نے رک کر اپنے کان لگائے تو ایک طرح کے بلبلے بھرتے ہوئے چشمے کی آواز سنائی دی، جو ایک مسلسل قلقل میں ڈھلتی گئی اور پھر میں الفاظ شناخت کرنے لگا، ''مگر پھر... مقدس نام... مجھے تنگ... تم تو سردرو... کیا...'' نیم تاریکی میں دائیں بائیں نظر ڈالتے ہوئے میں نے دیکھا کہ نیچے بیشتر نرم ہریالی بال دار لمبی ٹوپیوں اور لہراتی ہوئی مونچھوں اور داڑھیوں پر مشتمل ہے۔ یہ فرانسیسی سواروں کا ایک دستہ تھا۔ جاڑوں کی مہم کے دوران نمی جذب کرنے کے باعث، بہار آتے آتے ان کے ہیٹوں سے پھپھوندی اور کائی پھوٹنے لگی تھی۔

اس فوجی چوکی کا سربراہ لیفٹیننٹ اگر۔ یپاپاپیوں تھا۔ وہ شاعر تھا اور ری پبلکن آرمی میں رضاکار کی حیثیت سے شامل تھا اور اس کا تعلق روآں شہر سے تھا۔ لیفٹیننٹ پاپیوں فطرت کی عمومی نیکی کا قائل تھا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو صنوبر کی سوئیاں، بلوط کے مخروط، کونپلیں اور گھونگھے، جو اس کے آدمیوں پر جنگل سے گزرنے کے دوران چپک جاتے تھے، کچلنے سے منع کر رکھا تھا۔ یہ گشتی دستہ اردگرد کے فطری مناظر سے پہلے ہی اتنا آہنگ تھا کہ اسے پہچاننے کے لیے میری تربیت یافتہ نظر درکار تھی۔

بسرام کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کے درمیان شاعر لیفٹیننٹ، جس کے لمبے بال فوجی ٹوپی کے نیچے لٹوں کی صورت میں اس کے مریل چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے، خطیبانہ انداز میں جنگل سے مخاطب تھا، ''اے بن! اے رات! یہاں میں تیرے بس میں ہوں! کیا ان دلیر سپاہیوں کے ٹخنوں سے ہم کنار تیری سنبل سیاہ کا کوئی ٹرم ڈورا فرانس کی تقدیر کا حامل نہیں ہوسکتا؟ اے والمی! تو کتنی دوری پر ہے!''

میں آگے بڑھا۔ ''معاف کرنا، شہری۔''

''کون ہے؟ کون ہے وہاں؟''

''ان جنگلوں کا ایک وطن دوست، شہری افسر۔''

''ہونہہ! یہاں؟ کہاں؟''

''عین تمھاری ناک کے اوپر، شہری افسر۔''

''سو تو میں دیکھ رہا ہوں۔ تم ہو کون؟ پرند آدمی؟ زن مرغ کی نسل؟ کیا تم کوئی اساطیری مخلوق ہو؟''

Scanned with CamScanner

''میں شہری دی روندو ہوں۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، باپ اور ماں کی طرف سے میں انسانوں کی نسل سے ہوں، شہری افسر۔ در حقیقت میری ماں تخت نشینی کی جنگوں کے دوران ایک بہادر جنگجو تھی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ اے عہد، اے رفعت! مجھے تم پر یقین ہے، شہری۔ میں وہ خبر سننے کے لیے فکر مند ہوں جسے سنانے کے لیے تم آئے ہوئے لگتے ہو۔''

''ایک آسٹریائی گشتی دستہ تمھاری صفوں کو چیر رہا ہے!''

''کیا کہہ رہے ہو؟ تو پھر جنگ ہے! یہی وقت ہے! چشمے زم زم چشمے، آہ تو جلدی ہی خون سے داغ دار ہو جائے گا! اٹھو، اٹھو! ہتھیار اٹھاؤ!''

شاعر لیفٹیننٹ کے حکم پر سوار ہتھیار اور ساز و سامان جمع کرنے لگے، لیکن وہ کھجاتے، تھوکتے اور گالیاں بکتے ہوئے اس بے فکرے اور سست انداز میں حرکت کر رہے تھے کہ میں ان کی فوجی اہلیت کے بارے میں شک میں پڑ گیا۔

''شہری افسر، تم نے کوئی منصوبہ بنایا ہے؟''

''منصوبہ! دشمن پر چڑھائی کا!''

''ہاں، مگر کیسے؟''

''کیسے؟ صفیں قریب قریب رکھ کر!''

''تم مشورہ دینے کی اجازت دو تو میں سپاہیوں کو کھلی ترتیب میں روکے رکھوں گا اور دشمن کے گشتی دستے کو خود دام میں آنے دوں گا۔''

لیفٹیننٹ پاپیوں ایک مرنجاں مرنج شخص تھا۔ اس نے میری تجویز پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ جنگل میں منتشر سوار بمشکل ہی ہریالی کے جھنڈ سے ممیز کیے جا سکتے تھے۔ اس فرق کو محسوس کرنے کے لیے آسٹریائی لیفٹیننٹ یقیناً سب سے کم اہل تھا۔ سامراجی گشتی دستہ بار بار ایک اکھڑ حکم سے دائیں یا بائیں مڑتا ہوا، نقشے پر بنے راستوں کے مطابق رواں تھا۔ اس طرح وہ فرانسیسی سپاہیوں کی موجودگی کو محسوس کیے بغیر ان کے بالکل قریب سے گزر گئے۔ سواروں نے محض پتوں کی سرسراہٹ اور پروں کی پھڑ پھڑاہٹ جیسی قدرتی آوازیں پیدا کرتے ہوئے اپنے کو ایک گھیرا ڈالنے والی چال میں مجتمع کر لیا۔

Scanned with CamScanner

میں اوپر سے ان کے لیے سنتری کا فرض انجام دیتا رہا اور دشمن کی نقل وحرکت کی اطلاع دینے اور اپنے سپاہیوں کو مختصر راستے دکھانے کے لیے سیٹیاں بجاتا اور قاقموں کی چیخیں نکالتا رہا۔ آسٹریائی ناگہاں ایک دام میں پھنس گئے۔

اچانک انھوں نے ایک درخت سے آتی ہوئی اونچی آواز سنی۔ ''وہیں رک جاؤ! آزادی، برابری اور بھائی چارے کے نام پر میں تم سب کو قیدی قرار دیتا ہوں!'' اور شاخوں کے درمیان ایک لمبی نال والی شکاری بندوق لہراتا ہوا ایک انسانی بھوت نمودار ہوا۔

''آہا! قوم پائندہ باد!'' لیفٹیننٹ پاپیوں کی سرابرہی میں اردگرد کی تمام جھاڑیوں سے فرانسیسی سوار اگ آئے۔

آسٹریائیوں کی طرف سے دقیق گالیاں گونجنے لگیں مگر اس سے قبل کہ انھیں ردِعمل کا موقع ملتا، انھیں غیر مسلح کر دیا گیا۔ زرد، مگر سربلند آسٹریائی لیفٹیننٹ نے اپنی تلوار اپنے دشمن ہم کار کے حوالے کر دی۔

میں ریپبلکن آرمی کے لیے ایک کارآمد مددگار بن گیا، لیکن میں جنگل کے جانوروں کی مدد سے تنہا کام کرنے کو ترجیح دیتا تھا، اس وقت کی طرح جب میں نے ایک آسٹریائی دستے کے سروں پر بھڑوں کا چھتا گرا کر انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

میری شہرت آسٹریائی چھاؤنی تک پھیل گئی اور اس درجہ مبالغہ آرائی کے ساتھ کہ جنگل مسلح جیکو بنوں سے بھرے ہوئے کہے جانے لگے جو ہر درخت کی چوٹی پر چھپے ہوئے تھے۔ وہ شاہی اور استبدادی دستے جہاں کہیں بھی جاتے حد درجہ خوف زدہ رہتے۔ چھلکوں سے جوز گرنے کی ہلکی سی آواز اور گلہری کی مدھم سی چیں پر بھی اپنے آپ کو جیکو بنوں میں گھرا ہوا محسوس کرتے اور اپنا راستہ بدل لیتے۔ اس طرح محض سرسراہٹیں اور آوازیں پیدا کر کے، میں پہاڑی اور آسٹریائی دستوں کو راستہ بدلنے پر مجبور کر دیتا اور کان سے پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا تھا۔

ایک دن میں ان کے ایک دستے کو گھنی خاردار جھاڑیوں تک لے گیا اور ان سب کو راستے سے بھٹکا دیا۔ جھاڑیوں میں جنگلی خنزیروں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ توپوں کی گھن گرج کے باعث پہاڑوں

سے پسپائی پر مجبور خنزیر جنگلوں میں پناہ لینے کے لیے گلوں کی صورت میں نیچے اتر رہے تھے۔ راہ گم کردہ آسٹریائی اپنے سامنے ہاتھ بھر پرے دیکھنے سے بھی عاری بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ اچانک دہلا دینے والی چیخیں نکالتے ہوئے بالوں بھرے خنزیر ہر طرف اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ تھوتھنیاں آگے بڑھائے ہوئے وہ ہر سپاہی کے گھٹنوں کے درمیان جا پڑے اور انھیں دھکیل کر سر کے بل نیچے گرا دیا۔ پھر اپنے نوک دار پنجوں سے انھیں کچلنے اور اپنے لمبے دانتوں سے ان کے پیٹ پھاڑنے لگے۔ ساری پلٹن میں افراتفری پھیل گئی۔ میں اور میرے ساتھی درختوں پر سے اپنی بندوقوں کے ذریعے ان کا تعاقب کرنے لگے۔ جو سپاہی چھاؤنی تک پہنچ سکے انھوں نے بتایا کہ یا تو زلزلے نے اچانک ان کے قدموں تلے زمین کو شق کر دیا تھا، یا زمین کی اندرونی تہوں سے جیکو بنوں کا ایک جتھا نمودار ہوا تھا، کیونکہ نصف آدمی اور نصف جانور یہ جیکو بن بھتنوں کے سوا کچھ اور نہ تھے، جو درختوں پر رہتے تھے یا پھر جھاڑیوں کے درمیان۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، میں اپنے منصوبوں پر تن تنہا عمل کرنے کو ترجیح دیتا تھا یا پھر اولمبروسا کے چند ساتھیوں کے ساتھ، جنھوں نے انگوروں کی فصل کے بعد میرے ساتھ جنگل میں پناہ لی تھی، یہ کام کیا کرتا تھا۔ فرانسیسی فوج کے ساتھ جہاں تک ممکن تھا، میں کم سے کم تعلق رکھنے کی کوشش کرتا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ فوجیں کیا ہوتی ہیں؛ وہ جب بھی بڑھتی ہیں کچھ نہ کچھ تباہی ضرور آتی ہے۔ لیکن لیفٹیننٹ پاپیوں کے سپاہیوں کو میں کسی حد تک پسند کرنے لگا تھا اور اس بات پر فکرمند تھا کہ ان کا کیا بنے گا، کیونکہ محاذ کی بے حرکتی شاعر کے زیر کمان دستے کے لیے تباہ کن ہونے کا خطرہ بن رہی تھی۔ سپاہیوں کی وردیوں پر کائی اگنے لگی تھی اور بعض اوقات تو جھاڑیاں بھی۔ اونچی ٹوپیوں کی چوٹی پر الوؤں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ یا پھر ان پر وادی کے سوسن کھلنے لگے تھے۔ مٹی سے لتھڑ کر، ان کے اونچے بوٹ ٹھوس بوجھ بن گئے تھے۔ ساری پلٹن کوئی دم جڑ پکڑنے والی تھی۔ فطرت کی طرف لیفٹیننٹ اگریپا پاپیوں کا مغلوب رویہ بہادر آدمیوں کے اس دستے کو جانور اور نباتات کے پگھلاؤ میں دفن کر رہا تھا۔

انھیں جگانے کی ضرورت تھی۔ لیکن کیسے؟ میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں اسے تجویز کرنے لیفٹیننٹ پاپیوں کے پاس گیا۔ شاعر خطیبانہ انداز میں چاند سے مخاطب تھا:

"اے توپ کی نال جیسے گول چاند! بارود سے ملے جھٹکے کے خاتمے پر آہستگی وخموشی سے آسمان پر گردش کرتے ہوئے توپ کے گولے جیسے چاند! گرد اور چنگاریوں کا ایک اونچا بادل اٹھاتے ہوئے،

Scanned with CamScanner

دشمن کی فوجوں اور تختوں کو غرقاب کرتے ہوئے اور مجھ پر ہم وطنوں کے عدم اعتماد کی ٹھوس دیوار میں میرے لیے ناموری کا در کھولتے ہوئے چاند! تم کب ہم پر پھٹو گے؟ اے رواں! اے چاند! اے مقدر! اے ریت! اے مینڈکو! اے دوشیزاؤ! اے زندگی!"

میں بولا، "شہری..."

پاپیوں نے، جو میری مستقل مداخلت پر جھنجھلا رہا تھا، تیکھے پن سے کہا، "کیا ہے؟"

"شہری افسر، میں تو بس تمھارے آدمیوں کو جھنجھوڑنے کا ایک طریقہ تجویز کرنا چاہتا تھا۔ یہ کاہلی ان کے لیے خطرناک ہو رہی ہے۔"

"میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ ایسے طریقے ہوتے، شہری۔ سرگرمی وہ شے ہے جس کے لیے میں مر رہا ہوں، تم دیکھ ہی رہے ہو۔ مگر تمھارا یہ طریقہ ہے کیا؟"

"پسّو، شہری افسر۔"

"مجھے تمھارا و ہم دور کرتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے، شہری۔ ری پبلکن آرمی میں پسّو نہیں ہیں۔ ناکہ بندی اور مہنگے مصارفِ زندگی کے نتیجے میں، وہ سب کے سب قحط سے مر چکے ہیں۔"

"میں تھوڑے بہت مہیا کر سکتا ہوں، شہری افسر۔"

"میں نہیں کہہ سکتا کہ تم کوئی بامعنی بات کر رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو۔ بہر حال میں اس معاملے سے اعلیٰ کمان کو آگاہ کر دوں گا۔ پھر دیکھتے ہیں۔ شہری، میں جمہوری مقصد کے لیے تمھاری مدد کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اے رفعت! اے رواں! اے پسّو! اے چاند!" اور وہ جوش میں چلاّتا ہوا رخصت ہو گیا۔

مجھے احساس ہو گیا کہ مجھے خود ہی پیش قدمی کرنی ہو گی۔ لہٰذا میں نے ڈھیر سارے پسّو جمع کیے۔ جونہی کوئی فرانسیسی سوار دکھائی دیتا، میں اپنی گوپھن سے اس کے کالر کا نشانہ لیتے ہوئے ایک پسّو اس پر داغ دیتا اور کوشش کرتا کہ پسّو کالر کے اندر گرے۔ پھر میں ساری پلٹن پر مٹھیاں بھر بھر کے پسّو چھڑکنے لگا۔ یہ ایک خطرناک مہم تھی کیونکہ اگر میں ایسا کرتے ہوئے پکڑا جاتا تو وطن دوست ہونے کی میری شہرت بھی مجھے بچا نہ پاتی۔ وہ مجھے گرفتار کر لیتے اور گھسیٹ کر فرانس لے جاتے جہاں پٹ (Pitt) کے ایلچی کے طور پر میرا سر قلم کر دیا جاتا۔ اس کے بجائے میری مداخلت خدا کا فضل ثابت ہوئی۔ جلد ہی پسّوؤں کی خارش نے سواروں میں اپنے کو کھجانے، ہٹو لنے اور پسوؤں سے نجات پانے کی ایک انسانی اور

مہذب طلب کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے اپنے کائی والے کپڑے اور سانپ کی چھتریوں اور مکڑی کے جالوں بھرے تھیلے اور جھولے اتار پھینکے۔ غسل کیا، داڑھی بنائی اور بال سنوارے؛ سچ پوچھو تو اپنی انفرادی انسانیت کے ادراک کی بازیافت کی اور تہذیب سے دوبارہ آشنا ہونے کے ساتھ فطرت کے بدصورت پہلو سے آزادی کا احساس حاصل کیا، اور مدتوں سے بھولی ہوئی سرگرمی اور جنگجوئی ان کے متحرک ہونے کے لیے مہیج بن گئیں اور جب حملہ ہوا تو وہ اس نئی لگن سے پُر تھے۔ جمہوریہ کی افواج دشمن کی مزاحمت پر غالب آئیں اور محاذ کو سر کرتی ہوئی ڈیگو (Dego) اور میلیسیمو (Millesimo) کی تسخیر کے لیے بڑھتی گئیں...

۲۸

ہماری بہن اور شاہ پسند تارک وطن دیستومیک ریپبلکن آرمی کے ہاتھوں پکڑے جانے سے بچنے کے لیے عین وقت پر اومبروسا سے فرار ہو گئے۔ اومبروسا کے لوگ انگوروں کی جمع آوری کے زمانے میں لوٹے ہوئے لگتے تھے۔ انھوں نے شجرِ آزادی لگایا اور اس بار فرانسیسی مثال سے زیادہ مطابقت کا خیال رکھا، یعنی تھوڑا سا شجرِ افراط کی طرح۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کوسیمو، جس نے ایک فریجیائی ٹوپی پہن رکھی تھی، اس درخت کے اوپر گیا، مگر وہ جلد ہی اکتا کر رخصت ہو گیا۔

امرا کے محلات کے اردگرد کچھ دھما چوکڑی مچی۔ اور ''امرا! امرا کو پھانسی دو!'' کی چند پکاریں اٹھیں۔ کچھ تو اپنے بھائی کا بھائی ہونے اور کچھ ہمارے چھوٹی حیثیت کے امیر ہونے کی وجہ سے انھوں نے مجھ سے تعرض نہیں کیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بعد میں وہ مجھے وطن دوست جاننے لگے۔ (اس طرح کہ اگلے تغیر کے وقت میں خود مشکل میں آ گیا۔)

انھوں نے فرانسیسی طرز پر ایک میونسپلٹی قائم کی اور میئر بٹھایا۔ میرے بھائی کو عارضی انتظامی کونسل میں نامزد کیا گیا، حالانکہ بہت سے لوگ، اس کی فاترالعقلی کو دیکھتے ہوئے متفق نہیں تھے۔ پرانے طرز حکومت کے لوگوں نے یہ کہہ کر ہنسی اڑائی کہ کونسل کے سارے لوگ فقط پنجرہ بھر جنونی ہیں۔

انتظامی کونسل کی نشستیں جینوائی گورنر کے سابق محل میں ہوتی تھیں۔ کوسیمو ایک خرنوب کے پیڑ

Scanned with CamScanner

پر، جس کی بلندی کھڑکیوں جتنی تھی، نشست سنبھالتا اور وہاں سے مباحث میں حصہ لیتا۔ بعض اوقات وہ احتجاج کرنے کے لیے مداخلت کرتا اور اپنی رائے کا اظہار کرتا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ روایت پسندوں کی بہ نسبت انقلابی ضابطے کی پابندی پر زیادہ مصر ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوسیمو کے طرزِ عمل کو قابلِ اعتراض اور اس کے طریقِ حاضری کو یہ کہتے ہوئے ناقابلِ عمل قرار دیا کہ اس سے اسمبلی کا سلیقہ خراب ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جب چند سری جمہوریہ جینوآ کی جگہ لیگوریائی جمہوریہ قائم ہوئی تو نئی انتظامیہ کے لیے میرے بھائی کو منتخب نہیں کیا گیا۔

بر سبیلِ تذکرہ، کوسیمو نے ان دنوں ''آئینی منصوبہ برائے ایک شہرِ جمہوری'' نامی کتاب لکھی اور اسے شائع کیا۔ اس میں مردوں، عورتوں، بچوں، گھریلو اور جنگلی جانوروں، بشمول پرندوں، مچھلیوں اور کیڑوں، اور تمام نباتات، خواہ درخت ہوں، سبزیاں یا گھاس، سب کے حقوق کا ایک منشور شامل تھا۔ یہ ایک عمدہ کتاب تھی، جو کسی بھی حکومت کے لیے ایک کارآمد رہنما ثابت ہو سکتی تھی، لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی اور یہ کتاب ایک غیر نافذ قانون رہی۔

تاہم، کوسیمو اپنا زیادہ تر وقت ابھی تک جنگل میں گزارتا تھا، جہاں فرانسیسی فوج کے انجینئری شعبے کے سپاہی توپوں کی نقل و حمل کے لیے ایک سڑک بنا رہے تھے۔ اونچی ٹوپیوں کے نیچے چمڑے کے پیش بندوں میں مدغم ہوتی اپنی لہراتی ہوئی داڑھیوں کی وجہ سے انجینئری شعبے کے سپاہی تمام دوسرے دستوں سے الگ تھے۔ غالباً اس کا باعث یہ تھا کہ وہ اپنے عقب میں (دوسرے دستوں کی طرح) تباہی و بربادی کے منظر نہیں چھوڑتے تھے، اور انھیں ایسے کام سرانجام دینے کی طمانیت حاصل تھی جو باقی رہنے والے تھے، اور ان کی خواہش تھی کہ ان کاموں کو، جس قدر بھی ممکن ہو، بہتر طور سے سرانجام دیں۔ پھر، ان کے پاس سنانے کو بے شمار کہانیاں تھیں۔ وہ قوموں سے ہو کر گزرے تھے، محاصرے اور جنگیں دیکھی تھیں۔ ان میں کچھ تو حالیہ بڑے واقعات، باستیل پر چڑھائی اور گردن ماریوں کے دوران پیرس میں موجود تھے۔ کوسیمو اپنی شامیں ان کی باتیں سنتے ہوئے گزارتا تھا۔ اپنے پھاوڑے اور بلیاں رکھ دینے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے پائپ جلا کر آگ کے گرد بیٹھ جاتے اور پرانی یادیں تازہ کرتے۔

دن میں کوسیمو راستے کی نشان زدگی میں سرویئروں کی مدد کرتا۔ اس کام کے لیے اس سے زیادہ

موزوں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایسی تمام جگہیں جانتا تھا جہاں سے سڑک خفیف ترین اتار چڑھاؤ اور درختوں کے کم سے کم نقصان کے ساتھ گزر سکتی تھی۔ وہ فرانسیسی توپ خانے کی ضرورتوں سے زیادہ ان بے راہگذر خطوں کی آبادی کی ضرورتیں نظر میں رکھتا تھا۔ لوٹ مار کرتے ہوئے بہیمانہ فوجی دستوں کے گزرنے کا کم از کم ایک فائدہ ضرور ہوتا تھا، یعنی آبادی کی قیمت پر ایک سڑک۔

اُس وقت یہ کوئی غلط بات بھی نہیں تھی کیونکہ اس وقت تک قابض دستے، خاص کر جب سے انھوں نے ریپبلکن کی جگہ امپیریل کا نام اپنایا تھا، ہر ایک کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ سب لوگ وطن دوستوں کے پاس شکایت لے کر جاتے۔ ''ذرا دیکھو تو، تمھارے دوست کیا کر رہے ہیں!'' اور وطن دوست بے چارگی سے اپنے ہاتھ بلند کر کے آسمان کی طرف دیکھتے اور جواب دیتے: ''اوہ، اچھا! سپاہی! ہمیں امید کرنی چاہیے کہ یہ سب گزر جائے گا!''

نپولینی دستے خوانچوں سے خنزیروں، گایوں بلکہ بکریوں کا بھی مطالبہ کرتے اور جہاں تک محاصل اور عشروں کا تعلق ہے تو وہ پہلے سے بدتر تھے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جبری بھرتی شروع ہو گئی۔ یہ زبردستی سپاہی بنایا جانا ہم میں سے کوئی نہیں سمجھ پایا، اور مطلوب نوجوان جنگلوں میں پناہ لینے لگے۔

کوسیمو جو بھی مدد کر سکتا تھا اس نے کی۔ جب مالک کسان اپنے مویشی پکڑے جانے کے ڈر سے ویرانوں میں بھیجتے تو کوسیمو جنگل میں ان کی نگرانی کرتا۔ وہ پسائی کے لیے جاتی ہوئی گندم کی خفیہ کھیپوں کی پہرے داری کرتا، تیل نکالنے کے لیے جانے والے زیتونوں کی نگہبانی کرتا تاکہ نپولینی دستے اپنا حصہ نہ لے سکیں۔ وہ فوج میں طلب کیے گئے نوجوانوں کو جنگل میں ایسے غار دکھاتا جہاں وہ چھپ سکیں۔ درحقیقت اس نے دھونس اور دھاندلی کے خلاف لوگوں کا دفاع کیا، حالانکہ اس نے قابض دستوں پر کبھی حملے نہیں کیے۔ ان مسلح جتھوں کے باوجود بھی نہیں جو فرانسیسیوں کے لیے عذابِ جاں بن کر جنگل میں پھرنے لگے تھے۔ ضدی ہونے کے باعث کوسیمو حقیقت کو تسلیم کرنے سے مسلسل انکار کرتا رہا اور آگے فرانسیسیوں کا دوست رہ چکنے کی وجہ سے یہی سوچتا رہا کہ اسے انھیں کا وفادار رہنا چاہیے، ہرچند کہ اتنا کچھ بدل چکا تھا اور جو کچھ اس نے توقع کی تھی سب کچھ اس کے برعکس تھا۔ پھر، ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اب وہ پہلے جیسا نوجوان نہیں رہا تھا، اور کسی بھی فریق کی حمایت میں اب زیادہ سرگرمی نہیں دکھاتا تھا۔

نپولین اپنی تاج پوشی کے لیے میلان گیا اور پھر اس نے اٹلی کے طول وعرض میں چند سفر کیے۔ وہ جس شہر سے بھی گزرا لوگوں نے اس کا زبردست استقبال کیا اور اسے مقامی قابل دید مقامات دکھانے لے گئے۔ اومبروسا کے پروگرام میں انھوں نے ''درختوں پر رہنے والے وطن دوست'' سے ایک ملاقات بھی رکھی، کیونکہ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، ہم میں سے کوئی کوسیمو کی زیادہ پروا نہیں کرتا تھا، لیکن باہر کی دنیا میں، خاص کر غیر ممالک میں، وہ بہت مشہور تھا۔

یہ کوئی اتفاقی ملاقات نہیں تھی۔ خوشگوار تاثر قائم کرنے کے لیے میونسپل کمیٹی برائے تقریبات نے ہر بات پہلے سے طے کر رکھی تھی۔ انھوں نے ایک بڑا عمدہ درخت منتخب کیا۔ وہ چاہتے تو بلوط کا درخت تھے لیکن موزوں ترین جگہ پر صرف اخروٹ کا درخت تھا، لہٰذا انھوں نے اخروٹ کے درخت پر بلوط کی چند شاخیں لگا کر اسے بلوط کا درخت بنا لیا اور فرانسیسی اور لمباردی ترنگوں کے فیتوں، مصنوعی پھولوں اور حاشیوں سے سجا دیا۔ اور ان سب کے درمیان انھوں نے میرے بھائی کو ایک زرق برق جشنی پوشاک پہنا کر بٹھایا، لیکن سر پر اس کے وہی مخصوص بلی کے سمور والی ٹوپی تھی اور کاندھے پر ایک گلہری۔

شہنشاہ ہم رکابوں کی معیت میں وارد ہوا جن کے کاندھوں پر لگے امتیازی نشان دھوپ میں جھلملا رہے تھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ نپولین نے اوپر شاخوں کے درمیان کوسیمو کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں پر دھوپ پڑنے لگی۔ وہ کوسیمو کو مخاطب کر کے چند موزوں فقرے ادا کرنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کیا۔ "...Parmi les forets" وہ ذرا سا ایک طرف کو ہوا کہ دھوپ براہِ راست اس کی آنکھوں میں نہ آئے۔ پھر وہ دوسری طرف کو جھکا کہ کوسیمو کی کورنش نے اس پر سورج کو دوبارہ عیاں کر دیا تھا۔

بونا پارٹ کو اس قدر بے چین دیکھ کر کوسیمو نے نرمی سے پوچھا، ''میرے شہنشاہ، کیا میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''ہاں، ہاں،'' نپولین نے کہا، ''ذرا اس طرف کو رہو تا کہ دھوپ میری آنکھوں میں نہ آئے۔ ہاں، بس اب ٹھیک ہے۔ اب ہلو جلو نہیں...'' پھر وہ خاموش ہو گیا جیسے اسے کوئی خیال آ گیا ہو۔ وہ وائسرائے یوجین کی طرف مڑا۔ ''یہ سب مجھے کسی بات کی یاد دلا رہا ہے... ایسی بات جس سے میرا پہلے کبھی سابقہ پڑ چکا ہے۔''

Scanned with CamScanner

کوسیمواس کی مدد کو آیا۔ "جہاں پناہ، وہ آپ نہیں، سکندرِ اعظم تھا۔"
"آہ، یقیناً!" نپولین بولا، "سکندر اور دیو جانس کی ملاقات!"
"آپ اپنے پلوٹارک کو کبھی نہیں بھولتے، شہنشاہ۔" بیو ہارنس نے کہا۔
"فرق صرف یہ ہے،" کوسیمو نے اضافہ کیا، "کہ اس وقت سکندر نے دیو جانس سے پوچھا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا ہے، اور دیو جانس نے اسے سامنے سے ہٹنے کے لیے کہا تھا..."
نپولین نے انگلیوں کو ایک فوری حرکت دی جیسے اسے وہ فقرہ مل گیا ہو جسے وہ تلاش کر رہا تھا۔ اپنے کو ایک نگاہ سے یقین دہانی کراتے ہوئے کہ اس کے جلوس کے اعلیٰ افسر سن رہے ہیں، اس نے نہایت عمدہ اطالوی میں کہا، "اگر میں شہنشاہ نپولین نہ ہوتا تو میں شہری کو سیمو دی روندو ہونا پسند کرتا!"
وہ مڑا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے ہم رکاب بھی مہمیزوں کی پُرشور جھنکار کے ساتھ پیچھے پیچھے چل پڑے۔
قصہ تمام شد۔ آپ توقع کر سکتے تھے کہ ہفتے بھر کے اندر میرے بھائی کو "کراس آف دی لیجین آف آنر" بھیج دیا جائے گا۔ میرے بھائی کو اعزاز کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی مگر ہم اہلِ خاندان کو اس سے مسرت ہوتی۔

۲۹

زمین پر جوانی جلد گزر جاتی ہے۔ درختوں پر بھی اسے اسی طرح قیاس کیجیے جہاں ہر چیز کے مقدر میں گرنا ہے، خواہ پتے ہوں یا پھل۔ کوسیمو بوڑھا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈ، ہوا اور بارش میں کمزور سائبانوں تلے، یا فقط کھلے آسمان کے نیچے ہمیشہ کسی گھر، آگ یا گرم کھانے کے بغیر گزاری ہوئی وہ ساری راتیں، وہ تمام سال... ٹیڑھی میڑھی ٹانگوں اور بندر جیسے لمبے بازوؤں کے ساتھ پیٹھ پر کُب لیے، سمور کے چوغے میں دھنسا ہوا جس پر سرپوش مستزاد تھا، وہ کسی بالوں بھرے راہب کی طرح ایک سکڑا ہوا بوڑھا ہوا جا رہا تھا۔ جھریوں کے درمیان روشن گول آنکھوں کے ساتھ اس کا دھوپ سے پکا ہوا چہرہ بلوط کی طرح شکن دار تھا۔
بیری سینا میں نپولین کی فوجوں کو شکست فاش ہوئی تھی، برطانوی بیڑا جینوآ میں اتر چکا تھا۔

ہمارے دن شکستوں کی خبروں کے انتظار میں گزرتے تھے۔ کوسیمو او مبروسا میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ جنگل میں ایک صنوبر کے درخت پر ڈیرا جمائے تھا جس کی بلندی سے مشرق کی طرف جاتی ہوئی سپاہیوں کی بنائی ہوئی سڑک نظر آتی تھی جہاں سے توپیں مارینگو کی طرف گئی تھیں۔ اب اس ویران سطح پر صرف گڈریے اپنی بکریوں کے ساتھ یا لکڑی سے لدے ہوئے خچر دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ کس کا انتظار کر رہا تھا؟ نپولین کو وہ دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انقلاب کا کیا انجام ہوا۔ اب بدترین صورت حال کے سوا توقع کرنے کے لیے کچھ اور نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہاں نظریں جمائے تھا جیسے کسی بھی لمحے سڑک کا موڑ کاٹتی ہوئی، جو ابھی تک روسی برف کی قلموں میں ڈوبی تھی، شاہی فوج نمودار ہو گی، اور گھوڑے پر سوار زرد اور بے کل بوناپارٹ، جس کی بے منڈی ٹھوڑی اس کے سینے میں دھنسی ہو گی... وہ صنوبر کے درخت کے نیچے رکے گا (اس کے عقب میں اچانک رو کے گئے قدموں کی بے ترتیبی، تھیلوں اور بندوقوں کے زمین پر دھرے جانے کی کھٹ کھٹ پٹ پٹ، سڑک کے کنارے تکان سے چور، جوتے اور پیروں سے لپٹے چیتھڑے اتارتے ہوئے سپاہی...) وہ کہے گا، ''شہری روندو، تم ٹھیک کہتے تھے۔ جو آئین تم نے لکھے ہیں وہ مجھے دے دو۔ تمھارا وہ مشورہ جسے نظامت سنتی ہے نہ قونصل خانہ، نہ سلطنت، اسے میں سنوں گا۔ آؤ دوبارہ ابتدا سے شروع کریں، ایک بار پھر شجرِ آزادی لگائیں، عالمی قوم کو بچائیں!'' یقیناً یہ کوسیمو کے خواب تھے، اس کی خواہشات تھیں۔

اس کے بجائے ایک روز سپاہیوں والی سڑک پر مشرق سے تین لنگڑاتی ہوئی شکلیں ظاہر ہوئیں۔ ایک لنگڑے نے بیساکھی کا سہارا لے رکھا تھا، دوسرے کا سر پٹیوں کی پگڑی میں لپٹا ہوا تھا، تیسرا سب سے صحت مند تھا کیونکہ اس کی ایک آنکھ پر محض ایک سیاہ چیپی لگی تھی۔ وہ گندے چیتھڑے جوان کے بدن تھے، پھٹی پرانی مینڈھیاں جوان کے سینوں سے لٹک رہی تھیں، بغیر طرّوں کے بے کنارہ ہیٹ جن میں سے ایک پر ابھی تک کلغی لگی ہوئی تھی، اونچے جوتے جو ٹانگوں پر اوپر تک چڑھے ہوئے تھے، نپولینی گارڈ کی وردیوں سے متعلق معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے، بلکہ ان میں ایک تو خالی نیام لہرا رہا تھا، دوسرے کے کندھے پر بندوق کی نالی تھی جس کے سرے پر کسی چھڑی کی طرح ایک گٹھڑی بندھی تھی۔ وہ نشئیوں کی تگڈم کی طرح گاتے ہوئے آ رہے تھے۔

''او، اجنبیو!'' میرے بھائی نے انھیں آواز دی۔ ''تم کون ہو؟''

''کیا عجیب پرندہ ہے! تم وہاں اوپر کیا کر رہے ہو؟ صنوبر کی گری کھا رہے ہو؟''

دوسرا بولا، ''صنوبر کی گری کسے چاہیے؟ ہم قحط زدوں سے تم صنوبر کی گریاں کھانے کی توقع کرتے ہو؟''

''ہائے پیاس! یہ برف کھانے کی وجہ سے ہے!''

''ہم سواروں کی تیسری پلٹن ہیں!''

''ایک آدمی کے لیے!''

''جو بھی باقی رہ گیا ہے!''

''تین سو میں سے تین، برا نہیں ہے!''

''خیر، میں بچ گیا ہوں اور یہ میرے لیے کافی ہے!''

''اخاہ، ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے۔ تم اپنی پوری کھال سمیت ابھی گھر نہیں پہنچے ہو!''

''لعنت ہو تم پر!''

'ہم آسٹرلٹز کے فاتح ہیں!''

''اور ولنا کے کام بگاڑو! آہا!''

''او بولتے پرندے، ہمیں بتاؤ یہاں سرائے کہاں ہے!''

''ہم نے آدھے یورپ کے شراب کے پیپے خالی کر دیے ہیں مگر پیاس نہیں بجھی!''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم گولیوں سے چھدے ہوئے ہیں اور شراب سیدھی باہر نکل جاتی ہے!''

''تم جانتے ہو تم کہاں چھدے ہوئے ہو!''

''کوئی سرائے جو ہمیں ادھار دے سکے!''

''ہم واپس آکر کسی اور وقت چکتا کر دیں گے!''

''نپولین چکتا کرے گا!''

''ہونہہ...''

''زار چکتا کرے گا! وہ پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ بل اسے دے دینا!''

کوسیمو نے کہا، ''یہاں شراب نہیں ہے لیکن آگے ایک چشمہ ہے جہاں تم اپنی پیاس بجھا سکتے ہو۔''

Scanned with CamScanner

''خدا کرے کہ تم چشمے میں ڈوب جاؤ۔ الو!''

''اگر میں اپنی بندوق دریاے دستولا میں نہ گنوا چکا ہوتا تو اب تک تمھیں نیچے گرا کر ترغے کی طرح سیخ پر بھون چکا ہوتا!''

''ذرا ٹھہرو۔ میں اپنے پاؤں چشمے میں ڈالنے جا رہا ہوں، بڑی جلن ہو رہی ہے۔''

''میری بلا سے، تم اس میں اپنے چوتڑ بھی دھو سکتے ہو۔''

لیکن وہ تینوں چشمے پر گئے۔ انھوں نے اپنے پاؤں پانی میں ڈالے اور اپنے منھ اور کپڑے دھوئے۔ صابن انھیں کوسیمو سے مل گیا تھا، جوان لوگوں میں سے تھا جنھیں بڑھتی ہوئی عمر اور صاف ستھرا بناتی ہے، کیونکہ وہ ایسی خود کراہتی کی گرفت میں آ جاتے ہیں جس کی طرف جوانی میں ان کی توجہ نہیں ہوتی۔ سو، کوسیمو ہمیشہ اپنے پاس صابن رکھتا تھا۔ خنک پانی نے ان تینوں میں الکحل کے بخارات کسی حد تک دور کر دیے۔ نشہ اترنے کے ساتھ ہی اپنی حالت کی پژمردگی کے احساس نے انھیں گھیر لیا اور وہ آہیں بھرنے لگے۔ لیکن ان کی دلگیری میں شفاف پانی موجبِ مسرت بن گیا اور وہ چھینٹے اڑاتے ہوے گانے لگے۔ ''اے میرے وطن... اے میرے وطن...''

کوسیمو سڑک کے کنارے اپنی نگرانی کی چوکی پر لوٹ گیا تھا۔ اس نے سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آواز سنی اور ہلکے گھڑسواروں کا ایک دستہ دھول اڑاتا نمودار ہوا۔ وہ ایسی وردیوں میں تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان کی بھاری سموری ٹوپیوں کے نیچے صاف جلد والے چہرے دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ باریش اور کسی حد تک دبلے تھے اور ان کی سبز آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ کوسیمو نے انھیں دیکھ کر اپنی ٹوپی اتاری۔

وہ رک گئے۔ ''دن بخیر۔ کہو، وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں کتنا راستہ اور طے کرنا ہوگا؟''

''دن بخیر، سپاہیو،'' کوسیمو نے کہا جس نے ہر زبان بشمول روسی تھوڑی بہت سیکھ لی تھی، ''کہاں پہنچنے کے لیے؟''

''جہاں کہیں بھی یہ سڑک جاتی ہے...''

''ارے، یہ سڑک تو بہت ساری جگہوں پر جاتی ہے۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''پیرس۔''

''پیرس کے لیے اس سے بہتر راستے بھی ہیں۔''

''نہیں، پیرس نہیں، فرانس... یہ سڑک جاتی کہاں ہے؟''

''ارے، بہت سی جگہوں کو، اولیوا پاسا، سا سو کورتو، ترا پا...''

کہاں؟ اولیوا پاسا؟ نہیں، نہیں۔''

''ویسے اگر تم لوگ چاہو تو مارسائی بھی جا سکتے ہو...''

''مارسائی... ہاں، ہاں، مارسائی... فرانس...''

''مگر فرانس میں تم لوگ کرو گے کیا؟''

''نپولین نے ہمارے زار کے ساتھ جنگ چھیڑی تھی، اور اب ہمارا زار نپولین کا تعاقب کر رہا ہے۔''

''اور تم آئے کہاں سے ہو؟''

''چارکووا سے، کیف سے، روس سے۔''

''تم لوگوں نے کیا عمدہ جگہیں دیکھی ہوں گی! تمھیں کون سی جگہ زیادہ پسند ہے؟ یہاں یا روس میں۔''

''عمدہ جگہیں ہوں، خراب جگہیں ہوں، ہمارے لیے سب برابر ہیں۔ ویسے ہم روس کو پسند کرتے ہیں!''

سرپٹ دوڑنے کی آواز آئی اور دھول کا بادل اڑاتا ایک گھوڑا رکا جس پر ایک افسر سوار تھا۔ افسر نے چلا کر قازقوں سے کہا، ''دفع ہو جاؤ! تمھیں یہاں کھڑے ہونے کی اجازت کس نے دی؟''

سپاہیوں نے کوسیمو سے کہا، ''الوداع!'' اور گھوڑوں کو ایڑ لگا دی۔

افسر صنوبر کے درخت کے پاس رکا رہا۔ وہ لمبا اور دبلا پتلا، وجیہہ اور اداس صورت شخص تھا۔ اس نے اپنا ننگا سر آسمان کی طرف اٹھا رکھا تھا جہاں بادل دھاریوں کی شکل میں تیر رہے تھے۔

''روز بخیر، موسیو،'' اس نے فرانسیسی میں کوسیمو سے کہا، ''سو تم ہماری زبان جانتے ہو؟''

''ہاں، افسر صاحب،'' میرے بھائی نے جواب دیا، ''لیکن اس سے زیادہ نہیں جتنی فرانسیسی آپ جانتے ہیں۔ بات یکساں ہے۔''

Scanned with CamScanner

''کیا تم اسی ملک کے باشندے ہو؟ کیا تم یہیں تھے جب نپولین آس پاس تھا؟''

''ہاں، موسیو افسر۔''

''کیسا رہا؟''

''آپ جانتے ہیں، موسیو، فوجیں ہمیشہ لوٹ مار کرتی ہیں خواہ ان کے مقاصد کچھ بھی ہوں۔''

''ہاں، ہم بھی بہت لوٹ مار کرتے ہیں... لیکن ہم خیالات نہیں پھیلاتے...''

وہ اداس اور فکر مند تھا، حالانکہ فاتح تھا۔ وہ کوسیمو کو اچھا لگا اور اس نے روسی کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''آپ جیت گئے ہیں!''

''ہاں۔ ہم اچھا لڑے۔ بہت اچھا۔ لیکن شاید...''

یکایک چیخ پکار کے ساتھ، گولی چلنے اور ہتھیار ٹکرانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ''وہاں کون ہے؟'' افسر نے چلّا کر کہا۔ قازق واپس آ رہے تھے۔ وہ کچھ نیم عریاں لاشیں زمین پر گھسیٹ رہے تھے اور اپنے ہاتھوں، بائیں ہاتھوں میں کوئی چیز پکڑ رکھی تھی۔ (ان کے دائیں ہاتھوں میں چوڑے پھل کی خمدار شمشیریں تھیں جو عریاں تھیں اور خون ٹپکا رہی تھیں) ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چیز ان تین شرابی سواروں کے سر تھے۔ ''فرانسیسی! امپولین! سب مر چکے ہیں!''

نوجوان افسر نے چلّا کر کوئی سخت حکم دیا اور وہ ان چیزوں کو وہاں سے لے گئے۔

''دیکھ رہے ہو... جنگ... برسوں سے میں اپنی مقدور بھر صلاحیت کے ساتھ ایک ایسی چیز سے نمٹ رہا ہوں جو بذاتِ خود ہولناک ہے۔ جنگ... اور یہ سب ان آدرشوں کے لیے جنھیں میں شاید کبھی خود بھی سمجھ نہ پاؤں گا۔''

''میں بھی،'' کوسیمو نے جواب دیا، ''ایسے آدرشوں کے لیے برسوں جیا ہوں جنھیں کبھی خود بھی سمجھ نہ پاؤں گا۔ مگر میں ایک یکسر اچھا کام کرتا ہوں۔ میں درختوں پر رہتا ہوں۔''

افسر کا مزاج یکایک دل گرفتگی سے تردد میں بدل گیا تھا۔ ''اچھا،'' اس نے کہا، ''اب مجھے چلنا چاہیے۔'' اس نے فوجی سلام کیا۔ ''الوداع، موسیو... تمھارا نام کیا ہے؟''

''بیرن کوسیمو دی روندو،'' کوسیمو نے اس کے رخصت ہوتے ہوئے پیکر کے عقب میں چلّا کر کہا، ''اور تمھارا؟''

Scanned with CamScanner

"میں پرنس آندریئی..." اس کے نام کا باقی حصہ سرپٹ دوڑتا ہوا گھوڑا لے گیا۔

۳۰

میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری یہ انیسویں صدی، جو اس قدر خراب آغاز ہے اور مزید ابتر ہوئی جارہی ہے، انجام کار کیا دکھائے گی۔ یورپ پر عود شاہی کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ تمام اختراع پسند، خواہ وہ جیکوبن ہوں یا بونا پارٹ والے، ہار چکے ہیں۔ ایک بار پھر مطلق العنانی اور یسوعیت کا دور دورہ ہے۔ جوانی کے آدرش، روشنیاں، ہماری اٹھارویں صدی کی امیدیں، سب خاک میں مل چکے ہیں۔

ایسے خیالات میں اس نوٹ بک کے حوالے کرتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ ان کا اظہار اس کے سوا کیسے کروں۔ میں ہمیشہ ایک متوازن شخص رہا ہوں، کسی بڑے ہیجان یا خواہشات کے بغیر۔ ایک باپ، ایک پیدائشی رئیس، روشن خیال اور قانون کا پابند۔ سیاست کی زیادتیوں نے مجھے کبھی زیادہ صدمہ نہیں پہنچایا، اور مجھے امید ہے کبھی پہنچائیں گی بھی نہیں۔ مگر اس کے باوجود میں اندر سے کتنا اداس ہوں!

پہلے بات مختلف تھی۔ میرا بھائی وہاں تھا۔ میں اپنے سے کہتا تھا: "یہ اس کا معاملہ ہے،" اور اپنی زندگی گزارا کرتا تھا۔ آسٹروروسیوں کی آمد یا پے موں (Piedmont) سے ہمارا الحاق میرے لیے تغیر کی علامت نہیں رہی ہے، نہ ہی نئے محصول یا اس قسم کی کوئی چیز، بلکہ محض یہ حقیقت کہ جب میں کھڑکی کھولتا ہوں تو وہاں اوپر اسے متوازن ہوتا نہیں دیکھ پاتا۔ اب جبکہ وہ یہاں نہیں ہے، مجھے فلسفہ، سیاست، تاریخ، غرض یہ کہ بہت ساری چیزوں میں دلچسپی لینی چاہیے۔ میں خبروں کے لیے تجسس کرتا ہوں، کتابیں پڑھتا ہوں، لیکن وہ مجھے چکرادیتی ہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، ان میں نہیں ہے، کیونکہ وہ کچھ اور بھی سمجھتا تھا اور وہ " کچھ اور" سب کو محیط تھا۔ وہ اسے لفظوں میں نہیں، صرف جی کر ہی کہہ سکتا تھا، جیسا کہ اس نے کیا۔ صرف اتنی صاف دلی سے ہی اپنے اصل روپ میں رہ کر، جیسا کہ وہ اپنی موت تک تھا، وہ تمام لوگوں کو کچھ دے سکتا تھا۔

مجھے اس کا بیمار ہونا یاد ہے۔ ہمیں اس کا احساس یوں ہوا کہ وہ اپنا سونے کا تھیلا چوک کے وسط میں اخروٹ کے بڑے درخت پر لے آیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اپنی سونے کی جگہیں، وحشی جانور کی

Scanned with CamScanner

جبلت کے ساتھ، ہمیشہ مخفی رکھی تھیں۔ اب اسے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ دوسرے لوگ اسے ہمیشہ دیکھتے رہیں۔ مجھے سخت تشویش لاحق ہو گئی۔ میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ وہ تنہا مرنا پسند نہیں کرے گا۔ غالباً یہ ایک اولیں علامت تھی۔ ہم نے سیڑھی کے ذریعے ایک ڈاکٹر کو اوپر بھیجا۔ جب وہ نیچے آیا تو اس نے منھ بنا کر دونوں بازو اوپر اٹھا دیے۔

میں سیڑھی سے خود اوپر گیا۔ ''کوسیمو،'' میں نے ابتدا کی۔ ''اب تم پینسٹھ سے تجاوز کر چکے ہو۔ کیا تم یہاں اوپر مزید رہ سکتے ہو؟ تم جو کہنا چاہتے تھے وہ کہہ چکے ہو۔ ہم سمجھ چکے ہیں۔ اس کے لیے بہت قوتِ ارادی کی ضرورت تھی، لیکن تم نے کر دکھایا ہے اور اب تم نیچے آ سکتے ہو۔ جنھوں نے ساری زندگیاں سمندر میں گزاری ہوں، ایک وقت آتا ہے کہ وہ بھی زمین پر لوٹتے ہیں۔''

بے سود! اس نے ایک ہاتھ سے متفق نہ ہونے کا اشارہ کیا۔ اب وہ مشکل ہی سے بول سکتا تھا۔ سر سے پاؤں تک کمبل میں لپٹا وہ بار بار اٹھتا اور کسی شاخ پر دھوپ کھانے بیٹھ جاتا۔ اس سے زیادہ وہ متحرک نہیں ہوتا تھا۔ ایک بوڑھی دہقان عورت، جو غالباً اس کی پرانی محبوبہ تھی، اوپر جا کر اس کا کام کاج کرتی اور اس کے لیے گرم کھانا لے آتی۔ ہم نے سیڑھی کو تنے کے سہارے لگا رہنے دیا کہ اس کی مدد کے لیے اوپر جانے کی مستقل ضرورت تھی، اور یوں بھی کچھ لوگوں کو ابھی تک امید تھی کہ اچانک اس کے جی میں آئے اور وہ نیچے آ جائے۔ (ایسی امید کرنے والے دوسرے تھے: میں تو اسے جانتا تھا۔) نیچے چوک میں اس کی رفاقت کے لیے ہمیشہ لوگوں کا حلقہ رہتا، جو آپس میں گپ شپ کرتے ہوئے کبھی کبھار اسے مخاطب کر لیتے، گو وہ جانتے تھے کہ اب وہ بات کرنا نہیں چاہتا۔

اس کی حالت بدتر ہو گئی۔ ہم نے درخت پر ایک پلنگ چڑھا دیا اور اسے توازن سے رکھنے میں کامیاب رہے۔ وہ بڑی آمادگی سے اس پر منتقل ہو گیا۔ اس بارے میں پہلے نہ سوچنے پر ہم نے ذہنی خلش محسوس کی۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس نے آسائش کو کبھی رد نہیں کیا تھا۔ درختوں پر ہونے کے باوجود، جس قدر بھی اس کے بس میں تھا اس نے بہترین طریقے سے رہنے کی کوشش کی تھی۔ سو ہم جلدی جلدی دوسری آسائشیں اوپر لے گئے، مثلاً ہوا کے جھونکوں سے بچاؤ کے لیے پردے، منڈپ اور انگیٹھی۔ اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی اور ہم اس کے لیے ایک آرام کرسی لے آئے جسے ہم نے دو شاخوں کے درمیان باندھ دیا۔ کمبلوں میں لپٹا وہ دن بھر کرسی پر بیٹھا رہتا۔

Scanned with CamScanner

لیکن ایک صبح وہ ہمیں بستر پر نظر آیا نہ کرسی پر۔ پریشان ہو کر ہم نے نظریں اٹھائیں۔ وہ درخت کی چوٹی پر چڑھ گیا تھا اور ایک بہت اونچی شاخ پر، محض ایک قمیض پہنے، ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

''وہاں اوپر کیا کر رہے ہو؟''

جواب ندارد۔ وہ قریب قریب بے لوچ تھا اور کسی معجزے کی بدولت اوپر ٹھہرا ہوا نظر آتا تھا۔ ہم نے اس طرح کی ایک بڑی چادر نکالی جو زیتون جمع کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے اور ہم میں سے کوئی بیس آدمی اسے درخت کے نیچے تان کر کھڑے ہو گئے کیونکہ ہمیں اس کے گرنے کا خطرہ تھا۔

اس دوران ڈاکٹر اوپر گیا۔ یہ ایک مشکل کام تھا۔ دو سیڑھیاں لمبائی میں باندھنی پڑیں۔ جب وہ نیچے آیا تو اس نے کہا، ''پادری کو اوپر بھیج دو۔''

ہم پہلے ہی دون پیریکل نامی شخص پر متفق ہو چکے تھے جو کوسیمو کا دوست، اور فرانسیسیوں کے دور میں آئینی کلیسا کا ایک پادری تھا۔ وہ پادریوں کے لیے فری میسن تنظیم کی رکنیت ممنوع قرار دیے جانے سے قبل اس کا رکن تھا اور بہت سے نشیب و فراز کے بعد، کچھ عرصے قبل ہی بشپ کی طرف سے اپنے عہدے پر بحال ہوا تھا۔ وہ اپنی منصبی خلعت اور عشائے ربانی کے برتن کے ساتھ اوپر گیا۔ کلیسا کا خادم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے بہت مختصر وقت اوپر گزارا۔ وہ کسی بات پر بحث کرتے نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ نیچے آ گیا۔ ''کیا اس نے تبرک لے لیا ہے، دون پیریکل؟''

''نہیں، لیکن وہ کہتا ہے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اسے فرق نہیں پڑتا۔'' میں دون پیریکل سے کچھ اور نہ اگلوا سکا۔

چادر تانے ہوئے لوگ تھک چکے تھے۔ کوسیمو، بالکل غیر متحرک، ابھی تک اوپر تھا۔ مغرب کی سمت سے ہوا چل پڑی تھی۔ درخت کی پھننگ کپکپا رہی تھی۔ ہم چوکس کھڑے تھے۔ اسی لمحے آسمان پر ایک غبارہ نمودار ہوا۔

ساحل کے ساتھ ساتھ کچھ انگریز ہوا نورد غباروں کی پروازوں کا تجربہ کر رہے تھے۔ حاشیوں، جھالروں اور پھندنوں سے سجا، وہ ایک بڑا سا شاندار غبارہ تھا جس کے ساتھ ایک بید کی ٹوکری لگی تھی۔ اس کے اندر سنہری شانہ نشانوں اور چھجے دار ٹوپیوں والے دو افسر، دوربین کے ذریعے نیچے پھیلے ارضی منظر پر نظر دوڑاتے ہوئے، درخت پر بیٹھا آدمی، پھیلائی ہوئی چادر، ہجوم، غرضیکہ دنیا کے عجیب و غریب

Scanned with CamScanner

روپ دیکھ رہے تھے۔ کوسیمو نے بھی اپنا سر اونچا کر لیا تھا اور ٹکٹکی باندھے غبارے کو دیکھ رہا تھا۔

اور پھر اچانک غبارہ ہوا کے جھکڑ میں گھر گیا، اور ٹراؤٹ مچھلی کی طرح بل کھاتا، ہوا کے آگے آگے تیرتا ہوا سمندر کی طرف جانے لگا۔ ہوانوردوں نے اس بات کا کوئی اثر نہیں لیا اور میرے خیال میں، غبارے کا دباؤ کم کرنے میں لگ گئے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کسی سہارے پر گرفت کے لیے لنگر کھول دیا۔ لمبی رسّی سے بندھا نقرئی لنگر آسمان میں تیرنے لگا اور غبارے کے راستے پر ترچھے پن سے چلتے ہوئے، کم و بیش اخروٹ کے درخت کی بلندی پر، عین چوک کے اوپر سے اس طرح گزرنے لگا کہ ہم فکرمند ہو گئے کہ کہیں کوسیمو سے نہ ٹکرا جائے۔ لیکن اگلے ہی لمحے ہم اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھنے والے تھے، اس کا ہمیں بہت کم اندازہ تھا۔

عین اس لمحے جب لنگر کی رسّی اس کے نزدیک سے گزری، قریب المرگ کوسیمو نے ویسی ہی زقند بھری جیسی کہ اپنی جوانی میں اکثر لگایا کرتا تھا۔ اس نے رسّی کو پکڑ لیا اور سہارے کے لیے پیر لنگر پر ٹکاتے ہوئے دوہرا ہو گیا۔ یوں ہم نے اسے دور جاتے اور بالآخر سمندر کی جانب غائب ہوتے دیکھا کہ موافق ہوا غبارے کا رستہ مشکل ہی سے روک رہی تھی۔

خلیج عبور کرنے کے بعد غبارہ، جوں توں، دوسری سمت میں اتر گیا۔ رسّی پر لنگر کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہوانورد، جو اس وقت راستے پر نظر رکھنے میں مصروف تھے، کچھ نہ دیکھ پائے تھے۔ یہی قیاس کیا گیا کہ قریب المرگ بوڑھا شخص اس وقت مفقود ہو گیا تھا جب غبارہ کھاڑی پر سے گزر رہا تھا۔

یوں کوسیمو، ہمیں یہ اطمینان دیے بغیر کہ ہم اس کی لاش کو ہی زمین پر لوٹتے دیکھ سکیں، غائب ہو گیا۔ خاندانی مقبرے پر اس کی یاد میں جو کتبہ ہے، اس پر یہ الفاظ کندہ ہیں، ”کوسیمو پیوواسکو دی روندو، جو درختوں پر جیا، جس نے ہمیشہ زمین سے پیار کیا اور بالآخر آسمان پر چلا گیا۔“

لکھنے کے دوران میں بار بار رکتا ہوں اور کھڑکی تک جا کر باہر دیکھتا ہوں۔ آسمان خالی ہے اور اومبروسا کے ہم بوڑھوں کے لیے جو سبز گنبدوں تلے رہنے کے عادی ہیں، یہ منظر نظروں پر بار ہے۔ جب سے میرے بھائی نے انھیں چھوڑا ہے، یا جب سے انسانوں کو کلھاڑے کا شوق چرایا ہے، ایسا لگتا ہے کہ یہاں درختوں کا کوئی حق نہیں رہا۔ اور تو اور، ان کی انواع بھی بدل گئی ہیں۔ اب گل خطمی، دیودار اور بلوط نظر نہیں آتے۔ ان دنوں افریقہ، آسٹریلیا، امریکہ اور جزائر الہند نے اپنی جڑیں اور شاخیں

یہاں تک پھیلا دی ہیں۔ جو تھوڑے، بہت پرانے درخت ہیں بھی، وہ بلندیوں پر سمٹ گئے ہیں، جیسے پہاڑیوں پر زیتون اور پہاڑی جنگلوں میں چیڑ اور شاہ بلوط۔ نیچے سارا ساحل یوکلپٹس کا ایک سرخ جنگل ہے، یا پھر انڈیا ربر کے پھولے ہوئے درختوں سے بھرا ہے، جو وسیع و عریض الگ تھلگ قطعات میں ہیں۔ اور باقی سارے کے سارے کھردرے گچھوں والے غیر متوازن کھجور کے درخت ہیں جن کی اصل جگہ صحرا ہے۔

اومبروسا کا اب وجود نہیں ہے۔ خالی آسمان کو دیکھتے ہوئے میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، آیا یہ کبھی واقعی موجود تھا۔ پتوں اور کونپلوں کا وہ باریک اور بے انت جال، اچانک دھبوں اور کرچوں میں جھلکتا آسمان، شاید محض اس لیے تھا کہ میرا بھائی اپنی پھدکی جیسی چال سے گزر سکے۔ شاید وہ جال لامتناہیت پر کڑھا ہوا تھا، روشنائی کے اس تار کی طرح، جسے میں نے صفحہ در صفحہ پھیلنے دیا ہے، جو تنسیخوں، تصحیحوں، آڑی ترچھی لکیروں، دھبوں اور خلاؤں سے پُر ہے، جو کبھی بڑی بڑی رس بھریوں میں ڈھل جاتا ہے اور کبھی ستاروں کی طرح چمکتے بیجوں کے ڈھیروں میں جم جاتا ہے، پھر اچانک بل کھاتے ہوئے، اپنا راستہ بدل کر پتوں اور بدلیوں کے چوکھٹوں میں گھری فقروں کی کلیوں کو گھیر لیتا ہے، پھر دوبارہ گندھ جاتا ہے اور یوں آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے، حتیٰ کہ لفظوں، خیالوں اور خوابوں کے ایک بے مقصد ہجوم میں ڈھل جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

ناول

تمس
بھیشم ساہنی
ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی
Rs.180

قلبِ ظلمات
جوزف کونریڈ
انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن
Rs.80

دائرہ
محمد عاصم بٹ
Rs.100

نمبردار کا نیلا
سیّد محمد اشرف
Rs.60

بیس سو گیارہ
محمد خالد اختر
Rs.70

گنگا جمنی میدان
اختر حامد خاں
Rs.120

بوف کور
صادق ہدایت
فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.40

دیمک
شرشیندو مکھوپادھیائے
ترجمہ: رفعت سروش
Rs.70

خیمہ
میرال طحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

Scanned with CamScanner

آئندہ صفحات میں ڈیوڈ سی کورٹن (David C Korten) کی کتاب **How Corporations Rule the World** کے ابتدائیے، ایک باب اور اختتامیے پر مشتمل انتخاب پیش کیا جا رہا ہے، جس کا مقصد اس نہایت اہم اور منفرد نوعیت کی کتاب اور اس کے مشمولات کا تعارف کرانا ہے۔ یہ کتاب جس کا اردو ترجمہ "دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی" کے عنوان سے ۲۰۰۴ء میں کراچی سے شائع ہوا، اس ہمہ گیر انسانی بحران اور اس کے اسباب پر بڑی تفصیل سے بحث کرتی ہے جس نے کرۂ ارض پر انسانوں کی زندگی کو نہایت دشوار بنا دیا ہے اور جس کے سب سے خطرناک نتائج میں زمین کی ماحولیاتی تباہی، ایٹمی اور دوسرے مہلک اسلحے کی دوڑ، اور معاشی عالمگیریت کے نام پر وسائل اور طاقت کا غیر انسانی کارپوریشنوں کے ہاتھوں میں ارتکاز شامل ہیں۔ یہ پوری کتاب پڑھنے کے لائق ہے کیونکہ اس سے نہ صرف بربادی کے اس عمل کو پوری تفصیل سے سمجھا جا سکتا ہے بلکہ اس میں اس رجحان کا رخ پھیرنے اور زمین اور اس میں آباد انسانوں کو بچانے کی ٹھوس اور قابلِ عمل تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

کتاب کے ابتدائیے میں کورٹن نے اپنے خاندانی اور طبقاتی پس منظر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ ۱۹۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ان کی پرورش امریکی ریاست واشنگٹن کے ایک چھوٹے سے شہر لانگ ویو میں ہوئی۔ انھوں نے بین الاقوامی تجارت اور انتظام کاری میں پی ایچ ڈی کیا اور پھر مختلف تدریسی اداروں میں انھی مضامین کی تعلیم دیتے رہے۔ کافی عرصہ تدریس اور مشاورتی سرگرمیوں میں گزارنے کے بعد انھوں نے یو ایس ایڈ میں شمولیت اختیار کی۔ قدامت پسندانہ طرزِ فکر میں اتنی گہری جڑیں رکھنے کے باوجود انھیں اپنے متنوع تجربات سے رفتہ رفتہ یہ احساس ہوا کہ "ترقی کا روایتی طریقِ عمل، جس کے قائل نہ صرف قدامت پسند بلکہ بہت سے لبرل لوگ بھی ہیں، عالمگیر نوعیت کے شدید، تیزی سے بڑھتے ہوئے اور ممکنہ طور پر ہلاکت خیز انسانی بحران کا حل نہیں بلکہ اس کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔" اپنے اس احساس کی اپنے تجربے اور اس سے ملتا جلتا احساس رکھنے والے دوسرے لوگوں کے خیالات سے تصدیق ہو جانے کے بعد کورٹن نے یو ایس ایڈ کو خیرباد کہہ دیا اور مذکورہ بالا انسانی بحران کا تجزیہ اور اس کا ممکنہ حل تلاش کرنے کا کام اختیار کر لیا۔ کورٹن کئی کتابوں کے مصنف ہیں، لیکن ان کی کتاب "دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی" ان کی سب سے جامع اور موثر تصنیف خیال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ان تمام لوگوں کے لیے ناگزیر ہے جو آج کی دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ڈیوڈ کورٹن

انگریزی سے ترجمہ: حمید زمان

عالمگیر معیشت اور ماحولیاتی انقلاب

ایک ذاتی سفر

میرے خیال میں یہ کہنے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ جدید دور کا اختتام ہو چکا ہے۔ آج بہت سی چیزوں سے اشارہ ملتا ہے کہ ہم ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں، جب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز ختم ہو رہی ہے اور کوئی اور چیز بڑی تکلیف کے ساتھ پیدا ہو رہی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی چیز انحطاط اور شکست و ریخت کا شکار ہو کر خود کو ختم کیے لے رہی ہو، جبکہ دوسری چیز، جس کے خدوخال ابھی تک واضح نہیں، ملبے کے اس ڈھیر سے بلند ہو رہی ہو۔

— واکلاو ہاویل (Vaclav Havel)، صدر چیک جمہوریہ

پچھلے کئی برسوں پر پھیلے ہوئے میرے ذاتی سفر۔نے مجھے فلپائن، ہنگری، نیوزی لینڈ، بنگلہ دیش، برازیل، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، اور امریکہ جیسے ایک دوسرے سے مختلف ملکوں میں بے حد متنوع پس منظر رکھنے والے لوگوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ میں اپنے سفر میں جہاں بھی گیا، میں نے تقریباً تمام عام لوگوں میں ایک احساس کا مشاہدہ کیا کہ وہ جن اداروں پر انحصار کرتے تھے انھوں نے خود کو ان کے بھروسے کے قابل ثابت نہیں کیا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو مستقبل کے بارے میں ایک بڑھتا ہوا خوف محسوس

ہوتا ہے کیونکہ مستقبل میں انھیں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے امکانات کم ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ امریکہ میں اور دوسری جگہوں پر یہ خوف سیاسی مایوسی اور بیگانگی کا ایک بڑھتا ہوا احساس پیدا کر رہا ہے جس کا اظہار انتخابات میں ووٹ دینے والوں کی کم ہوتی ہوئی شرح، ٹیکس گزاروں کی بغاوت اور اقتدار پر فائز لوگوں کو رد کیے جانے سے ہو رہا ہے۔ تاہم، اصل مسائل محض بڑی حکومتوں کے تصور کے رد کیے جانے سے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔

اگرچہ سیاست کار اور پریس حکومت کی ناکامیوں پر عوام کی مایوسی سے کھیل کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں، لیکن ان میں اس صورت حال کے اصل اسباب کی کوئی خاص سمجھ بوجھ دکھائی نہیں دیتی جس کے عناصر میں بڑھتی ہوئی غریبی اور بے روزگاری، نابرابری، پرتشدد جرائم، ٹوٹتے ہوئے خاندان اور تیزی سے بڑھتا ہوا ماحولیاتی بگاڑ شامل ہیں اور جس کے باعث لوگ اپنے سامنے تاریک مستقبل دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے رہنماؤں میں وہ صلاحیت دکھائی نہیں دیتی کہ اپنے سیاسی مخالفوں پر الزام دھرنے اور مسائل کے وہی فرسودہ غیر موثر حل تجویز کرنے کی عادت سے اوپر اٹھ سکیں — کہ تجارتی قواعد میں نرمی لا کر معاشی افزائش میں اضافہ کیا جائے، ٹیکس کم کیے جائیں، تجارتی رکاوٹیں دور کی جائیں، انڈسٹری کو مزید مراعات اور سبسڈی دی جائے، فلاحی امداد حاصل کرنے والوں کو کام کرنے پر مجبور کیا جائے، پولیس میں مزید عملہ بھرتی کیا جائے، اور مزید جیلیں تعمیر کی جائیں، وغیرہ۔

اکثر اوقات عام لوگ، جو اقتدار کے ایوانوں سے دور اپنی عام زندگیاں گزارتے ہیں، اس بات کا زیادہ واضح ادراک رکھتے ہیں کہ اصل میں ہو کیا رہا ہے۔ تاہم انھیں اس بات کو برملا کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے جسے وہ اپنے دل میں سچ سمجھتے ہیں۔ یہ بات اتنی خوفزدہ کر دینے والی اور زیادہ معتبر سمجھے جانے والے جغادری لوگوں اور ذرائع ابلاغ کی باتوں سے اس قدر مختلف ہے کہ انھیں اس کو زبان پر لانے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اپنے اس مشاہدے کو دبانے کے نتیجے میں وہ خود کو دنیا سے کٹا ہوا اور بے بس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ سوالات انھیں متواتر پریشان کیے رکھتے ہیں: کیا حالات واقعی اتنے ہی خراب ہیں جتنے مجھے نظر آ رہے ہیں؟ کیا میں بے وقوف ہوں؟ کیا مجھے جان بوجھ کر غلط اطلاعات دی جا رہی ہیں؟ کیا میں کچھ کرنے کے قابل ہوں؟ کوئی کیا کر سکتا ہے؟

میں خود بھی کئی برس سے ان سوالوں سے الجھتا چلا آ رہا ہوں۔ پہلے مجھے اپنی علیحدگی اور تنہائی کا

Scanned with CamScanner

اسی طرح کا احساس ہوتا تھا، لیکن اب میرا یہ احساس قوی ہوتا جارہا ہے کہ میری طرح لاکھوں اور لوگ بھی اپنے مشاہدات اور ادراک کی مدد سے ان سوالوں کے جواب پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہر بار جب میں کسی نئے گروپ سے مخاطب ہونے کی تیاری کرتا ہوں، مجھے یہ سوچ کر گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے کہ جو بات میں کہنے والا ہوں اسے اس دنیا میں بغیر توجہ دیے رد کر دیا جائے گا جہاں معاشی افزائش، بگ بزنس اور خسارے کی سرمایہ کاری کے تصورات عقائد کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن عموماً ردعمل یہ ہوتا ہے کہ لوگ میری باتوں کی زبردست تائید کرتے ہیں اور اس غیر معمولی بات پر تسکین اور خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ کسی نے سرِ محفل ان خیالات کو بیان کیا جو ان کے ذاتی تجربوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ کسی دشوار اور ناخوشگوار سچ کو سامنے لے آنا تاکہ اس پر گفتگو ہو سکے، عمل کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے۔ جہاں نامعلوم کا خوف ہمیں مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے وہاں سچ کا سامنا کرنے سے ہم میں عملی اقدام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

اپنی لکھی ہوئی ہر نئی کتاب میرے لیے ایک مسلسل جاری دانشورانہ سفر میں ایک نئے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مجھے یہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ بہت سے پڑھنے والوں کے ساتھ ان مسائل پر گفتگو کا آغاز کر سکوں جن سے میں شدید وابستگی رکھتا ہوں۔ اس سفر کی موجودہ منزل پر نکلنے سے پہلے، بہتر ہوگا کہ میں آپ کو اپنے ان تجربات کے بارے میں بتاؤں جنھوں نے ان خیالات کی جانب میری رہنمائی کی جنھیں میں اس کتاب کے صفحات میں بیان کرنے والا ہوں۔ میرے ان تجربات کی تاریخ سے ان دلائل کے مرکزی نکات بھی واضح ہو جائیں گے جن کی تفصیل ''دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی'' میں سامنے آئے گی۔

میں ۱۹۳۷ء میں بالائی متوسط طبقے کے ایک سفید فام، قدامت پسند گھرانے میں پیدا ہوا اور میری پرورش ریاست واشنگٹن کے ایک چھوٹے سے شہر لانگ ویو میں ہوئی جس کی آبادی پچیس ہزار ہے اور جو عمارتی لکڑی کی صنعت کا مرکز ہے۔ یہ فرض کرتے ہوئے کہ ایک روز میں موسیقی اور الیکٹرانک آلات کے اپنے خاندانی کاروبار کا انتظام سنبھالوں گا، مجھے بین الاقوامی امور سے یا امریکہ سے باہر کے معاملات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اسٹینفورڈ یونیورسٹی کے طالب علم کے طور پر، جس کا بنیادی

Scanned with CamScanner

مضمون نفسیات تھا، میں نے لوگوں میں موسیقی کی بابت پائے جانے والے رویے کی آزمائش کی اور یہ دیکھا کہ لوگوں کو موسیقی کے ریکارڈ خریدنے کی طرف راغب کرنے کے لیے نفسیات کو کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پھر میری تعلیم کے آخری برس، ۱۹۵۹ء میں، ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

کسی وجہ سے، جواب مجھے یاد نہیں رہی، میں نے یونیورسٹی میں ایک کورس میں داخلہ لیا جس کا موضوع جدید انقلابات تھے اور جس کے استاد سیاسیات کے پروفیسر رابرٹ نارتھ (Prof. Robert North) تھے۔ اس کورس نے مجھے حیرت زدہ کردیا۔ دنیا بھر میں غریبی انقلاب کے محرک کے طور پر کام کررہی تھی ––– اور یہ امریکی طرزِ زندگی کے لیے، جسے میں بہت عزیز رکھتا تھا، ایک بڑا خطرہ تھا۔ یہ کورس ان تعلیمی تجربات میں سے ایک تھا جو آدمی کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں اور اس کے زیر اثر میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں نے طے کیا کہ اس طرزِ زندگی کو لاحق خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے میں اپنے آپ کو وقف کردوں گا اور جدید تجارتی انتظام کے طریقوں کا علم ان لوگوں تک پہنچاؤں گا جواب تک اس سے استفادہ نہیں کرسکے ہیں۔

میں نے اسٹینفورڈ بزنس اسکول سے بین الاقوامی تجارت میں ایم بی اے اور انتظام کاری کی تھیوری کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ انھی دنوں اپنی شریک حیات بننے والی فرانسس کورٹن (Frances Korten) کے ساتھ مل کر ایتھوپیا میں ایک بزنس اسکول قائم کرنے کے کام میں تین سال لگانے سے میری عملی تربیت کی ابتدا ہوئی۔ میں نے ویت نام کی جنگ کے دوران اپنی لازمی فوجی خدمت یو ایس ایرفورس میں ایک کیپٹن کے طور پر سرانجام دی اور اسپیشل ایر وارفیئر اسکول، ایرفورس کے سیکرٹری کے دفتر اور ڈیفنس کے سیکرٹری کے دفتر میں اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ اس کے بعد میں نے ہارورڈ گریجویٹ بزنس اسکول کے سفری تدریسی عملے میں شمولیت اختیار کرلی، اور یہ سفر ساڑھے چار برس کے عرصے پر محیط رہا۔

ہارورڈ بزنس اسکول سے وابستگی کے تین برس میں نے سنٹرل امریکن مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ (INCAE) میں، جو نکاراگوا میں قائم تھا، ہارورڈ مشیر کے طور پر گزارے اور وسطی امریکہ اور آنڈیئن علاقوں کے معتبر تجارتی گھرانوں کی ضروریات کو پورا کیا۔ بوسٹن واپس آنے کے بعد میں نے مزید دو سال بزنس اسکول میں پڑھایا اور پھر ہارورڈ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ اور ہارورڈ اسکول آف

Scanned with CamScanner

پبلک ہیلتھ سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء کے آغاز میں فرانسس اور میں فورڈ فاؤنڈیشن کے عملے میں شامل ہو کر فلپائن چلے گئے اور اس کے بعد کے چودہ سال ہم نے جنوب مشرقی ایشیا ہی میں گزارے۔ فرانسس تو فورڈ فاؤنڈیشن ہی کے ساتھ رہی، لیکن میں نے غیر ملکی امداد کے سرکاری امریکی ادارے، یو ایس ایجنسی فار انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ (USAID) میں شمولیت اختیار کر لی اور آٹھ سال سینئر ایڈوائزر آن ڈویلپمنٹ مینجمنٹ کے طور پر خدمات انجام دیں۔

میں یہ تفصیل اس بات کو واضح کرنے کے لیے بیان کر رہا ہوں کہ میری جڑیں قدامت پسندانہ طرزِ فکر میں کتنی گہرائی تک اتری ہوئی تھیں۔ تاہم، میری کہانی کا زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس کا تعلق میرے شعور کے رفتہ رفتہ بیدار ہونے اور اس نتیجے تک پہنچنے سے ہے کہ ترقی کا روایتی طریق عمل، جس کے قائل نہ صرف قدامت پسند بلکہ بہت سے روشن خیال لوگ بھی ہیں، عالمگیر نوعیت کے شدید، تیزی سے بڑھتے ہوئے اور ممکنہ طور پر ہلاکت خیز انسانی بحران کا حل نہیں بلکہ اس کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔

اس بیدار ہوتے ہوئے شعور کی جانب میرا پہلا قدم وہی کورس تھا جس میں میں نے جدید انقلابات کا مطالعہ کیا اور جس نے میری آنکھوں کے سامنے اس حقیقت کو روشن کر دیا کہ ترقی کے جن فوائد سے میں لطف اندوز ہو رہا ہوں وہ عام طور پر لوگوں کو میسر نہیں ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے موسم گرما میں انڈونیشیا کے سفر نے مجھے غیر ترقی یافتگی کی حقیقتوں میں سر سے پیر تک غرق کر دیا اور مجھے ان لوگوں کی جرأت مندانہ جدوجہد، روحانی تربیت اور کشادہ دلی سے آشنا ہونے کا موقع دیا جو انتہائی غریبی کی حالت میں رہ رہے تھے۔ یہ انسانی تجربے کا ایسا پہلو تھا جو اس سے پہلے میرے تجربے میں نہیں آیا تھا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل میں، جب میں وسطی امریکہ کے مینجمنٹ اسکول سے وابستہ تھا، میں نے وہاں تبدیلی سے نبرد آزما ہونے کے موضوع پر ایک کورس کے لیے، جو میں پڑھا رہا تھا، ہارورڈ بزنس اسکول کے اسلوب میں کئی کیس تحریر کیے۔ ان کیسوں کی بنیاد لاطینی امریکی تجربات پر تھی اور ان میں سے کئی ایک کا تعلق حکومت، تجارتی شعبے اور رضاکار اداروں کی طرف سے کی جانے والی ان کوششوں سے تھا جو وہ شہر اور دیہات کے غریب باشندوں کی حالت بہتر بنانے کے مقصد سے کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے کیسوں سے ایک پریشان کن پیغام ملتا تھا: باہر سے تھوپی ہوئی ''ترقی'' کے باعث انسانی رشتوں اور اجتماعی زندگی پر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے اور اس ترقی سے جن لوگوں کو فائدہ پہنچانے

Scanned with CamScanner

کا دعویٰ کیا جا رہا ہے، انھی لوگوں کے لیے بے پناہ دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس، جب کبھی لوگوں کو خود سے ترقی کرنے کی آزادی اور خود اعتمادی میسر آتی ہے تو وہ ایک بہتر دنیا تخلیق کرنے کی زبردست صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مجھے اس چیلنج نے مسحور کر دیا کہ ترقی کے پروگراموں کو اس طرح تبدیل کیا جائے کہ ان سے بالکل نچلی سطح پر، لوگوں کی اپنی رہنمائی میں چلنے والے اس عمل کو مدد مل سکے۔ وسطی امریکی انسٹیٹیوٹ اور ہارورڈ اسکول میں گزارے ہوئے برسوں کے دوران فرانسس اور میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کے انتظام کو بہتر بنانے کی کوششوں میں شامل رہے۔ اس سے ہماری شناسائی ایسے بہت سے پہل کاری کے اقدامات سے ہوئی جو مقامی طور پر کیے جا رہے تھے، جن میں بالکل غریب لوگوں کے اقدامات بھی شامل تھے جن کے ذریعے وہ کم ہوتے ہوئے وسائل کی بنیاد پر اپنی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

جب فرانسس اور میں نے ہارورڈ اسکول چھوڑ کر فورڈ فاؤنڈیشن منیلا میں شمولیت اختیار کی تو فرانسس کو گرانٹس کے ایک پورٹ فولیو کا انتظام سونپا گیا جس میں فلپائن کی نیشنل اِریگیشن ایڈمنسٹریشن (NIA) کو دی جانے والی قلیل گرانٹ بھی شامل تھی۔ اس گرانٹ کا مقصد این آئی اے کی اس صلاحیت کو مضبوط بنانا تھا کہ وہ چھوٹے کسانوں کی ملکیت میں اور ان کے چلائے ہوئے آبپاشی کے نظاموں کو مدد فراہم کر سکے۔ اس سے این آئی اے اور فورڈ فاؤنڈیشن کے درمیان اور طویل میعادی تعاون کا آغاز ہوا جس نے آخر کار این آئی اے کو انجینئرنگ اور تعمیرات پر توجہ مرکوز رکھنے اور کسانوں پر حکم چلانے والے ادارے کے بجائے ایک ایسا ادارہ بنا دیا جو کسانوں کی تنظیموں کے ساتھ پارٹنر کے طور پر کام کرتا تھا اور بڑی حد تک مقامی خود انتظامی کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ہم نے دیکھا کہ جب ترقی کے پروگرام لوگوں کو مرکزی حیثیت دینے پر تیار ہوں تو عام لوگ اور گروہ بے پناہ توانائیاں متحرک کر کے کام میں لانے پر قادر ہوتے ہیں۔ ہمارے اپنے تجربے میں آیا کہ غیر ملکی امداد سے چلنے والے ترقیاتی پروگرام کس طرح عموماً لوگوں کے اپنے ترقیاتی اقدامات کو بے اثر کر دیتے ہیں ــــ وہ پروگرام بھی جو انھی اقدامات کو اپنے اندر سمونے کے لیے وجود میں آئے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم نے یہ بھی سیکھا کہ کس طرح غیر ملکی امداد کو بڑی بڑی مرکزیت زدہ سرکاری ترقیاتی ایجنسیوں کو نوکر شاہی کے طریقوں سے آزاد کرانے اور مقامی وسائل پر مقامی لوگوں کا کنٹرول مضبوط

Scanned with CamScanner

کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یو ایس ایڈ نے مجھے دعوت دی کہ اپنے تجربے سے سیکھے ہوئے اس سبق کو ایشیا میں اس کے پروگراموں کو بہتر بنانے کے لیے استعمال کروں۔ میں نے آٹھ سال اسی کوشش میں گزارے اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یو ایس ایڈ اتنا بڑا اور نوکر شاہی کا شکار ادارہ ہے کہ دوسری ترقیاتی ایجنسیوں کو نوکر شاہی کے طریقوں سے آزاد کرانے کے سلسلے میں موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔

ان تجربات نے میرا یہ یقین راسخ کر دیا کہ حقیقی ترقی غیر ملکی امداد کی صورت میں ملنے والی رقم سے خریدی نہیں جا سکتی۔ ترقی کا تعلق لوگوں کی اس صلاحیت سے ہے جو وہ اپنے علاقے کے وسائل — زمین، پانی، محنت، ٹیکنالوجی اور انسانی اختراع اور تحریک — کو کنٹرول اور موثر طور پر استعمال کرنے کے سلسلے میں بروئے کار لاتے ہیں اور اس طرح اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ لیکن بیشتر ترقیاتی پروگرام مقامی وسائل کا کنٹرول ان لوگوں سے چھین کر زیادہ سے زیادہ وسیع اور مرکزیت زدہ اداروں کو سونپ دیتے ہیں جو لوگوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتے اور ان کی ضروریات کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ ان مرکزیت زدہ اداروں سے گزر کر آنے والی رقم جتنی زیادہ ہوتی ہے، لوگ اسی قدر زیادہ محتاج ہوتے چلے جاتے ہیں، اپنی زندگیوں اور وسائل پر ان کا کنٹرول اتنا ہی کم ہوتا چلا جاتا ہے، اور مرکزی اقتدار رکھنے والوں اور ان لوگوں کے درمیان، جو مقامی آبادی کی معاشرت میں اپنی روزی کمانا چاہتے ہیں، فاصلہ مسلسل بڑھتا جاتا ہے۔

میں نے مشاہدہ کیا کہ جو چیزیں معاشی افزائش کا سبب بنتی ہیں اور جو چیزیں لوگوں کو بہتر زندگی فراہم کرتی ہیں ان کے درمیان بہت فرق ہے۔ اس فرق سے ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: اگر ترقی کا عمل معاشی افزائش پر مرکوز ہونے کے بجائے — جس کی رو سے لوگوں کو محض معاشی افزائش حاصل کرنے کا آلۂ کار تصور کیا جاتا ہے — لوگوں پر مرکوز ہوتا، جس میں لوگوں کو ترقی کے مقصد اور بنیادی ذریعے کا درجہ حاصل ہوتا، تو ترقی کی صورت کیا بنتی؟ ۱۹۸۴ء میں میں نے "لوگوں پر مرکوز ترقی" (People-Centred Development) کے عنوان سے تحریروں کا ایک انتخاب مرتب کیا جسے کماریان پریس نے شائع کیا۔ ۱۹۸۶ء میں میں نے اسی اشاعتی ادارے کے لیے ایک اور انتخاب "کمیونٹی مینجمنٹ" (Community Management) کے عنوان سے ترتیب دیا جس کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ وسائل کا کنٹرول لوگوں کے ہاتھ میں ہونا بہت اہم ہے۔

Scanned with CamScanner

جتنا زیادہ میں لوگوں کو — جو فرض کیا جاتا ہے کہ ترقی سے فائدہ اٹھانے والے ہیں — اپنے وسائل پر ترقیاتی پروگراموں اور ترقیاتی ایجنسیوں کی جانب سے ہونے والے حملے اور قبضے سے نڈھال، اپنے وقار اور زندگی کے معیار کو برقرار رکھنے کی سخت جدوجہد میں مبتلا دیکھتا رہا، ترقی کے مروجہ طرز فکر سے میری دوری بڑھتی گئی۔ ۱۹۸۸ء میں میں نے یو ایس ایڈ چھوڑ دیا، لیکن جنوب مشرقی ایشیا ہی میں مقیم رہا۔

سرکاری ترقیاتی ایجنسیوں سے مایوس ہو کر میں نے خود کو غیر سرکاری تنظیموں (این جی اوز) کی دنیا میں گم کر دیا اور جلد ہی خود کو این جی اوز میں کام کرنے والے ایسے ساتھیوں کی رفاقت میں پایا جو ترقی کے عمل اور اس کی نوعیت کے بارے میں بنیادی سوالات اٹھا رہے تھے۔ میں نے اس اجتماعی دانش کو، جو این جی او حلقے کے پرزور بحث مباحثے کے نتیجے میں رونما ہو رہی تھی، مرتب کرنے اور لکھنے کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ زمانہ میرے لیے ذاتی طور پر سیکھنے کا قیمتی زمانہ تھا اور اسی کی بدولت میں نے اپنی اگلی کتاب ''اکیسویں صدی تک پہنچنا: رضا کارانہ اقدام اور عالمی ایجنڈا'' **(Getting to the 21st Century: Voluntary Action and the Global Agenda)** لکھی جسے کماریان پریس نے ۱۹۹۰ء میں شائع کیا۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع بڑھتی ہوئی غربت، ماحولیاتی تباہی اور سماجی انتشار سے پیدا ہونے والا سہ رُخا انسانی بحران تھا، اور اس میں اس بحران کی جڑیں ان ماڈلوں میں تلاش کی گئی تھیں جن میں معاشی افزائش ترقی کا مقصد اور لوگ اس مقصد کو حاصل کرنے کا محض ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں نتیجہ نکالا گیا کہ چونکہ جدید معاشرے کے بالا دست ادارے ترقی کے اسی تصور کی پیداوار ہیں جن میں افزائش مرکزی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے تبدیلی لانے والی قیادت لازماً رضا کارانہ طور پر شہریوں کی جانب سے کیے جانے والے اقدامات سے نکل کر آئے گی۔

اپنی اس دلیل کو اپنے کمٹ منٹ کی بنیاد بناتے ہوئے میں نے اپنے کئی ساتھیوں سے مل کر پیپل سنٹرڈ ڈویلپمنٹ فورم (یا پی سی ڈی فورم) میں شمولیت اختیار کی۔ یہ شہریوں کا ایک عالمی نیٹ ورک ہے جس کی کوشش یہ ہے کہ مستقبل کا ایک ایسا تصور سامنے لایا جائے جس میں لوگوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور ترقی کے طریق کار اس تصور سے ہم آہنگ کر کے نئے سرے سے متعین کیے جائیں۔ پی سی ڈی فورم نے قومی اور عالمی سطح کی ہیئتوں اور اداروں کے اس کردار کا مطالعہ کرنے کو خاص اہمیت دی ہے جو انھوں نے اپنے فائدے کے لیے لوگوں اور کسی مخصوص علاقے سے گہری وابستگی رکھنے والی

کمیونٹیوں کو ان کے ذمہ دارانہ اور پائیداری کے حامل مقامی طریقوں سے محروم کرنے میں ادا کیا ہے۔
اس سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے جو بعض لوگوں کو تضاد کی حامل محسوس ہوگی: یعنی یہ کہ اگرچہ میں مقامی سطح پر لوگوں کو اختیار دینے کی بات کر رہا ہوں، میری زیادہ تر توجہ عالمی اداروں کو تبدیل کرنے پر مرکوز رہی ہے؛ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جو عالمی سطح کے عوامل کو تبدیل ہی اس لیے کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے لوگوں کو مقامی طور پر اختیار حاصل ہو۔

نومبر ۱۹۹۲ء میں میرا فلپائن کی ایک پہاڑی سیرگاہ پر مشتمل قصبے باگیو جانا ہوا جہاں مجھے کئی ایشیائی این جی اوز کے رہنماؤں سے ملاقات کرنی تھی۔ ہم ایشیا کے ترقیاتی تجربات اور این جی او کی حکمت عملی پر اس کے ممکنہ اثرات پر دس دن تک غور و فکر کرتے رہے۔ ہمیں اس بات پر تشویش تھی کہ [جنوب مشرقی] ایشیا کی معاشی کامیابی خطرناک حد تک سطحی نوعیت کی ہے۔ ایک دوسرے سے مسابقت کرتی ہوئی متحرک معیشتوں کی پرت کے نیچے شدید غریبی اور علاقے کی سماجی اور ماحولیاتی بنیادوں کی بڑھتی ہوئی تباہی کی زیادہ گہری حقیقتیں دکھائی دیں۔ ہمارے مباحثے کا رخ ایک ایسے نظریے کی ضرورت کی طرف مڑ گیا جو اس بحران کے گہرے اسباب کی وضاحت کر سکے اور اس سے نمٹنے کے سلسلے میں رہنمائی کر سکے۔ بغیر اس نظریے کے ہماری حالت ایسی ہی تھی جیسی کسی ایسے پائلٹ کی ہو سکتی ہے جس کے پاس قطب نما نہ ہو۔ ایک رات دیر گئے ایک چھوٹے سے مقامی چینی ریستوران میں ہماری بحث دو بنیادی مشاہدوں پر مرکوز ہوتی گئی۔ پہلا یہ کہ ہمیں دراصل ترقی کے کسی متبادل نظریے کی ضرورت نہیں، بلکہ پائیدار معاشروں کے ایک ایسے نظریے کی ضرورت ہے جس کا اطلاق شمالی (مالدار) اور جنوبی (غریب) دونوں قسم کے ملکوں پر کیا جا سکے۔ دوسرا یہ کہ اس نظریے کو ان بے جان اقتصادی فارمولوں سے بلند ہونا چاہیے، جس میں یہ بیان کیا گیا ہو کہ انسانی معاشرے فطری عوامل سے اس قدر بیگانہ کیوں ہو کر رہ گئے ہیں۔

اگلے چند دن جب ہم نے اپنی اس گفتگو کو آگے بڑھایا تو رفتہ رفتہ ایک شکل بننے لگی۔ ایک میکانیکی کائنات کے مغربی سائنسی تصور نے ہماری موروثی روحانی فطرت سے ایک قسم کی فلسفیانہ یا تصوراتی بیگانگی پیدا کر دی ہے۔ یہ بیگانگی ہماری روزمرہ زندگی کے تجربے سے اور زیادہ گہری ہوتی جاتی

Scanned with CamScanner

ہے جس میں ہمیں اپنے ادارے بازار کی زرگری کی اقدار سے روز بروز زیادہ مطابقت پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دولت ہماری زندگی پر جتنی زیادہ حاوی ہوتی گئی ہے، اس روحانی بندھن کا احساس کم سے کم ہوتا چلا گیا ہے جو معاشرت کی بنیاد ہے اور فطرت کے ساتھ انسان کے ایک متوازن رشتے کی اساس ہے۔ روحانی تکمیل کی جستجو کی جگہ رفتہ رفتہ ہر شے پر حاوی آ جانے والی اور خود کو تباہ کر ڈالنے والی زراندوزی کی ہوس نے لے لی ہے — جبکہ دولت انسان کی بنائی ہوئی ایک ایسی شے ہے جو، کسی حد تک کارآمد ہونے کے باوجود، جوہر سے محروم اور اندرونی طور پر قدر سے عاری ہے۔

ہمارے تجزیے سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ زندہ زمین سے اپنا پائیدار رشتہ دوبارہ جوڑنے کے لیے ہمیں دولت کی دنیا کے فریبوں سے خود کو آزاد کرانا ہوگا، اپنی زندگیوں میں روحانی معنی دوبارہ تلاش کرنے ہوں گے، اور اپنے معاشی اداروں کی جڑیں مخصوص جگہوں اور وہاں رہنے والے لوگوں میں پیدا کرنی ہوں گی تاکہ یہ ادارے لوگوں سے اور ان کی زندگیوں سے مضبوط رشتہ قائم کر سکیں۔ آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ لوگوں پر مرکوز ترقی کا عمل اپنے وسیع ترین معنوں میں زندگی پر مرکوز معاشروں کی تخلیق کے مترادف ہے جس میں معاشیات عمدہ زندگی کے اوزاروں میں سے محض ایک اوزار ہوگی اور اسے انسانی وجود کے مقصد کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔ چونکہ ہمارے رہنما اپنے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے پیدا کردہ فریب اور ان سے حاصل ہونے والے فوائد کے اسیر ہیں، اس لیے اداروں اور اقدار کو نئے سرے سے وجود میں لانے کے اس تخلیقی عمل کی قیادت سول سوسائٹی ہی میں سے اٹھنی چاہیے۔

یہ کئی اعتبار سے ایک معمولی نوعیت کی دانش تھی۔ ہم جس نتیجے پر پہنچے تھے وہ اس قدیم دانش کی ازسرنو دریافت سے بڑھ کر کچھ نہ تھا کہ ہماری روحانی فطرت اور معاشی زندگی کے درمیان ایک گہرا تناؤ موجود ہے اور یہ کہ سماجی اور روحانی عمل کی صحت مندی اس پر منحصر ہے کہ ان دونوں کو متوازن اور ایک مخصوص تناظر میں رکھا جائے۔ اس کے علاوہ سول سوسائٹی کی اہمیت کو تسلیم کرنے میں بھی کوئی نئی بات نہ تھی جو ہمیشہ ہی سے جمہوری حکمرانی کی بنیاد رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں محسوس ہوتا تھا کہ آج کل کے معاشروں کو جس بحران کا سامنا ہے ہم نے ان معمولی خیالات کا اس سے گہرا عملی تعلق دریافت کر لیا ہے۔

باگیو میں اپنا باقی ماندہ وقت ہم نے اپنے اخذ کردہ نتیجے کو ایک مضمون کی صورت دینے میں گزارا جس کا عنوان تھا: ''معیشت، ماحول اور روحانیت: پائیداری کے نظریے اور طریق عمل کی جانب ایک قدم۔''

Scanned with CamScanner

۱۹۹۲ء کے موسم گرما میں، باگیو کے سفر سے ذرا پہلے، فرانس اور میں جنوب مشرقی ایشیا سے رخصت ہو کر واپس امریکہ آ گئے۔ ہم نے اپنے اس فیصلے کا اعلان اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے نام کرسمس کے موقعے پر لکھے ہوئے ایک خط میں اس طرح کیا:

۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہمیں اس دور افتادہ خطے میں لانے والا یہ عقیدہ تھا کہ یہ علاقہ ترقی سے متعلق ان مسائل کا مرکز ہے جن کے حل کے لیے اپنی عملی زندگی وقف کر دینے کا ہم دونوں نے اپنی نوعمر طالب علمانہ زندگی ہی میں فیصلہ کر لیا تھا۔ ہم نے اس مشن کے چیلنج کا سامنا کرتے ہوئے اپنی عملی زندگی شروع کی — کہ امریکہ کی کامیابی کے اسباق میں تمام دنیا کو شریک کیا جائے — تاکہ ''وہ لوگ'' زیادہ سے زیادہ ''ہم لوگوں'' جیسے ہو جائیں۔

ترقی کا جو تصور تیس برس پہلے ہمارے ذہنوں میں تھا، اور جس تصور کو ورلڈ بینک، آئی ایم ایف، بش انتظامیہ اور دنیا کے بیشتر طاقتور معاشی ادارے اب بھی شدومد سے آگے بڑھانے میں مصروف ہیں، وہ دنیا کے انسانوں کی اکثریت کے لیے فائدہ مند ثابت نہیں ہوا۔ اور اس مسئلے کی جڑیں ''کم ترقی یافتہ'' دنیا کے غریب باشندوں میں نہیں ہیں۔ اس کی جڑیں اُن ملکوں میں ہیں جو اصراف اور ضیاع پر مبنی تعیش کے عالمی معیارات طے کرتے ہیں اور جو ان پالیسیوں کے بانی ہیں جو ہماری دنیا کو معاشرتی اور ماحولیاتی خودکشی کی طرف لے جا رہی ہیں۔

اب تیس برس بعد، جب ہماری عمر، اور امید ہے کہ ہماری سمجھ بوجھ بھی، بڑھ چکی ہے، فرانس کو اور مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ امریکہ کی ''کامیابی'' دراصل دنیا کے کلیدی مسئلوں میں سے ایک ہے۔ اور اس بات کا سب سے واضح مظاہرہ خود امریکہ میں ہو رہا ہے۔

ایشیا سے بیٹھ کر دیکھتے ہوئے ہم نے یہ دہشت ناک مشاہدہ کیا کہ انھی پالیسیوں نے جو امریکہ تمام دنیا میں رائج کرنے کے لیے تجویز کرتا رہا ہے، خود اس کی اپنی سرحدوں کے اندر ایک تیسری دنیا کو تخلیق کیا ہے جس کی خصوصیات میں امیر اور غریب کے درمیان بڑھتا ہوا فرق، غیر ملکی امداد کی محتاجی، بگڑتا ہوا تعلیمی نظام، شیر خوار بچوں کی موت کی شرح میں اضافہ، بنیادی زرعی اجناس کی برآمد پر معاشی انحصار — اور ان برآمدات میں وہاں کے آخری باقی ماندہ جنگلات بھی ہیں — زہریلے فضلے کے بے تحاشا انبار، اور خاندانوں اور کمیونٹیوں کا انتشار شامل ہیں۔

جس عرصے میں ہم اپنے وطن سے دور تھے، اس عرصے میں طاقتور لوگوں نے پوری قوم کی

Scanned with CamScanner

دولت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کرلیا اور خود کو ان ذمے داریوں سے آزاد کرلیا جو ان کے کم خوش قسمت ہمسایوں کی طرف سے عائد ہوتی تھیں۔ مزدور یونینیں ختم ہوگئی ہیں کیونکہ کسی بھی قیمت پر بارو زگار رہنے پر مجبور امریکی مزدوروں کو میکسیکو، بنگلہ دیش اور تیسری دنیا کے اور ملکوں کے ان سے بھی زیادہ خستہ حال مزدوروں سے مسابقت کرنے پر مجبور کیا جارہا ہے اور انھیں کارپوریشنوں سے اپنی تنخواہوں میں کٹوتی کرانے کے مذاکرات کرنے پڑتے ہیں اور یہ کارپوریشنیں، خواہ ان کے نام امریکی ہوں، کسی بھی قومی وفاداری کے جذبے سے عاری ہیں۔

ہم دونوں کو محسوس ہوتا ہے کہ بیرون ملک گزارے ہوے برسوں کا بنیادی ثمر ہماری اپنی تعلیم رہی ہے، اور یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے وطن واپس جا کر مسئلے کو اس کے جغرافیائی منبع پر جا کر روکنے کی ذمے داری کو پورا کریں۔ نیویارک، جو معاشی طاقت کا بڑا مرکز ہے اور جہاں آج تیسری دنیا کے کسی بھی شہر کی تمام خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں — بے گھر افراد کی پوری بھٹکتی ہوئی فوج جس کے پس منظر میں مالدار اور شہرت یافتہ افراد کا پرتعیش طرز زندگی دیکھا جاسکتا ہے؛ مفلوج حکومت؛ اور اندھادھند تشدد — ہمیں ایک مناسب انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے ہم، دنیا کے ابتر حالات کے اصل اسباب کے بارے میں اپنے اس علم سے مسلح ہو کر جو ہم نے تیس برس کی تعلیم کے دوران حاصل کیا ہے، اژدہے کے پیٹ میں واپس جارہے ہیں۔

جب ہم امریکہ سے نکلے تھے تو ہمارا عزم یہ تھا کہ دوسرے لوگوں کے وہ مسائل حل کریں جو ہمارے نزدیک خود ان کی ذات میں مضمر تھے، تاکہ وہ ہم لوگوں جیسے ہوجائیں۔ اب ہم وطن واپس آگئے ہیں تاکہ اپنے ہم وطنوں کو یہ بات سمجھنے پر آمادہ کرسکیں کہ ہم نے کس کس طرح دنیا کو — بشمول اپنے — تباہی کے راستے پر دھکیلا ہے۔ جب ہم خود اپنے آپ کو تبدیل کرنے کی ذمے داری لیں گے، تب ہی باقی دنیا کے لوگ اپنی وہ سماجی اور ماحولیاتی گنجائش دوبارہ حاصل کرسکیں گے جو ہم نے ان سے چھین لی ہے، اور تعاون اور شراکت پر مبنی ایک منصفانہ، جمہوری اور پائیدار دنیا میں اپنی انسانی ضروریات پوری کرنے کے قابل ہوسکیں گے۔

چونکہ اس کتاب میں جن مسائل پر گفتگو کی گئی ہے وہ اقتدار کے بنیادی سوالات سے کسی طرح

Scanned with CamScanner

علیحدہ نہیں کیے جاسکتے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس گفتگو میں کارفرما سیاسی اور روحانی اقدار کا انکشاف کر دوں۔ میں اس اعتبار سے ایک روایتی قدامت پسند ہوں کہ بڑے بڑے اداروں اور ان کے ہاتھوں میں مرکوز غیر جواب دہ طاقت کو میں ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ مجھے مارکیٹ اور ذاتی ملکیت کی اہمیت پر اب بھی یقین ہے۔ تاہم، بہت سے معاصر قدامت پسندوں کے برخلاف، مجھے بڑے بزنس اور بڑی حکومت، دونوں سے کوئی لگاؤ محسوس نہیں ہوتا۔ اور میں اس پر بھی یقین نہیں رکھتا کہ دولت کی ملکیت کو خصوصی سیاسی مراعات کا سبب ہونا چاہیے۔

میں آواز اٹھانے کے حق سے محروم کر دیے گئے لوگوں سے ہمدردی، مساوات سے وابستگی، اور ماحول کی بابت فکرمندی کے سلسلے میں لبرل لوگوں کا ہم خیال ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ حکومت کا کردار بہت اہم ہے اور ذاتی ملکیت پر حدود عائد کی جانی چاہییں۔ تاہم، میں یہ بھی مانتا ہوں کہ بڑی حکومت اتنی ہی غیر جواب دہ اور معاشرتی اقدار کے لیے اتنی ہی تباہ کن ہو سکتی ہے جتنا کہ بڑا بزنس۔ بلاشبہ مجھے ہر ایسی تنظیم سے بے اعتباری محسوس ہوتی ہے جو طاقت کو اپنے ہاتھوں میں جمع اور مرکوز کر کے جواب دہی کی حدوں کو پار کر جائے۔ مختصراً، میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو ایک نئے راستے کو دریافت کر رہے ہیں جو نظریاتی سے زیادہ عملیت پسندانہ ہے، اور ایسے لوگوں کو سیاسی نقطۂ نظر کے اعتبار سے قدامت پسند اور لبرل کے متعینہ سانچوں میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

معاشیات سے میرا پہلا سابقہ کالج میں پڑا تھا جب میں نے اسے اپنے بنیادی انڈر گریجویٹ مضمون کے طور پر منتخب کیا۔ بہت جلد مجھے یہ مضمون میکانیکی، اکتا دینے والا اور حقیقت سے دور معلوم ہونے لگا، چنانچہ میں نے اسے چھوڑ کر انسانی طرز عمل اور تنظیم کے مطالعے کو اختیار کر لیا۔ اس کے بعد سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جدید معاشروں میں انسانی طرز عمل کی تنظیم کے سلسلے میں معاشی نظام ہی غالب حیثیت رکھتے ہیں اور ان کو سمجھنے کا سب سے مناسب طریقہ یہ ہے کہ انھیں طرز عمل کے نظاموں کے طور پر سمجھا جائے۔

اگرچہ اس کتاب میں کارپوریشن کے ادارے اور تجارت کے موجودہ نظام پر سخت تنقید کی گئی ہے، میں کبھی بھی تجارت کا مخالف نہیں رہا، اور نہ آج تک ہوں۔ صنعت اور تجارت کا ایک موثر نظام انسانی بہبود کے لیے لازمی ہے۔ ایم بی اے کے طالب علم کے طور پر مجھے یقین تھا کہ عالمگیر

کارپوریشنیں غربی اور انسانی تنازعات کا حل پیش کرسکیں گی۔ تاہم اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو انتظامی قوتیں عالمگیر کارپوریشنوں کی افزائش اور غلبے کو تقویت پہنچا رہی ہیں، وہی موجودہ انسانی کشمکش کا بھی مرکز ہیں۔ اب میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اجتماعی المناک انجام سے بچنے کے لیے ہمیں تجارت میں کارفرما نظام کو بنیادی طور پر تبدیل کرنا ہوگا تاکہ اقتدار چھوٹی اور مقامی ہیئتوں کے پاس رہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اس ضروری تبدیلی کے لیے نظام کے باہر کام کرنے والی شہریوں کی تنظیموں کی کوششوں کے علاوہ ان لوگوں کے تعاون اور کوششوں کی بھی ضرورت پڑے گی جو نظام کے اندر موجود ہیں — بشمول ان کے جو ہماری بڑی کارپوریشنوں اور مالیاتی اداروں کی سربراہی کررہے ہیں۔

جہاں تک روحانی اقدار کا سوال ہے، میری پرورش پروٹسٹنٹ مسیحی عقیدے کے زیرسایہ ہوئی تھی، لیکن مجھے تمام عظیم مذہبوں کی تعلیمات سے دانائی حاصل ہوتی ہے۔ میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمیں ایک داخلی روحانی دانش تک رسائی حاصل ہے اور اس پر بھی کہ بطور ایک جاندار نوع کے ہماری اجتماعی نجات جزوی طور پر اسی دانش پر منحصر ہے جسے جدید سائنس، مارکیٹ اور کمیونٹی کے اداروں — اور یہاں تک مذہب کے اداروں نے بھی — ہمارے لیے اجنبی بنا دیا ہے۔ اسے نئے سرے سے پاکر ہم مارکیٹ اور کمیونٹی کے درمیان، سائنس اور مذہب کے درمیان، اور دولت اور روح کے درمیان وہ تخلیقی توازن حاصل کرسکتے ہیں جو صحت مند انسانی معاشروں کے قیام اور ان کے برقرار رہنے کے لیے لازمی ہے۔

مجھے امید ہے کہ اس تعارف سے آپ کو اس کتاب سے اس طرح آشنا ہونے میں مدد ملے گی جیسے آپ کسی ایسے دوست کے ساتھ گفتگو میں شامل ہوتے ہیں جس کی آپ قدر کرتے ہوں۔ اس کتاب کے مطالعے کے ذریعے آپ درحقیقت ان بہت سے دوستوں کے ساتھ گفتگو میں شامل ہو رہے ہیں جنھوں نے اس تجزیے اور بصیرت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے جو یہ کتاب پیش کرتی ہے۔ اگر آپ پہلے ہی سے ان مسائل پر ہونے والی وسیع تر گفتگو میں شامل نہیں ہیں، تو میں امید رکھتا ہوں کہ یہ کتاب آپ کو شامل ہونے پر اکسائے گی۔

اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو تجارتی نظام کے اندر کام کررہے ہیں، تو میری درخواست ہے کہ اس کتاب "دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی" کے مطالعے کے دوران اپنے تجارتی کردار کو دخل

انداز نہ ہونے دیں۔ اسے شہری کے طور پر اپنے کردار کے نقطۂ نظر سے پڑھیے، اور ایسی ماں یا ایسے باپ کے نقطۂ نظر سے جو اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے فکر مند ہے۔ اس طرح کتاب میں مضمر پیغام، اور نظام کو تبدیل کرنے کی تحریک میں شمولیت کی دعوت کو معروضی طور پر سننا اور جانچنا کسی قدر کم دشوار اور کم تکلیف دہ ہو جائے گا۔

اس کتاب میں جو کچھ کہا گیا ہے، اسے مہربانی کر کے ہوشیار اور تنقیدی نظر سے پڑھیے۔ اپنے تناظر اور دانائی کی روشنی میں اس پر غور کیجیے۔ اس پر سوال اٹھائیے۔ اسے چیلنج کیجیے۔ آپ جس طرح جینے کے خواہش مند ہیں اس پر اس کے مضمرات پر غور کیجیے۔ اس پر دوستوں سے گفتگو کیجیے۔ انھیں بتائیے کہ کہاں آپ کو اس کتاب سے اتفاق ہے اور کہاں اختلاف؛ آپ نے اس کیا کچھ سیکھا اور کہاں یہ آپ کو ادھوری محسوس ہوئی۔ ان سے ان کے خیالات معلوم کیجیے۔ فکر کی نئی راہوں پر ان کے ساتھ سفر کیجیے۔ گفتگو کو ایک نئی سطح تک لے جائیے۔ اور پھر عمل کا آغاز کیجیے۔

اگرچہ وہ عمومی سمت جدھر ہمیں جانا ہے ہر گزرتے دن کے ساتھ واضح ہوتی چلی جا رہی ہے، لیکن اس راہ پر آج تک کوئی گیا نہیں ہے۔ اگر ہمیں کسی ایسے راستے پر چلنے کی تمنا ہے جس کے سنگ میل بالکل واضح ہوں، تو ہمیں مایوسی ہوگی۔ ہمارے زمانے کے دو عظیم سماجی کارکنوں مائلز ہورٹن (Miles Horton) اور پاؤلو فریرے (Paulo Freire) کے درمیان گفتگوؤں پر مبنی ایک کتاب کے عنوان سے روشنی حاصل کرتے ہوئے، میں کہوں گا کہ ہم نے افق کے اُس پار ایک ایسی منزل کی طرف جانے کا ارادہ کیا ہے، جس کو جانے والا ''راستہ چلنے سے بنے گا''۔

اداروں کے نظام کی ناکامی سے سمجھوتا کرنے سے ہمارے انکار کا سبب دراصل اس حقیقت میں پنہاں ہے کہ ٹیلی وژن سیاسی مباحثے کو محض ساؤنڈ بائٹس کی سطح پر کھینچ لاتا ہے جبکہ تدریسی ادارے دانشورانہ جستجو کو منظم کر کے نہایت باریک بیں خصوصی ڈسپلن میں بدل ڈالتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ہم پیچیدہ مسائل پر ایک دوسرے سے الگ، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں غور کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہماری زندگی کا ہر پہلو کسی نہ کسی طرح ہر دوسرے پہلو سے جڑا ہوا ہے۔ جب ہم نظام میں مضمر خرابیوں پر غور کرتے ہوئے ٹکڑوں میں سوچنے کا

Scanned with CamScanner

طریقہ اختیار کر لیتے ہیں تو یہ تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے دریافت کیے ہوئے حل ناموزوں نکلتے ہیں۔ اگر بنی نوع انسان کو اس مصیبت سے نجات حاصل کرنی ہے جسے ہم نے خود پیدا کیا ہے، تو ہمیں خود میں پورے پورے نظاموں پر مجموعی طور پر غور کرنے اور ہمہ گیر عمل کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔

پورے نظاموں پر مجموعی طور پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سادہ خیالی پر مبنی حلوں سے ہوشیار رہا جائے، مختلف مسائل اور ان واقعات کے مابین رشتہ دریافت کیا جائے جنھیں روایتی فکر میں نظرانداز کر دیا جاتا ہے، اور ایسے نفسِ مضمون سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کیا جائے جو ہمارے قریبی تجربے اور خصوصی مہارت سے باہر واقع ہو۔ پورے نظاموں پر مبنی تناظر کو اختیار کرتے ہوئے یہ کتاب بہت سے عناصر پر مبنی بہت سا رقبہ اپنے اندر سمیٹتی ہے۔ آپ کو یہ یاد رکھنے میں مدد دینے کے لیے کہ کتاب کے مختلف حصوں میں تشکیل پاتے ہوئے دلائل کس طرح باہم مربوط ہوتے ہیں، مجموعی دلائل کو اس تعارف میں مختصراً بیان کر دیا گیا ہے۔ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ ان دلائل کو فوراً جوں کا توں قبول کر لیں، بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اپنے ذہن کو کھلا رکھیں یہاں تک کہ آپ کو ان دلائل کی تہہ میں کارفرما حقائق اور دستاویزی شہادتوں کو پرکھنے کا موقع ملے اور آپ اپنی آزاد تنقیدی صلاحیت کو استعمال کرتے ہوئے کسی نتیجے پر پہنچیں اور رفتہ رفتہ اپنے ذہن میں حقائق کی ایک ترتیب قائم کر سکیں، جو میرے ذہن میں بننے والی ترتیب سے ملتی جلتی بھی ہو سکتی ہے اور اس سے مختلف بھی۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں رکھیے کہ ہم سب لوگ تخلیق کے ایک عمل میں شریک ہیں، اور ان پیچیدہ مسائل کو درست طور پر سمجھ پانے کی انفرادی اور اجتماعی کوشش میں ہم میں سے کوئی بھی سچ پر اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

''دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی'' کا نقطۂ آغاز یہ مشاہدہ ہے کہ ہم دنیا کے تقریباً ہر ملک میں تیزی سے بڑھتے ہوئے سماجی اور ماحولیاتی انتشار کو محسوس کر رہے ہیں — جس کا اظہار روز بروز بڑھتی ہوئی غریبی، بے روزگاری، نابرابری، پرتشدد جرائم، خاندانوں کی شکست و ریخت اور ماحولیاتی بگاڑ کی صورت میں ہو رہا ہے۔ ان مسائل کا جزوی سبب یہ ہے کہ ۱۹۵۰ء سے اب تک کے عرصے میں معاشی سرگرمی پانچ گنا ہو چکی ہے جس کے باعث ماحولیاتی نظام پر پڑنے والا انسانی دباؤ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ ہماری زمین اسے مزید سہارنے کے قابل نہیں رہی۔ پبلک پالیسی کے بنیادی انتظامی اصول کے طور

پر معاشی افزائش کی مسلسل جستجو کے نتیجے میں ماحولیاتی نظام کی خود کو تازہ دم کرنے کی صلاحیت تیزی سے ختم ہوتی جا رہی ہے اور وہ سماجی تانا بانا بھی تار تار ہوتا جا رہا ہے جو انسانوں کی اجتماعی زندگی کی جان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے باعث وسائل پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے مالداروں اور غریبوں کے درمیان کشمکش میں تیزی آ رہی ہے — ایک ایسی کشمکش جس میں غریب ہمیشہ شکست کھا جاتے ہیں۔

حکومتیں اس صورت حال کے ازالے کے لیے کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں دکھا رہیں، اور عوامی مایوسی اور اشتعال میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن یہ محض حکومتی نوکر شاہی کی ناکامی نہیں ہے۔ یہ طرز حکمرانی کا بحران ہے جو اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ تمام نظریاتی، سیاسی اور ٹیکنالوجی سے متعلق قوتیں عالمگیر معیشت کے عمل کی پشت پر جمع ہو گئی ہیں جو حکومتوں کے ہاتھوں سے، جو عوامی بہبود کے لیے ذمے دار ہیں، اقتدار چھین کر مٹھی بھر کارپوریشنوں اور مالیاتی اداروں کے ہاتھوں میں سونپ رہا ہے جن کا واحد مقصد فوری اور قلیل میعادی منافع حاصل کرنا ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں بے پناہ اقتصادی اور سیاسی طاقت چند مراعات یافتہ افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئی ہے اور فطرت کی ختم ہوتی ہوئی دولت کی ملکیت میں ان افراد کا حصہ نہایت تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، جس سے ان میں یہ یقین پیدا ہو رہا ہے کہ نظام نہایت عمدگی سے کام کر رہا ہے۔

وہ لوگ جنھیں اس نظام کی ناکامی کی قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے ان کو فیصلہ کرنے کے حق میں شمولیت سے محروم کر دیا گیا ہے اور ذرائع ابلاغ نے، جن پر کارپوریشنوں کی گرفت مضبوط ہے، انھیں اس بارے میں سخت کنفیوژن میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ان کی موجودہ ابتر حالت کس سبب سے ہے۔ یہ ذرائع ابلاغ ان پر مسلسل اس نقطۂ نظر کی بمباری کرتے رہتے ہیں جو طاقتوروں کا نقطۂ نظر ہے۔ ایک فعال پروپیگنڈا مشینری، جسے دنیا کی بڑی بڑی کارپوریشنیں کنٹرول کرتی ہیں، ہمیں متواتر یہ دلاسا دیتی رہتی ہے کہ مسرت کی طرف جانے والا راستہ صارفیت ہی کا ہے، اور یہ کہ مارکیٹوں تک رسائی میں حکومتوں کی جانب سے ڈالی جانے والی رکاوٹیں ہماری بدحالی کی ذمے دار ہیں، اور یہ کہ عالمگیر معیشت نہ صرف تاریخی طور پر ناگزیر ہے بلکہ بنی نوع انسان کے لیے اعلیٰ ترین مقام ہے۔ درحقیقت یہ سب باتیں محض جھوٹ ہیں جنھیں اس لیے پھیلایا جاتا ہے کہ بے تحاشا بڑھتے ہوئے لالچ کو جواز دیا جا سکے اور اس حقیقت پر پردہ ڈالا جا سکے کہ انسانی اداروں کی عالمگیر اداروں میں تبدیلی کس حد تک چند مراعات

یافتہ افراد کی مفصل، باوسیلہ اور دانستہ مداخلت کا نتیجہ ہے، جن کی دولت انھیں یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ باقی انسانوں سے دور، سراب کی دنیا میں رہ سکیں۔

ان قوتوں نے کارپوریشنوں اور مالیاتی اداروں کو، جو کبھی کارآمد اور فائدہ مند تھے، مارکیٹ کی آمریت قائم کرنے والے اداروں میں منقلب کر دیا ہے، اور یہ مارکیٹ دنیا بھر میں سرطان کی طرح پھیل گئی ہے، اور اس سرطان نے ہماری زمین کے بیشتر جاندار رقبے پر قبضہ کر لیا ہے، لوگوں کے روزگار چھین کر ان کو بے دخل کر دیا ہے، جمہوری اداروں کو غیر موثر کر ڈالا ہے اور دولت کے حصول کی کبھی نہ مٹنے والی خواہش میں زندگی کی قیمت پر پل رہا ہے۔ جس طرح ہمارا اقتصادی نظام مخصوص جغرافیائی مقامات سے بلند ہو کر ہمارے جمہوری اداروں پر غالب آ گیا ہے، اسی طرح دنیا کی طاقتور ترین کارپوریشنیں بھی عالمگیر مالیاتی نظام کی اسیر بن گئی ہیں جس نے دولت کی تخلیق کو حقیقی قدر کی تخلیق سے علیحدہ کر دیا ہے اور جو نفع پہنچانے کے معاملے میں پیداواری سرمایہ کاری پر نچوڑنے والی سرمایہ کاری کو ترجیح دینے لگا ہے۔ اس کھیل کے بڑے جیتنے والے وہ کارپوریٹ حملہ آور ہیں جو اپنے قلیل میعادی منافعے کی خاطر عمدہ پیداواری کمپنیوں کو ان کے اثاثوں سے محروم کر دیتے ہیں، اور وہ سٹے باز جو مارکیٹ کے اترنے چڑھنے سے منافع کماتے ہیں اور ان افراد سے جو پیداوار اور سرمایہ کاری کی سرگرمی میں مصروف ہیں، ایک قسم کا پرائیویٹ بھتہ وصول کرتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ قلیل میعادی منافع پیدا کرنے کے دباؤ میں آ کر دنیا کی بڑی بڑی کارپوریشنیں ڈاؤن سائزنگ کے عمل کے تحت اپنے عملے میں چھانٹی اور اپنے کاموں میں کمی کر رہی ہیں۔ لیکن اس طرح ان کی طاقت کم نہیں ہو رہی۔ دوسری کارپوریشنوں کے ساتھ انضمام، ان کو خرید لینے اور ان کے ساتھ حکمت عملی کے اتحاد قائم کرنے کے عمل کی مدد سے مارکیٹ اور ٹیکنالوجی پر اپنا کنٹرول مضبوط کرتے ہوئے وہ ذیلی ٹھیکے داروں اور مقامی کمیونٹیوں دونوں کو ایسی مسابقت میں شریک ہونے پر مجبور کر رہی ہیں جس میں معیارات کو گھٹیا کیا جاتا ہے تا کہ ان مارکیٹوں اور روزگار کے ان موقعوں تک رسائی حاصل کی جا سکے جو عالمگیر کارپوریشنوں کے کنٹرول میں ہیں۔ ان سے متعلق مارکیٹ کی قوتیں سماجی اور ماحولیاتی طور پر تباہ کن ٹیکنالوجیوں پر ہمارا انحصار اور زیادہ گہرا کر رہی ہیں جن کے ذریعے ہماری جسمانی، سماجی، ماحولیاتی اور ذہنی صحت کارپوریٹ منافعے کی بھینٹ چڑھتی چلی جا رہی ہے۔

مسئلہ دراصل بذات خود مارکیٹ یا تجارت کا نہیں بلکہ ایک بری طرح سڑے ہوئے عالمی معاشی نظام کا ہے جو تیزی سے انسانی کنٹرول سے باہر ہوتا جارہا ہے۔ اس نظام کی حرکیات اتنی طاقتور ہو چکی ہیں اور ان میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو چکا ہے کہ کارپوریٹ منیجروں کے لیے مفاد عامہ میں اس کا انتظام چلانا نہایت دشوار ہوتا جارہا ہے، خواہ خود ان کی اخلاقی اقدار اور کمٹ منٹ کتنے ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔

دولت میں اضافہ کرنے کی ہوس سے تحریک پاکر یہ نظام انسانوں کو ایسا عنصر سمجھتا ہے جو اس کی موثر کارکردگی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں، اور انھیں اپنی ہر سطح سے خارج کرتا چلا جارہا ہے۔ جس طرح پہلے صنعتی انقلاب نے انسان کی جسمانی محنت پر انحصار کو کم کیا تھا، انفارمیشن کے میدان میں آنے والا انقلاب انسانی آنکھوں، کانوں اور دماغ پر انحصار کو کم کر رہا ہے۔ پہلے صنعتی انقلاب نے اس عمل کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والی بے روزگاری سے نمٹنے کے لیے دوسرے ملکوں کے کمزور عوام کو غلام بنایا تھا اور اپنی زائد آبادی کو تارکین وطن کے طور پر کم آباد سرزمینوں پر بھیج دیا تھا۔ نو آبادی بنائے گئے ملکوں کے عوام نے اپنی حالت کو سنبھالنے کے لیے روایتی سماجی سانچوں پر انحصار کیا۔ اب جبکہ دنیا کی جغرافیائی سرحدیں بڑی حد تک بھر چکی ہیں اور سماجی معیشتیں مارکیٹ کی مداخلت کے باعث بہت کمزور ہو چکی ہیں، اس قسم کے سیفٹی والو وجود نہیں رکھتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ فارغ کردیے جانے والے لوگ بھوک اور تشدد کا شکار، بے گھر گداگر، وظیفہ خوار یا بڑے بڑے پناہ گزیں کیمپوں کے مکین بننے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر اس راہ پر ہمارا سفر جاری رہا تو اس کا نتیجہ سماجی اور ماحولیاتی شکست و ریخت میں زبردست اضافے کے سوا کسی اور صورت میں نہیں نکل سکتا۔

لیکن اپنی طاقت کو، جسے ہم نے دولت پیدا کرنے والے اداروں کو سونپ دیا تھا، ان سے واپس لینا اور ثقافتی اور حیاتیاتی تنوع کو برقرار رکھنے والے معاشروں کو نئے سرے سے تخلیق کرنا ابھی ہمارے اختیار میں ہے — اور اس سے سماجی، ذہنی اور روحانی ترقی کے اتنے وسیع نئے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں جو ہمارے موجودہ تخیل سے کہیں باہر ہیں۔ دنیا بھر میں لاکھوں لوگ پہلے ہی اپنی طاقت واپس لینے، اپنی کمیونٹیوں کو بحال کرنے اور زمین کے زخموں کا مداوا کرنے کے اس عمل میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی پہل کاریاں عالمی سطح پر ایسے اتحاد قائم کر کے ایک طاقتور سیاسی تحریک کی شکل اختیار کر رہی ہیں جس کی بنیاد زندگی کی وحدت کے ایک عالمی شعور پر ہے۔

''دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی'' میں شہریوں کا ایجنڈا پیش کیا گیا ہے جو انھی کوششوں کو تقویت دینے کے لیے ہے کہ کارپوریشنوں کو سیاست سے بے دخل کیا جائے اور ایسی مقامی معیشتیں قائم کی جائیں جن کے تحت، عالمی تعاون باہمی کے ماحول میں، مقامی وسائل کا کنٹرول مقامی کمیونیٹوں کے ہاتھ میں ہو۔ کوپرنیکس کے انقلاب سے شروع ہونے والے سائنسی اور صنعتی دور کے مادّیت پرست طرزِ فکر کی حدوں تک پہنچ کر اب ہم ایک ایسے ماحولیاتی دور کی دہلیز پر ہیں جس کو وجود میں لانے والا ایک ماحولیاتی انقلاب ہے۔ جس کی بنیاد ہماری فطرت کے روحانی اور مادّی پہلوؤں کے ایک زیادہ ہمہ گیر شعور پر ہے۔ اب یہ انقلاب ہم میں سے ہر ایک سے مطالبہ کر رہا ہے کہ اپنا سیاسی اختیار دوبارہ حاصل کریں، اپنی روحانیت کو نئے سرے سے دریافت کریں اور ایسے انسانی معاشرے تخلیق کریں جو زندگی کو بھرپور اور پرمسرت طور پر گزارنے کی ہماری خواہش اور صلاحیت کی تکمیل کر سکیں۔

۲

ہمارا گاؤں بہت خوشحال تھا... ہماری خوشحالی کی اصل بنیاد... کمیونٹی کا وہ گہرا اور پائیدار احساس تھا جو ہمیں ان وسائل کو بہترین طور پر استعمال کرنے کے قابل بناتا تھا... ہمارے پاس وہ سب کچھ تھا جس کی ہمیں ضرورت تھی — ہنرمندی سے بنائی گئی خوبصورت چیزیں جو بہت دن چلتی تھیں — لیکن ہم زیادہ ''اسراف'' نہیں کرتے تھے۔

—ایکناتھ ایشورن (Eknath Easwaran)

مادّی تسکین کی تلاش کے مقصد کے گرد معاشروں کی تعمیر کر کے ہم نے سماجی انتشار کو ایک خوبی کی حیثیت دے دی ہے اور اپنی زندگی کے معیار کو گھٹیا بنا لیا ہے۔ انسان ایک پیچیدہ مخلوق ہے۔ ہم میں نفرت، تشدد، مسابقت، اور لالچ کی ثابت شدہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہم محبت، نرمی، تعاون اور ہمدردی کی بھی ثابت شدہ صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ صحت مند معاشرے آخرالذکر صلاحیتوں کو پروان چڑھاتے ہیں اور اس عمل میں ان چیزوں کی بڑی بہتات پیدا کر لیتے ہیں جو ہمارے عمدہ طرزِ زندگی کے لیے سب سے بڑھ کر اہم ہیں۔ انتشار زدہ معاشرے اول الذکر صلاحیتوں کو پروان

چڑھاتے ہیں اور اس عمل کے دوران قلت اور محرومی پیدا کرتے ہیں۔ صحت مند معاشرہ ماحول کے ساتھ توازن میں زندہ رہنے کو آسان بناتا ہے، جبکہ انتشار زدہ معاشرہ اسے تقریباً ناممکن بنادیتا ہے۔

یہ انتخاب ہمارا اپنا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کو صحت مند بنانا چاہتے ہیں یا انتشار زدہ۔ بڑی حد تک یہ انتخاب اس پر محیط ہے کہ معاشرے کا انتظام انسانوں کے مفاد میں چلایا جائے یا کارپوریٹ مفاد میں۔ ہم اس بات کو محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر ہم ایسے معاشرے تخلیق کرنے پر توجہ مرکوز کریں جو ہمارے اصراف کی مقدار میں اضافہ کرنے کے بجائے ہماری زندگی کے معیار میں اضافہ کرے، تو ہم ماحولیاتی پائیداری اور تقریباً تمام لوگوں کے لیے بہتر زندگی کی سمت بیک وقت بڑھ سکتے ہیں۔

اگرچہ مسابقت کی جبلت ہماری فطرت کا ایک اہم جز ہے، لیکن اس بات کی خاصی معقول شہادت موجود ہے کہ یہ جبلت تعلق قائم کرنے، دوسروں سے مہربانی کا سلوک کرنے اور تعاون کرنے کی خواہش کے مقابلے میں ضمنی حیثیت رکھتی ہے۔ ان تمام جانداروں کی طرح جنھیں اپنی بقا کے لیے معاشرتی رشتوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے، انسانوں نے تعلق بنانے اور تعاون کرنے کی صلاحیت کو بھی ترقی دی اور مسابقت کرنے کی صلاحیت کو بھی۔ ثقافتی بشریات کی ماہر میری کلارک (Mary Clark) کے مطابق:

> ابتدائی انسانی نوع کی بقا ممکن نہیں ہوسکتی تھی اگر ماں باپ اور بچے کے تعلق سے بڑھ کر، جو نوزائیدہ بچے کے زندہ رہنے کے لیے لازمی ہے، وسیع تر سماجی تعلق قائم نہ ہوتا، کیونکہ یہ ایسا مقصد تھا جسے صرف مائیں پورا نہیں کرسکتی تھیں۔ اپنے گروہ سے سماجی تعلق ایک حیاتیاتی ضرورت تھا، نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بالغ انسانوں کے لیے بھی۔

حالات میں کچھ بہت زیادہ فرق نہیں آیا ہے۔ یہ ایک بنیادی حقیقت ہے، اگرچہ اسے اکثر نظرانداز کیا جاتا ہے، کہ سماجی تعلق جدید معاشرے کے صحت مند انداز میں چلنے کے لیے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری یہ روایتی یا قبائلی معاشروں کے لیے تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے ماہر سیاسیات رابرٹ پٹنم (Robert Putnam) نے اس تعلق کو جو کسی مضبوط شہری معاشرے کی خصوصیت ہوتا ہے، ''سماجی سرمائے'' کا نام دیا ہے اور اٹلی میں بلدیاتی حکومت کے موثر ہونے کے ایک مطالعے میں اس کی

اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۹۷۰ء میں اٹلی میں بیس علاقائی بلدیاتی حکومتوں کے قیام کا عمل شروع کیا گیا۔ ان کی رسمی ساخت بالکل ایک سی تھی۔ لیکن اس سماجی، معاشی، سیاسی، اور ثقافتی ماحول میں ڈرامائی فرق تھا جس میں ان ساختوں کو نافذ کیا گیا۔ ان کے مقامات ''قبل از صنعتی سے لے کر بعد از صنعتی دور تک، کٹر کیتھولک سے لے کر کٹر کمیونسٹ تک، جامد جاگیردارانہ سے لے کر پر جوش طور پر جدید تک'' ہر زمرے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض مقامات پر حکومت کے نئے ساختے ''غیر موثر، سست اور بدعنوان'' ثابت ہوئے جبکہ بعض دوسرے مقامات پر متحرک اور موثر اور ان موخر الذکر صورتوں میں انھوں نے ''بچوں کی دن بھر کی دیکھ بھال کے اختراعی پروگراموں اور روزگار کی تربیت کے مراکز کی بنیاد ڈالی، سرمایہ کاری اور معاشی ترقی کو فروغ دیا، ماحولیاتی معیارات اور خاندانی شفاخانے قائم کیے۔''

پٹنم نے ان دونوں قسم کے مقامات کے درمیان، جہاں نئے حکومتی ساختے ناکام ہوئے اور جہاں کامیاب رہے، اشاریوں کا صرف ایک مجموعہ پایا جو ان کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا تھا۔ ان اشاریوں سے مضبوط اور فعال شہری معاشرے کے وجود کا اندازہ ہوتا تھا اور اس اندازے کے اشاریوں میں ''ووٹ ڈالنے والوں کی شرح، اخبارات کا مطالعہ، کلیسائی اور ادبی سرگرمیوں میں شرکت، اور لائنز کلب اور فٹ بال کلبوں کی رکنیت'' شامل تھے۔ جن علاقوں میں ان اشاریوں کی شرح اونچی تھی وہاں پٹنم کے مطابق ''سماجی سرمایہ'' بڑی مقدار میں موجود تھا۔ غیر مارکیٹی تعلقات کے ایک جامع نیٹ ورک سے عمومی طور پر باہمی اعتماد اور تعاون کی فضا پیدا ہوئی تھی جس نے انسانی تعلقات کی موثریت کو بڑھا دیا تھا۔

ہم نے معاشروں کے صحت مند انداز میں کام کرنے کے عمل میں سماجی سرمائے کی اہمیت پر بہت کم توجہ دی ہے اور معاشی ساختے اور پالیسیاں اس کے بننے اور زائل ہونے میں جو کردار ادا کرتی ہیں ان پر کم ہی غور کیا ہے۔ مندرجہ ذیل سوالوں سے ان دونوں کے تعلق کی نوعیت کا اندازہ ہوتا ہے: کیا لوگ ایسی مقامی دکانوں پر خریداری کرنا پسند کرتے ہیں جہاں وہ دکاندار کو نام سے جانتے ہوں یا بڑے بڑے شاپنگ مالز اور ریٹیل چین اسٹورز پر؟ کیا وہ کسانوں کی لگائی ہوئی مارکیٹ کو ترجیح دیتے ہیں یا سپر مارکیٹ کو؟ کیا فارم چھوٹے افراد کی ملکیت کے اور خاندان کے ارکان کے زیر انتظام ہیں یا ان کا

Scanned with CamScanner

بندوبست بڑی بڑی کارپوریشنوں کے ہاتھ میں ہے جہاں بے زمین کسان مزدوروں کے طور پر کام کرتے ہیں؟ کیا لوگ اپنا فارغ وقت لیگ بیس بال، اجتماعی باغات، مقامی تھیٹر، کمیونٹی اسکوائر، کمیونٹی سنٹر، اور اسکول بورڈ میں صرف کرتے ہیں یا محض کمرشل ٹی وی دیکھتے ہیں؟ کیا اس علاقے میں مقامی بینک اور کریڈٹ کوآپریٹوز ہیں جو مقامی کاروبار کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں یا صرف بڑے بڑے شہری بینکوں کی شاخیں ہیں جن کی اصل وفاداری بین الاقوامی مالیاتی مارکیٹ سے ہے؟ کیا یہاں کے باشندے اس علاقے کو اپنا مستقل گھر سمجھتے ہیں یا وہاں کام کرنے والے اور پیشہ ور لوگ زیادہ تر وہاں عارضی طور پر رہ رہے ہیں؟ کیا یہاں کے پیداواری اثاثوں کی ملکیت مقامی ہے یا بڑی بڑی دور افتادہ کارپوریشنوں کے ہاتھ میں ہے؟ کیا یہاں کے جنگلات مقامی طور پر، محتاط انداز میں اور پائیداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے کاٹے جاتے ہیں تاکہ مقامی صنعتوں کی ضروریات پوری کی جائیں یا مقامی جنگلات بڑی بڑی عالمی کارپوریشنوں کے ہاتھوں ہر چالیس سے ساٹھ سال میں صاف کر دیے جاتے ہیں اور لکڑی کے لٹھے جوں کے توں دور کی سرزمینوں کو برآمد کر دیے جاتے ہیں؟

ان سوالوں کے جواب اس بات کا طاقتور اشارہ دیتے ہیں کہ آیا اس علاقے کے باشندوں میں وقار، آزادی، ذمے داری، خوشحالی، اور تحفظ کا احساس موجود ہے، اور آیا یہاں انسانوں کے باہمی رشتے اعتماد، اشتراک اور تعاون کی بنیاد پر استوار ہیں۔

یہ بات عام طور پر نوٹ کی گئی ہے کہ ۸۰ فیصد ماحولیاتی نقصان کا سبب دنیا کے ایک ارب سے کچھ زیادہ بے تحاشا اصراف کرنے والے لوگ ہیں۔ جیسا کہ ایلن ڈرننگ (Alan Durning) نے اپنی کتاب ''کتنا کچھ کافی ہے؟'' (*How Much is Enough?*) میں نشان دہی کی ہے، یہ لوگ دنیا کی آبادی کا تقریباً ۲۰ فیصد حصہ ہیں جن کی زندگی کاروں، گوشت پر مشتمل غذاؤں، اور پیک کی ہوئی اور استعمال کے بعد پھینک دی جانے والی مصنوعات کے گرد گھومتی ہے۔ دوسری طرف، دنیا کی آبادی کے ۲۰ فیصد لوگ انتہائی محرومی کی حالت میں زندہ ہیں۔ تاہم ڈرننگ نے ایک اور اہم نکتے کی نشان دہی کی ہے جسے عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے: دنیا کے تقریباً ۶۰ فیصد باشندے آج بھی اپنی بیشتر بنیادی ضروریات نسبتاً پائیدار طریقوں سے پوری کر رہے ہیں۔ دنیا کی پائیداری برقرار رکھنے والے طبقے

کے ارکان کی حیثیت سے یہ لوگ سائیکلوں پر یا عوامی زمینی ٹرانسپورٹ سے سفر کرتے ہیں؛ دالوں، سبزیوں اور کچھ گوشت پر مشتمل صحت مند خوراک کھاتے ہیں؛ پیک کی ہوئی بہت کم مصنوعات خریدتے ہیں اور اپنی استعمال کردہ چیزوں کو دوبارہ استعمال کے قابل بنا لیتے ہیں۔ اگرچہ ان کا طرز زندگی ہمارے صارفانہ تعیش کے تصور پر پورا نہیں اترتا، لیکن یہ انتہائی دشواریوں والا طرز زندگی بھی نہیں ہے، اور کسی موزوں طور پر منظم معاشرے میں یہ ایک عمدہ اور اطمینان بخش معیار زندگی کی خصوصیات کہلائی جاسکتی ہیں۔

کوئی معاشرہ جو پیدل چلنے، سائیکل چلانے اور عوامی ٹرانسپورٹ استعمال کرنے پر استوار ہو وہ زیادہ بہتر معیار زندگی فراہم کرتا ہے بہ نسبت اس معاشرے کے جہاں کی عوامی جگہوں پر کاروں اور فری ویز کا غلبہ ہو۔ کم گوشت اور کم چربی والی غذائیں جو فطری اجزا پر مشتمل ہوں، حیوانی چربی کی بہتات والی غذاؤں کے مقابلے میں زیادہ عمدہ صحت اور جسمانی توانائی مہیا کرتی ہیں۔ جس طرز زندگی میں بدلتے ہوئے فیشن کا تعاقب کرنے، جنک فوڈ اور بے مصرف اشیا کو بے اختیار خریدنے سے نجات حاصل کرلی گئی ہو، وہ ان چیزوں سے بھی آزاد ہوتی ہے جو ہمیں خاندان، کمیونٹی اور فطرت کی رفاقت میں بسر کی ہوئی زندگی سے بیگانہ کردیتی ہیں۔

پچاس برس کی معاشی افزائش اور قومی ترقی کا المیہ اسی حقیقت میں پوشیدہ ہے۔ ایسے معاشرے تعمیر کرنے کے بجائے جو پائیداری برقرار رکھنے والے افراد کو بہتر زندگی مہیا کریں اور محروم افراد کو پائیدار طبقے میں لانے کی کوشش کریں، ہم نے بے تحاشا اصراف کرنے والے افراد کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنے اصراف میں اور اضافہ کریں، اور پائیدار طبقے کے بہت سے افراد کو نیچے کی طرف دھکیل کر محروم طبقے میں شامل کردیا۔ اس عمل کے دوران ہم نے پائیدار طبقے کے افراد کے لیے زندگی کو اور دشوار بنادیا کیونکہ ہم نے پیداوار کے وہ پرانے طریقے تبدیل کردیے جو کبھی ان کی ضروریات پوری کرتے تھے، اور اس قسم کی سہولیات تعمیر کرنے پر توجہ مرکوز کردی — مثلاً ہائی ویز اور شاپنگ مالز — جو بے تحاشا اصراف کرنے والوں کے کام آتی ہیں، اور ان سہولیات کو — مثلاً پبلک ٹرانسپورٹ اور عوامی مارکیٹوں کو — نظر انداز کیا جو پائیدار طبقے کی ضرورت پوری کرتی ہیں۔

ہم جب کبھی بے تحاشا اصراف کے بارے میں سوچتے ہیں تو عموماً اس طرح سوچتے ہیں کہ اس پر قابو پانا انفرادی نظم وضبط کا معاملہ ہے کہ کس طرح اس قسم کی بہت سی چیزیں ترک کی جائیں جو

Scanned with CamScanner

ہماری زندگی کو آرام دہ اور اطمینان بخش بناتی ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں سوچنے کا ایک اور، زیادہ پرکشش طریقہ بھی ہے: ہماری زندگی گزارنے کی جگہوں اور پیداواری نظاموں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ زندگی کے معیار میں بہتری ہو، اور ساتھ ہی ساتھ اس بوجھ کو کم سے کم کیا جائے جو ہم اپنے قدرتی ماحول پر ڈال رہے ہیں۔ جب ۱۹۹۲ء میں میں اور فران (میری بیوی) نیویارک واپس لوٹے تو ہمیں اس کے امکانات کا احساس ہوا۔

اگرچہ نیویارک شہر جرائم، غریبی اور جدید معاشی زندگی کی نابرابری کے دوسرے مظاہر سے بری طرح متاثر ہے، لیکن ہمیں اس سرد، غیر شخصی شہر سے واسطہ نہیں پڑا جس کی ہم توقع کر رہے تھے۔ اس کے بجائے ہمیں نسلی طور پر متنوع مقامی محلوں اور خاندان کے افراد کے زیرِ انتظام چھوٹی دکانوں پر مشتمل شہر ملا جس میں انسانی توانائی اور زندگی کی وہی دھڑکن موجود تھی جو ہم نے دوسری جگہوں پر دیکھی تھی۔ نیویارک کو کسی بھی طرح پائیدار طرزِ زندگی کا نمونہ قرار نہیں دیا جاسکتا، اور اس شہر میں ایسا بہت کچھ ہے جو زندگی کے معیار کو بری طرح متاثر کرتا ہے، لیکن نیویارک میں رہ کر مجھے ایسے بہت سے امکانات دکھائی دیے جنھیں عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

رہائشی گنجان آبادی—فی مربع بلاک پانچ ہزار افراد ایسی عمارتوں میں آباد ہیں جہاں ایک سے زیادہ خاندان رہتے ہیں—فعال اور کارآمد زیرِ زمین ریل (سب وے) کا نظام، اور بیشتر باشندوں کے گھر سے پیدل کے فاصلے پر موجود خریداری کی سہولت، ان خصوصیات کے باعث نیویارک شہر میں توانائی کا فی کس اصراف باقی امریکہ کے مجموعی اوسط کے مقابلے میں آدھا ہے۔ چالیس برس میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میرے اور فران کے پاس کار نہیں ہے۔ میرا دفتر ہمارے اپارٹمنٹ ہی میں واقع ہے، اور فران اپنے دفتر آنے جانے کے لیے سب وے سے سفر کرتی ہے۔ ہماری نوے فیصد سے زیادہ خریداری کی ضرورتیں ہمارے اپارٹمنٹ سے تین بلاک کے نصف قطر کے اندر اندر پوری ہو جاتی ہیں: فارمیسی، ہارڈ ویئر، الیکٹرانکس، کتابیں، سودا سلف، کپڑے، گھر کے استعمال کی چیزیں—ان سب میں انتخاب کی بڑی گنجائش ملتی ہے۔ میرے دفتر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ماحولیاتی طور پر باشعور پرنٹنگ شاپ سڑک کے اس پار واقع ہے، ایک سافٹ ویئر اسٹور گلی کے کونے پر ہے، اور دفتری سامان کی دکانیں پانچ منٹ کے پیدل کے فاصلے پر موجود ہیں۔

اسی طرح ہمارے گھر سے پیدل یا سب وے کے ذریعے ہر مخصوص قسم اور قیمت کے ریستوران، جاز کلب، تھیٹر، اوپیرا، رقص گھر، آرٹ گیلریاں، میوزیم، فری پبلک کنسرٹ اور ہیلتھ کلب تک پہنچا جا سکتا ہے۔ پارکوں اور بوٹانیکل گارڈنز کا ایک غیر معمولی نظام جو شہر کی سرحدوں کے اندر واقع ہے، فطرت تک رسائی کو بھی ممکن بنا دیتا ہے۔ جب ہمیں شہر سے باہر نکلنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ہم ٹرین سے سفر کرتے ہیں یا محلے کے رینٹ اے کار سے گاڑی کرائے پر لے لیتے ہیں۔ اپنی کار نہ ہونے سے محرومی محسوس کرنے کا کیا سوال، ہمیں تو اس میں آزادی کا احساس ہوتا ہے — بھاری ٹریفک میں سفر کرنے سے، پارکنگ کے مسئلوں سے، انشورنس کی دقتوں سے اور کار کی مرمتوں سے آزادی۔ اس طرح ہم ہر سال جو ہزاروں ڈالر بچاتے ہیں اس سے میرے لیے ممکن ہو جاتا ہے کہ اپنی پسند کے کام کر سکوں، مثلاً یہ کتاب لکھنا۔

ہمیں یونین اسکوائر پر لگنے والے کسانوں کے بازار میں خاص لطف آتا ہے، جو ہمارے گھر سے صرف نصف بلاک کے فاصلے پر ہے۔ وہ لوگ جو محلوں میں فارم، ڈیریاں، کاٹیج وائنریاں، اور کچن بکریاں چلاتے ہیں، یہاں ہفتے میں چار دن اپنا مال فروخت کرتے ہیں — انڈے اور مرغی کا گوشت، ایسی گایوں کا گوشت جنھیں ہارمون کے انجکشن نہیں لگائے جاتے، فطری طور پر اگائے ہوئے پھل اور سبزیاں، تازہ گوشت اور مچھلی جو مصنوعی ہارمونز سے بالکل پاک ہوتے ہیں۔ سال کے زیادہ تر دنوں میں میں اپنا کھانا انھی چیزوں سے تیار کرتا ہوں جو اس بازار میں ملتی ہیں۔ غذائیت اور ذائقے سے بھرپور، خوشبودار اور کیمیکلز سے پاک غذائیں کھا کر ہم خود کو زیادہ صحت مند اور توانا محسوس کرتے ہیں، اچھی نیند سوتے ہیں اور زیادہ صاف ذہن سے سوچتے ہیں۔ ہمیں ان کسانوں سے واقفیت پیدا کرنے میں مزہ آتا ہے اور اس علم سے سکون محسوس ہوتا ہے کہ ہماری غذائیں ماحولیاتی اعتبار سے ذمے دارانہ طریقوں سے تیار کی جارہی ہیں۔

اپنے بنائے ہوئے تھیلوں میں کھانے کی غیر پیک شدہ چیزیں خرید کر لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں سے پیکنگ کا کوڑا کرکٹ بہت کم نکلتا ہے۔ شہر میں ٹین، گلاس، پلاسٹک اور اخباروں کی ردی سے دوبارہ استعمال کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ سنیچر اور بدھ کے بازار میں ایک مقامی رضا کار تنظیم نامیاتی کوڑا کرکٹ جمع کرتی ہے جسے قدرتی کھاد (کمپوسٹ) بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

اب ہم لوگ لینڈفل میں بہت کم کوڑا کرکٹ بھیجتے ہیں۔

مجموعی طور پر ہم پہلے سے کہیں زیادہ صحت مند، مسرور اور ماحولیاتی طور پر ذمے دار زندگی گزار رہے ہیں — اس لیے نہیں کہ ہم نے سورماؤں کی طرح پارسائی اختیار کرلی ہے، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم جس جگہ رہتے ہیں وہ اتفاق سے اسی طرح کی ہے کہ ہمارے لیے اس قسم کی زندگی اختیار کرنا بہت آسان اور فطری ہوگیا ہے۔ اس تجربے سے ہمیں اس بات کی اہمیت کا احساس ہوا ہے کہ ہم اپنی زندگیوں کو جس انداز میں منظم کرتے ہیں اس سے ہمارے سماجی اور ماحولیاتی رشتوں کا تعین ہوتا ہے — اور ہمارے اپنے طرز زندگی کا بھی۔ بہت سی چیزیں ہیں جو نیویارک شہر کو زیادہ رہنے کے قابل اور پائیدار بنا سکتی ہیں — سب سے پہلی تو یہ کہ مین ہیٹن کے علاقے میں نجی گاڑیاں لانے کی ممانعت کر دی جائے — لیکن ہمارے پاس جو کچھ ہے اس سے ہمارے لیے بعض اہم امکانات سامنے آتے ہیں۔

اس حقیقت کے مضمرات پر غور کیجیے کہ ہم بے تحاشا اصراف کرنے والے لوگ کرۂ ارض پر جو ماحولیاتی دباؤ ڈالتے ہیں وہ زیادہ تر اس سے پیدا ہوتا ہے کہ ہم بہت زیادہ تعداد میں کاریں اور ہوائی جہاز استعمال کرتے ہیں، ایسی غیر صحت مندانہ غذائیں کھاتے ہیں جو زمین کو تباہ کرنے والے طریقوں سے تیار کی جاتی ہیں جس سے ان میں زہریلے اجزا باقی رہ جاتے ہیں، اور ایسی چیزیں استعمال کرتے ہیں جن کی غیر ضروری پیکنگ استعمال کے بعد پھینک دی جاتی ہے۔ کیا اس قسم کی چیزوں کو ترک کرنا واقعی بہت بڑا بوجھ ہوگا، جیسے بھیڑ بھری فری ویز پر گھنٹوں کار کا سفر، مستقل شور و غل، ملازمت کا عدم تحفظ، ایسے آلات جنھیں ہم کبھی استعمال نہیں کرتے، ایسے کپڑے جو ہم شاذونادر ہی پہنتے ہیں، غیر صحت منداور چربی والی غذائیں، کیمیائی مادوں سے آلودہ سبزیاں اور پھل، کم عرصے چلنے والی مصنوعات، غیر ضروری پیکنگ، تھکا دینے والے تجارتی سفر، اور توانائی کو ضائع کرنے والی گھر اور دفتر کی عمارتیں؟ اور ان فوجی سرگرمیوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو دنیا میں ہونے والے ماحولیاتی تنزل کے ۳۰ فیصد حصے کے لیے ذمے دار ہیں؟ کیا یہ بڑی مصیبت کی بات ہوگی اگر ہم اپنے تنازعات کو غیر فوجی طریقوں سے حل کریں؟

ہماری ضرورت یہ ہے کہ معاشروں کی ایسی تنظیم کی جائے جس سے پائیدار عمدہ طرز زندگی کا مقصد حاصل ہوسکے۔ ایک اہم نکتہ، جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے، یہ ہے کہ اپنی زندگیوں کو کرۂ ارض کے ساتھ متوازن کرنے کے لیے ہمیں جن اقدامات کی ضرورت ہے وہ زیادہ تر ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی

Scanned with CamScanner

فیصلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ہم مناسب انداز میں یہ فیصلے کریں تو اس سے ہمارے معیار زندگی میں جو بہتری پیدا ہوگی وہ ان معمولی قربانیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہوگی۔ اس کی مثال دینے کے لیے میں چند اقدامات تجویز کروں گا جو ہم تین بڑے شعبوں — شہری فضا اور ٹرانسپورٹ، غذا اور زراعت، اور مادّوں — کو ماحولیاتی طور پر پائیدار بنانے کے لیے کر سکتے ہیں۔ ان میں سے ہر اقدام سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ ہمارے موجودہ طریق عمل انسانی مفاد کے بجائے کارپوریٹ مفاد کے تحت وضع کیے گئے ہیں۔ صحت مند معاشرے تخلیق کرنے کے لیے ہمیں لازمی طور پر جو اقدامات کرنے ہوں گے ان سے ہماری بڑی بڑی کارپوریشنوں کے لیے تو ضرور مشکلات پیدا ہوں گی لیکن ان کے نتیجے میں انسانی زندگی کا معیار بہت بہتر ہو جائے گا۔

اپنی کتاب ''اپنے شہروں اور قصبوں کو واپس لینا'' (Reclaiming Our Cities and Towns) میں ڈیوڈ اینگوشٹ (David Engwicht) نے ہمیں یاد دلایا ہے کہ انسانوں نے شہروں کو ایسی جگہوں کے طور پر ایجاد کیا تھا جہاں لوگوں کے درمیان ربط ضبط ہو سکے۔ شہروں کا مقصد یہ ہے کہ ''اطلاعات، دوستی، مادی اشیا، ثقافت، علم، دانش [اور] ہنر کا تبادلہ ہو سکے'' اور ان سب کے لیے سفر پر نکلنے کی ضرورت نہ پڑے۔ شہر ایک زمانے میں محض انسانوں کے درمیان تبادلے کی جگہوں پر مشتمل ہوتے تھے — یعنی دکانیں، مدرسے، رہائش گاہیں اور عوامی عمارتیں۔ جو راستے ان مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتے تھے وہ بھی ہمسایوں سے میل جول اور رابطے مضبوط بنانے کا وسیلہ ہوتے تھے۔

کاروں نے ہمارے شہروں کو بنیادی طور پر تبدیل کر ڈالا ہے اور اس بہت سی جگہ پر قبضہ کر لیا ہے جو کبھی انسانی تبادلوں کے کام آتی تھی اور شہری رقبے کو پارکنگ کے قطعوں اور ان کو باہم ملانے والی شاہراہوں میں بانٹ لیا ہے۔ اس طرح بہت سے ایسے مقامات جو ہمیں یکجا کرتے تھے اب شور، گھٹن اور آلودگی سے بھری جگہوں میں بدل گئے ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر کے شہری زندگی کے معیار کو تباہ کرتی ہیں۔ ہمارے محلوں سے گزرنے والا ٹریفک جتنا زیادہ گنجان اور تیز رفتار ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی ہمارا سکون ختم ہوتا جاتا ہے اور اپنے ہمسایوں سے ہمارے میل ملاپ اور دوستی میں کمی آتی جاتی ہے۔

کار صرف ہمارے لیے نہ صرف توانائی کو ضائع کرنے والا ذریعۂ سفر ہے بلکہ اس سے رقبہ بھی

بہت ضائع ہوتا ہے۔ اگر ہم اس تمام رقبے کو جمع کریں جو ایک کار کو گھر، دفتر، شاپنگ سنٹر، گرجا گھر، تفریحی مقامات اور اسکولوں میں پارکنگ کے لیے درکار ہوتا ہے اور اس میں سڑکوں کا وہ رقبہ بھی شامل کریں جو ایک کار کو چلنے کے لیے درکار ہوتا ہے تو ایک عام خاندان کے استعمال میں آنے والی کار اس سے تین گنا زیادہ رقبہ استعمال کرتی ہے جو وہ خاندان اپنے رہنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

لوگوں کے شہروں سے بھاگ کر مضافات کا رخ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے شہروں کو کاروں کے حوالے کر دیا اور اب اس کے ماحولیاتی اور سماجی نتائج ہمارے لیے ناقابل برداشت ہو گئے ہیں۔ جب پیداواری زرعی زمین کو پختہ کر کے اس پر سڑکیں بنا دی گئیں تو ہم قطرت سے اور ایک دوسرے سے کٹ گئے اور ہمارے درمیان بڑے بڑے فاصلے حائل ہو گئے، کاروں پر ہمارا انحصار بڑھ گیا اور توانائی کے فی کس خرچ میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ـــ وہ توانائی جو نہ صرف کاروں کو چلانے کے لیے بلکہ مضافات میں واقع الگ الگ خاندانوں کے گھروں کو گرم یا ٹھنڈا رکھنے میں استعمال ہوتی ہے۔ شہری ماحولیات کے ماہرین ولیم ریس (William Rees) اور مارک روزلینڈ (Mark Roseland) کے پاس یہ نتیجہ نکالنے کی ٹھوس بنیاد موجود ہے کہ ''شہروں کے باہر پھیلے ہوئے رہائشی مضافات انسانوں کا ایجاد کردہ اقتصادی، ماحولیاتی اور سماجی اعتبار سے سب سے مہنگا طرز رہائش ہے۔''

گاڑیاں بنانے والی کمپنیاں اپنی مصنوعات آزادی کے ٹکٹ کے طور پر فروخت کرتی ہیں جسے بہت سی کاروں کے اشتہاروں میں شہروں سے بھاگ کر غیر آلودہ دیہی علاقوں کی طرف جاتی ہوئی کاروں کی صورت میں دکھایا جاتا ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے، کیونکہ کار بذات خود وہ سب سے بڑا عنصر ہے جس نے ہمارے شہروں کو رہائش کے لیے ناموزوں بنا دیا ہے اور اردگرد واقع دیہی علاقوں کو شہری مضافات اور اسٹرپ مالز میں تبدیل کر دیا ہے، اور اس ماحولیاتی بگاڑ کے نتائج سے بچنے کے لیے ہمیں اور زیادہ کاروں کا محتاج کر ڈالا ہے۔

۱۹۵۰ء میں ایک اوسط امریکی شہری نے سال بھر میں ۳۸۰۰ کلو میٹر گاڑی چلائی۔ ۱۹۹۰ء میں یہ فاصلہ بڑھ کر ۹۷۰۰ کلو میٹر ہو چکا تھا۔ کیا یہ زیادہ آزادی ہے؟ امریکی جتنی گاڑی چلاتے ہیں اس کا تقریباً نصف فاصلہ کام کی جگہوں تک جانے اور وہاں سے گھر لوٹنے کے لیے سخت بھیڑ بھاڑ والی سڑکوں پر صرف ہوتا ہے۔ کسی اوسط امریکی گھرانے کے افراد کو کام پر جانے اور واپس آنے میں جتنے میل کا سفر

Scanned with CamScanner

طے کرنا ہوتا ہے ۱۹۶۹ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیانی عرصے میں اس فاصلے میں ۱۶ فیصد اضافہ ہوا۔ کاروں کا دوسرا سب سے بڑا استعمال شاپنگ میں ہوتا ہے۔ شاپنگ کے لیے سفر کا فاصلہ ۸۸ فیصد بڑھ گیا۔ کاروں کا تیسرا بڑا استعمال تجارتی سفر، بچوں کو اسکول لانے لے جانے، ڈاکٹروں سے مشورے کے لیے جانے اور گرجا گھر جانے جیسے معاملات میں ہوتا ہے، اور اس استعمال میں ۱۳۵ فیصد اضافہ ہوا۔ سماجی اور تفریحی سفر میں دراصل ایک فیصد کی کمی واقع ہوئی، جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ہمارے پاس اس سرگرمی کے لیے بہت کم وقت باقی بچتا ہے۔ تخمینے کے مطابق امریکہ کے وسیع ترین شہری رقبوں میں ہر سال ایک بلین سے دو بلین گھنٹے ٹریفک کی گنجانی کے باعث ضائع ہوتے ہیں۔ بینکاک میں کسی اوسط کارکن کے سال میں کام کے ۴۸ دن ٹریفک میں بیٹھے بیٹھے ضائع ہوتے ہیں۔

یہ جاننا مشکل نہیں ہے کہ ہماری زندگیوں کے معیار کو پہنچنے والے اس نقصان میں کس کا فائدہ ہوتا ہے۔ فروخت کے اعتبار سے امریکہ کی تین سب سے بڑی کمپنیاں جنرل موٹر کارپوریشن (کار)، ایکسون کارپوریشن (تیل) اور فورڈ موٹر کارپوریشن (تیل) ہیں۔ موبل کارپوریشن (تیل) اس فہرست میں ساتویں نمبر پر ہے۔

۱۹۹۲ء میں ہالینڈ کے شہر گروننگن کے لوگوں نے، جس کی آبادی ۱۷۰,۰۰۰ ہے، شہر کے مرکزی علاقے کی شاہراہیں کھود ڈالیں اور کئی مختلف قسم کے ایسے اقدامات کیے جن سے سائیکل شہر میں آمدورفت کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت بڑھی، جائیدادوں کے کرائے بڑھے اور لوگوں کے شہر سے باہر منتقل ہونے کا رجحان بدل گیا۔ مقامی تجارتی ادارے جو پہلے کاروں پر کسی قسم کی پابندی لگانے کی مخالفت کرتے تھے، اب کاروں پر مزید پابندیاں لگائے جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

یہ ایسا اقدام ہے جو دوسرے شہروں کو بھی کرنا چاہیے۔ شہری رقبے کو اس طرح استعمال کرنا جس سے ہمارے کاروں پر انحصار میں کمی ہو، یہ وہ سب سے موثر اقدام ہے جو ہماری زندگی کے معیار اور ہمارے ماحول کی صحت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ دوسرے اقدامات جو اس سلسلے میں مددگار ہو سکتے ہیں ان میں شہری رقبے کے استعمال کی اس طرح منصوبہ بندی کرنا کہ آبادی کی گنجانی میں اضافہ ہو اور رہائش، روزگار اور تفریح کی جگہیں ایک دوسرے سے کم فاصلے پر واقع ہوں، پارکنگ کی سہولتوں پر روک لگانا، پٹرول پر ٹیکس میں اضافہ کرنا، اور عوامی ٹرانسپورٹ اور پیدل چلنے والوں اور سائیکل چلانے والوں کے

Scanned with CamScanner

لیے سہولتوں میں اضافہ کرنا شامل ہے۔

''ٹھہرو!'' کارپوریٹ آزادی پسند ٹوکے گا۔''ان اقدامات کا معیشت پر کیا اثر پڑے گا؟ امریکہ میں ہر چھ میں سے ایک شخص کا روزگار کاریں بنانے کی صنعت سے وابستہ ہے۔ آسٹریلیا میں یہ شرح ہر دس میں سے ایک ہے۔ اگر شہری رقبے کی منصوبہ بندی اس طرح کی گئی کہ کاروں کے استعمال میں کمی واقع ہوتو بے روزگاری بے تحاشا بڑھ جائے گی اور اسٹاک کی قیمتیں گر جائیں گی۔ یہ معاشی طور پر تباہ کن ہوگا۔''

یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ جس کا سب سے بہتر جواب ایک اور سوال اٹھا کر دیا جاسکتا ہے۔ کیا کسی معیشت کو اس طریقے سے منظم کرنا عقلمندی کی بات ہے کہ جس میں سرمایہ کاروں کو نقصان دہ سرمایہ کاری سے منافع حاصل ہو اور لوگوں کے لیے روزگار کے مواقع صرف اسی سرگرمی میں حاصل ہوں جو ہماری زندگی کے معیار کو زوال کا شکار بنا رہی ہے؟ انسان ایک عقلمند مخلوق ہے اور یقیناً لوگوں کو روزگار کے بہتر مواقع فراہم کرسکتا ہے۔ ہم اس موضوع پر ابھی کچھ دیر میں واپس لوٹتے ہیں۔

ہمارا خوراک اور زراعت کا نظام بھی اس طرح وضع کیا گیا ہے کہ اس سے بڑی بڑی کیمیکل اور زرعی تجارت کی کمپنیوں کو منافع حاصل ہو جنھیں لوگوں کی صحت اور ماحولیاتی نظام کی بقا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مشینوں اور کیمیکلز کے استعمال سے کی جانے والی زرعی پیداوار، دور دراز جغرافیائی فاصلوں تک شپنگ، ٹھیکے کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے کسان، دوسری جگہوں سے آئے ہوئے کھیت مزدور جو نہایت قلیل اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اور حکومت کی طرف سے بڑی کارپوریشنوں کو دی جانے والی زبردست رعایتیں اس نظام کی بڑی خصوصیات ہیں۔ یہ نظام یکساں غذائی فصلیں بے حد بڑی مقدار میں اور منافع بخش طور پر پیدا کرنے کے لیے نہایت موزوں ہے۔ لیکن اس کی قیمت زمین کی زرخیزی کے خاتمے اور پانی کے ذخیروں سے خشک ہونے، کیمیکلز کے باعث پانی کی آلودگی اور چھوٹے کسان خاندانوں کی زراعت سے بے دخلی کی صورت میں چکانی پڑتی ہے۔ یہ چھوٹے کسان خاندان ہی دراصل مضبوط دیہی کمیونٹی کی ریڑھ کی ہڈی ہوا کرتے تھے۔ یہ نظام صارف کو جو چیزیں مہیا کرتا ہے وہ تیار شدہ، اور غیر ضروری مہنگی پیکنگ والی غذائی اشیا ہیں جن کی غذائیت مشکوک ہے اور جن

Scanned with CamScanner

میں ضرر رساں کیمیائی اجزا باقی رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ اس نظام کے باعث سپر مارکیٹیں اشیا کی کثرت سے بھری رہتی ہیں، یہ نظام تیار شدہ غذائی اشیا کی غذائیت کے بارے میں گمراہ کن دعوے کرتا ہے، صارفین کو اس بات سے آگاہ کرنے کی مزاحمت کرتا ہے کہ ان اشیا میں کون سی اضافی چیزیں ڈالی گئی ہیں اور مصنوعی ہارمون شامل کیے گئے ہیں، اور کون سے ضرر رساں مادے ان میں باقی چھوڑ دیے گئے ہیں، اور صارفین کو مقامی کسانوں کی ناماحولیاتی طور پر اگائی ہوئی غیر تیار شدہ غذائیں حاصل کرنے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ غذا کے سلسلے میں ہمارا انتخاب اس امر تک محدود ہو گیا ہے کہ بڑی کارپوریشنیں ہمیں کون سی اشیا مہیا کرنا اپنے لیے زیادہ منافع بخش سمجھتی ہیں۔

خواہ ہم ایسے عاقل بالغ افراد ہوں جو اپنے انتخاب میں صحت مندانہ اور ذمے دارانہ احتیاط ملحوظ رکھنا چاہتے ہوں، ہمارے لیے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ ہم جو مچھلی خریدنے والے ہیں وہ کسی بہت بڑے غیر ملکی ٹرالر نے سمندری حیات کو تلف کر ڈالنے والے باریک اور بہت بڑے جال کی مدد سے پکڑی تھی یا مقامی مچھیروں نے ماحولیاتی طور پر ذمے دارانہ روایتی طریقوں سے۔ ہم نہیں جان سکتے کہ ہم جس جانور کا گوشت خرید رہے ہیں اسے فطری بندوبست والی چراگاہ میں پالا گیا تھا یا ایسی ناپائیدار زمین پر جہاں سے جنگلوں کا حال ہی میں صفایا کیا جا چکا تھا اور اسے وہ غلہ کھلا کر موٹا کیا گیا تھا جو دوسری صورت میں انسانوں کا پیٹ بھرنے کے کام آ سکتا تھا۔ ہم کسی طرح یہ نہیں بتا سکتے کہ ہمیں دودھ مہیا کرنے والی گایوں کو مصنوعی ہارمونز کے انجکشن لگائے گئے تھے کیونکہ مون سانٹو کارپوریشن کے دباؤ کے تحت حکومت نے ایسے لیبل لگانے پر پابندی عائد کر دی ہے جن سے ہمیں یہ اطلاعات حاصل ہو سکتی تھیں۔

اگر ہمارا مقصد لوگوں کو عمدہ طرز زندگی مہیا کرنا ہے تو ہمیں اپنے خوراک اور زراعت کے نظام میں بھی ویسی ہی بنیادی تبدیلیاں پیدا کرنی ہوں گی جیسی ہمارے رہائشی مقامات اور ٹرانسپورٹ کے نظام میں درکار ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ زمینی اور آبی وسائل کو مناسب طور پر استعمال کیا جائے جس سے بڑھتی ہوئی آبادی کی مناسب غذا اور ریشے اور روزگار کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور یہ ضروری ہے کہ ہم یہ عمل ماحولیاتی طور پر پائیدار طریقوں سے انجام دیں۔

خوراک اور زراعت کے ایک مناسب نظام میں کسانوں کے خاندانوں کے ہاتھوں محنت سے چلائے جانے والے چھوٹے کھیتوں کی بڑی تعداد شامل ہو گی جو غلہ، ریشے، مویشیوں اور توانائی کی

Scanned with CamScanner

مصنوعات کی مختلف قسمیں پیدا کریں جن کی کھپت مقامی منڈیوں میں ہو۔ زراعت حیاتیاتی تحرک کے ایسے طریقوں سے کی جائے جو زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھیں، پانی کی حفاظت کریں اور کیڑوں کو کنٹرول کریں۔ خوراک کے نظام کو اس طرح وضع کیا جائے جس سے آلودگی پیدا کرنے والے عناصر کو — جن میں انسانی فضلہ اور کوڑا کرکٹ بھی شامل ہے — محدود کر کے انھیں دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جا سکے اور جو سورج سے پیدا ہونے والی اور تیاری، پیداوار، ذخیرے کرنے اور نقل و حمل کے لیے خود کو نئے سرے سے تازہ کرنے والی توانائی کے ذریعوں — مثلاً جانوروں کی قوت اور بایوگیس — پر انحصار کرے۔ اس نظام کے قیام کے لیے کیے جانے والے اقدامات میں وہ زرعی اصلاحات جن سے بڑی بڑی زمینداریوں کو توڑا جائے، چھوٹے کسانوں کو قرضوں کی سہولتیں، کسانوں پر مرکوز تحقیق اور توسیع جن سے حیاتیاتی تحرک کے طریقوں کو فروغ ملے، غذائی مصنوعات پر اطلاعات کے لیبل لگانا، زرعی کیمیکلز کو دی جانے والی مالی اور ماحولیاتی رعایتوں کا خاتمہ، ٹرانسپورٹ سے متعلق توانائی اور دیگر شعبوں میں رعایتوں کا خاتمہ جس سے غذائی اشیا کی حمل و نقل کی لاگت بڑھے، اور زمینی اور آبی وسائل کی دیکھ بھال اور انتظام کے لیے مقامی حاکمہ کا قیام شامل ہیں۔

اگرچہ خوراک اور زراعت کے زیادہ مقامی نظام اور زیادہ صحت بخش اور کم چربی والی خوراک کی طرف پیش رفت کے لیے ہمیں اپنی غذائی عادات میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی، لیکن اس سے مراد کوئی بڑی قربانی یا محرومی نہیں ہے۔ اس کے برعکس یہ زرخیز زمین اور محفوظ اور متحرک انسانی کمیونٹی کا تصور ہے جس کے ارکان جسمانی اور ذہنی طور پر صحت مند ہوں جنھیں مکمل اور غیر آلودہ خوراک میسر ہو۔ اس تصور کے اجزا تکنیکی اور سماجی طور پر قابل عمل اور معقول ہیں۔ اس کے لیے صرف متعلقہ نظاموں میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے جو کارپوریشنوں کے بجائے انسانوں کے مفاد میں ہوں۔

حقیقی پائیداری حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنی ''کوڑے کرکٹ کی پیداوار کے اشاریے'' میں کمی کر کے اسے صفر تک لانا ہوگا — اس کوڑے کرکٹ سے مراد وہ چیزیں ہیں جنھیں ہم مستقل طور پر ماحول میں پھینک دیتے ہیں اور جو دوبارہ استعمال کے قابل نہیں بن سکتیں۔ پیداواری طریقوں کو بند نظام کے طور پر منظم کرنا ہوگا، جس سے مراد یہ ہے کہ اس نظام سے پیدا ہونے والا کوڑا کرکٹ دوبارہ

استعمال کے قابل بنا کر اسی نظام میں لگا دیا جائے۔ معدنیات اور دوسرے حیاتیاتی طور پر تبدیل نہ کیے جا سکنے والے مادے ایک بار زمین سے نکال لیے جانے کے بعد انسانی زندگی کے سرمائے کا مستقل حصہ بن جائیں اور انھیں مسلسل دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جاتا رہے۔ نامیاتی مادوں کو ماحولیاتی نظام میں دوبارہ داخل کیا جائے لیکن صرف ایسے طریقوں سے جن سے یہ فطری پیداواری نظام میں دوبارہ جذب ہو سکیں۔

صارفین سے کہا جاتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر ناکارہ اشیا کو دوبارہ استعمال کے قابل بنائیں ــــ یہ ایک اہم لیکن ناکافی قدم ہے۔ بہت سے انتہائی اہم فیصلے ایسے ہیں جن پر ہمارا کوئی اختیار نہیں اور ہماری زندگیوں میں داخل بہت سا کوڑا کرکٹ ایسا ہے جو کسی تیار شدہ شے کے ہمارے ہاتھوں تک پہنچنے سے پہلے ہی تیار اور ناکارہ کر دیا گیا ہوتا ہے۔ مارکیٹ شاذونادر ہی ہمیں ایسا انتخاب کرنے کا موقع دیتی ہے جس میں کوئی روزانہ اخبار ری سائیکلڈ کاغذ پر غیر زہریلی اور حیاتیاتی طور پر تبدیل ہو سکنے والی روشنائی سے چھاپا گیا ہو۔ ہمیں یہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ اخباروں کے جو بنڈل ہم بڑی ذمے داری کے ساتھ باندھ کر فٹ پاتھ پر رکھ دیتے ہیں انھیں سچ مچ ری سائیکل کیا جاتا ہے۔ یہ تمام فیصلے ناشروں، کاغذ بنانے والوں، سیاست دانوں اور سرکاری اہلکاروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔

اخبار ہی کو لیجیے۔ بیس برس کے عرصے میں، ری سائیکلنگ کی موجودہ شرح کو برقرار رکھتے ہوئے، ایک عام امریکی گھرانہ نیوز پرنٹ کی صورت میں تقریباً سو درخت ''صرف'' کر لیتا ہے۔ اس نیوز پرنٹ کا ۶۰ سے ۶۵ فیصد تک حصہ اشتہاروں کے لیے وقف ہوتا ہے۔ خواہ ہم ان اشتہاروں سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے ہوں اور انھیں پڑھتے تک نہ ہوں، ہمیں ایسا کوئی موقع فراہم نہیں کیا جاتا کہ ہم اشتہاروں سے خالی اخبار اپنے نام جاری کروا سکیں۔

ورلڈ واچ انسٹیٹیوٹ کے مطابق ''آج کل استعمال کیے جانے والے بیشتر مادے ایک بار استعمال کے بعد ناکارہ ہو جاتے ہیں ــــ تقریباً دو تہائی المونیم، تین چوتھائی اسٹیل اور کاغذ اور اس سے بھی زیادہ مقدار میں پلاسٹک۔ ان مادوں کو نکالنے کے لیے طبعی ماحول میں خلل ڈالا جاتا ہے، کوڑے کرکٹ کی انتہائی کثیر مقدار پیدا کی جاتی ہے، ناکارہ ہو جانے والی اشیا کی جگہ نئی اشیا خریدنے کے لیے ہم پہلے سے زیادہ گھنٹے کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور ہم نئی چیزیں اسٹور سے گھر اور ناکارہ چیزیں گھر

سے کچرا گھر تک لانے لے جانے کے چکر میں بار برداری کے جانور بن کر رہ جاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ معیشت کے لیے اور کارپوریشنوں کی منافع اندوزی کے لیے اچھی بات ہو، لیکن یہ ہماری زندگیوں کے معیار کو یقیناً نقصان پہنچاتی ہے۔

ری سائیکلنگ سے نہ صرف زمین سے وسائل نکالنے کی ماحولیاتی لاگت کم ہوتی ہے بلکہ توانائی کی بھی بچت ہوتی ہے۔ اسکریپ سے اسٹیل بنانے میں کچ دھات سے اسٹیل بنانے کی بہ نسبت ایک تہائی توانائی لگتی ہے، فضائی آلودگی ۸۵ فیصد کم ہوتی ہے، آبی آلودگی ۷۶ فیصد کم ہوتی ہے، اور معدنیات کا ضیاع بالکل نہیں ہوتا۔ ری سائیکلڈ کاغذ سے نیوز پرنٹ بنانے میں درختوں کی لکڑی کی تازہ لگدی سے کاغذ بنانے کی بہ نسبت ۲۵ سے ۶۰ فیصد تک کم توانائی خرچ ہوتی ہے، جبکہ فضائی آلودگی ۷۴ فیصد کم اور آبی آلودگی ۳۵ فیصد کم ہوتی ہے۔ دوبارہ استعمال سے حاصل ہونے والے فوائد اس سے بھی ڈرامائی طور پر زیادہ ہیں۔ کسی بوتل میں استعمال ہونے والے شیشے کو ری سائیکل کرنے سے توانائی کا خرچ ایک تہائی رہ جاتا ہے، جبکہ خود اس بوتل کو صاف کر کے دوبارہ استعمال کر لینے سے نئی بوتل بنانے کے توانائی کے خرچ کا ۹۰ فیصد حصہ بچ جاتا ہے۔

جرمنی نے مصنوعات کی زندگی کے دائرے کے اعتبار سے ذمے دارانہ منصوبہ بندی کرنے میں باقی ملکوں پر سبقت حاصل کی ہے۔ حکومت کی تائید سے چلنے والے پروگرام تیار کنندگان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ وہ کاروں اور گھریلو استعمال کے آلات کے پرزوں کو دوبارہ کھولنے، دوبارہ استعمال کرنے اور ری سائیکل کرنے کی ذمے داری اٹھائیں۔ یہ طریقہ نہ صرف ماحولیاتی طور پر عمدہ ہے بلکہ صارفین کو ان اشیا کے استعمال کا عرصہ ختم ہونے پر انھیں ٹھکانے لگانے کے بوجھ سے بھی نجات دلا دیتا ہے۔ زندگی کے دائرے کی بنیاد پر مصنوعات کی منصوبہ بندی کا ایک طریقہ لیز کا بھی ہے، جس کے تحت اس شے کی ملکیت بنانے والے ہی کے پاس رہتی ہے جو اس کی دیکھ بھال اور کارآمد عرصے کے بعد اسے ٹھکانے لگانے کا بھی ذمے دار ہوتا ہے اور چنانچہ ایسی مصنوعات تیار کرتا ہے جو زیادہ عرصہ چلتی ہیں اور آسانی سے ری سائیکل کی جاسکتی ہیں۔

حکومتیں تیار کنندگان کو اشیا ڈیزائن کرنے اور ان کی پیکنگ کرنے میں ایسے طریقے اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے، جن سے ان اشیا کے ناکارہ ہونے کو کنٹرول کیا جائے، ان پر ایسی فیس

Scanned with CamScanner

عائد کرسکتی ہیں جس سے ان اشیا کو حتمی طور پر ٹھکانے لگانے کے اخراجات پورے کیے جاسکیں۔ حکومتیں یہ پابندی بھی لگاسکتی ہیں کہ مختلف حجم اور شکلوں والے کنٹینروں کی جگہ اسٹینڈرڈ حجم کی پائیدار شیشے کی بوتلیں استعمال کی جائیں جنھیں دھوکر اور نیا لیبل لگا کر کئی مرتبہ دوبارہ استعمال کیا جاسکے۔

انفرادی انتخاب سے بہت فرق پڑسکتا ہے۔ ہم اپنی خوراک میں گوشت کی مقدار گھٹا سکتے ہیں۔ ہم گھر میں فلٹر لگا کر بوتل میں بند پانی اور سافٹ ڈرنکس پر انحصار کم کرسکتے ہیں۔ ہم کپڑوں کی خریداری کم کر سکتے ہیں اور ایسی کار استعمال کرسکتے ہیں جو ایندھن کو زیادہ موثر طور پر کام میں لائے۔ ایسے بے شمار مثبت فیصلے لوگ خود کرسکتے ہیں۔ تاہم ہمیں زیادہ توجہ اس پر دینی چاہیے کہ اپنے معاشروں کی تنظیم اس طرح کریں کہ پائیداری برقرار رہے اور افراد کے لیے ذمے دارانہ فیصلے کرنا آسان اور سستا ہو جائے۔

معاشی افزائش کی طلب بڑی حد تک اس منصوبہ بندی سے رائج کیے ہوئے واہمے سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگوں کو ملازمت پر برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم مجموعی اصراف میں اضافہ کریں تاکہ ملازمتیں پیدا کرنے کی شرح کو اس رفتار سے زیادہ رکھا جاسکے جس رفتار سے کارپوریشنیں خودکار پیداواری طریقے اختیار کرکے انھیں ملازمت سے محروم کررہی ہیں۔ ہم اس کے ایک اہم متبادل طریقے کو نظرانداز کردیتے ہیں — یعنی یہ کہ مسئلے کی تعریف نئے انداز سے کی جائے اور ملازمتوں کے بجائے روزگار کے مواقع پیدا کرنے پر توجہ مرکوز کی جائے۔

''ملازمت'' کی تعریف ویبسٹر نیو ورلڈ ڈکشنری کی رو سے یہ ہے: ''کوئی مخصوص کام، جو آدمی کا پیشہ ہو یا تنخواہ حاصل کرنے کی غرض سے کیا جائے؛ کوئی چیز جسے کرنے پر آدمی مجبور ہو؛ ذمے داری؛ کام؛ فرض۔'' اس کے برعکس ''روزگار'' وہ عمل ہے جو ''زندہ رہنے یا زندگی کو برقرار رکھنے کا ذریعہ ہو''۔ ملازمت رقم حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ روزگار زندہ رہنے کا ذریعہ ہے۔ ملازمت کی بات کرنے سے ایسے افراد کا تصور پیدا ہوتا ہے جو فیکٹریوں اور دنیا کی بڑی بڑی کارپوریشنوں کی فاسٹ فوڈ کی دکانوں میں کام کررہے ہوں۔ پائیدار روزگار سے لوگوں اور کمیونٹیوں کا تصور پیدا ہوتا ہے جو انفرادی اور اجتماعی ضروریات کو ماحولیاتی طور پر ذمے دارانہ طریقوں سے پورا کررہی ہوں — یہ تصور مقامی بندوبست

والی معیشتوں اور کمیونٹیوں پر مشتمل ہے۔

ہم ٹیکنالوجی کی ترقی کو اس مقصد کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ ہر شخص کو عمدہ اور پائیدار زندگی گزارنے کا موقع حاصل ہو۔ اگر ہم یہ فیصلہ کریں، بجائے اس کے کہ جو لوگ خوش قسمتی سے ملازمت پر ہیں ان سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنی خاندان اور کمیونٹی کی زندگی کو مسابقت کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا دیں جبکہ باقی لوگ بے روزگاری کا عذاب جھیلتے رہیں، تو ہم اپنی زندگیوں کو ہفتے میں بیس سے تیس گھنٹے تک کام کرنے کی سطح پر لا سکتے ہیں جس میں کام کرنے کے خواہش مند تقریباً ہر بالغ شخص کو مناسب مشاہرے پر روزگار حاصل ہو سکے۔ اس نئی تنظیم سے لوگوں کے پاس جو فارغ وقت بچے گا اسے وہ سماجی معیشت کی ایسی سرگرمیوں میں لگا سکیں گے جن سے وہ ضروریات پوری ہو سکیں گی جو اب پوری نہیں ہو رہی ہیں، اور بری طرح پارہ پارہ سماجی تانے بانے کو نئے سرے سے بُنا جا سکے گا۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ بہت سی موجودہ ملازمتیں نہ صرف غیر اطمینان بخش ہیں بلکہ ایسی اشیا اور خدمات پیدا کرتی ہیں جو یا تو غیر ضروری ہیں یا معاشرے اور ماحول کے لیے نقصان دہ ہیں، تو اس سے بے شمار امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان میں کار سازی، کیمیکل، پیکیجنگ اور پٹرولیم کی صنعتوں سے وابستہ ملازمتیں؛ اشتہار سازی اور مارکیٹنگ کے شعبوں کی بیشتر ملازمتیں، مالیاتی بروکر اور پورٹ فولیو منیجر جو سٹے بازی اور دوسری استحصالی سرمایہ کاری میں مصروف رہتے ہیں، دنیا بھر میں اسلحہ سازی کی صنعت میں کام کرنے والے ۱۴ ملین افراد، اور دنیا بھر کی افواج میں کام کرنے والے ۳۰ ملین افراد شامل ہیں۔

اس سے ایک حیران کن حقیقت سامنے آتی ہے۔ اگر لاکھوں افراد کو بھاری، بعض صورتوں میں انتہائی خطیر معاوضہ ادا کر کے ان سے ایسی سرگرمیاں نہ کرائی جائیں جو ہماری زندگی کے معیار کے لیے مضر ہیں، تو ہم اتنی رقم بچا لیں گے جس سے انھیں گھر بیٹھنے اور کچھ نہ کرنے کا اتنا ہی معاوضہ ادا کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی قابل عمل حل نہیں ہے، لیکن یہ موجودہ طریقے سے کہیں بہتر ہوگا جس میں ہم پورے معاشرے کی تنظیم اس طرح کرتے ہیں کہ ان افراد کو ادائیگی کر کے ایسے کاموں میں مصروف رکھا جائے جو اصل خوشحالی میں کمی کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے بجائے کیوں نہ معاشرے کی نئی تنظیم کر کے ان افراد کو اس بات کا معاوضہ دیا جائے کہ وہ سماجی طور پر کارآمد اور ماحولیاتی اعتبار سے بے ضرر ہوں، مثلاً بچوں اور معمر افراد کی دیکھ بھال کرنا، کمیونٹی بازاروں اور بوڑھے افراد کے مراکز کا انتظام چلانا، نوعمر افراد کو تعلیم

Scanned with CamScanner

دینا، منشیات کی لت کے شکار لوگوں کی دلجوئی کرنا، ذہنی امراض میں مبتلا لوگوں کی دیکھ بھال کرنا، پارکوں اور مشترکہ استعمال کی جگہوں کو درست حالت میں رکھنا، جرائم کی اجتماعی نگرانی کے کام میں شریک ہونا، کمیونٹی کی سماجی اور ثقافتی تقریبات کا اہتمام کرنا، ووٹروں کی رجسٹریشن کرنا، ماحول کی صفائی میں حصہ لینا، جنگلات کو دوبارہ اگانا، عوامی مفاد میں پیروکاری کے کام کرنا، کمیونٹی کے باغوں کی دیکھ بھال کرنا، اور رہائشی مکانوں کی ساخت میں اس طرح تبدیلی کرنا کہ توانائی کی بچت ہو سکے۔ اسی طرح ہم میں سے بہت سے لوگ تفریح، خاموش غور و فکر، خاندانی سرگرمیوں اور ایسے علمی اور تفریحی مشاغل کو زیادہ وقت دے سکتے ہیں جن سے ہم خود کو جسمانی، ذہنی، نفسیاتی اور روحانی طور پر زیادہ صحت مند رکھ سکیں۔

ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ملازمتوں کی کمی ہے، بلکہ ہمارا مسئلہ وہ اقتصادی نظام ہے جو معاوضے کی خاطر کیے جانے والی کام پر انحصار کو بڑھاتا اور لوگوں کو نقصان دہ کاموں کے لیے معاوضہ دیتا ہے جبکہ ایسی بے شمار سرگرمیوں کو نظر انداز کرتا ہے جو کسی صحت مند معاشرے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ ابھی دس بیس سال پہلے تک بیشتر لوگ سماجی معیشت میں بلا معاوضہ کام کر کے معاشرے کی کارآمد خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے آج کے معاشرے کی بہ نسبت ان معاشروں کا سماجی تانا بانا زیادہ مضبوط تھا اور وہ اپنے ارکان کو ذاتی تحفظ اور تسکین کا زیادہ گہرا احساس مہیا کرتے تھے۔

اگرچہ پائیدار روزگار پر مشتمل معیشت قائم کرنے کی جانب پیش قدمی مختلف سماجی حالات کے تقاضوں اور امنگوں کے تحت مختلف انداز کی ہو سکتی ہے، لیکن اوپر دی گئی مثالوں اور بیان کیے گئے اصولوں کی مدد سے ہم اس پیش قدمی کے کچھ خدوخال جان سکتے ہیں۔ مثلاً شہری علاقوں میں یہ اقدامات مقامی شہری دیہات اور شہری محلوں کے اردگرد قائم ہوں گے جہاں رہائش، روزگار، تفریح اور کاروباری سرگرمیاں ایک ساتھ واقع ہوں گی اور مقامی ضروریات کو بڑی حد تک خود انحصاری کے اصول پر پورا کر رہی ہوں گی۔ ان اقدامات میں سرسبز قطعوں اور انسانوں کے درمیان ربط ضبط میں اضافے کا عنصر شامل ہوگا اور توانائی، حیاتیاتی مادے اور دیگر مادوں کی پیداوار کے سلسلے میں خود انحصاری پر زور دیا جائے گا۔

انسانی اور ماحولیاتی پیداواری سرگرمیوں کو مقامی طور پر بند نظاموں کی شکل دی جائے گی جس کے

Scanned with CamScanner

تحت استعمال شدہ گندے پانی، کوڑے کرکٹ اور یہاں تک کہ ہوا کو بھی مچھلیوں کے تالابوں، باغوں اور سرسبز قطعوں کے ذریعے دوبارہ استعمال کے قابل بنایا جائے گا تاکہ یہ وسائل مسلسل خود کو تازہ کرتے رہیں۔ شہری زراعت اور آبی پیداوار، چیزوں کی مرمت اور دوبارہ استعمال، اور منظم ری سائیکلنگ کی سرگرمیاں لوگوں کے لیے روزگار کے ایسے کثیر مواقع پیدا کریں گی جن سے ماحولیاتی پائیداری میں اضافہ ہوگا۔ ان سرگرمیوں کو محلوں کی سطح پر منظم کرنے سے خاندانی اور اجتماعی رشتے مضبوط ہوں گے، انتظامیہ کی مرکزیت کم ہوگی، اور عورتوں اور مردوں کے درمیان خاندانی ذمے داریوں کی تقسیم بہتر ہو جائے گی۔ لوگوں اور چیزوں کی نقل و حمل کی ضروریات کم ہوں گی۔ مقامی طور پر پیدا کی گئی غذائی اشیا تازہ اور غیر پیک شدہ ہوں گی یا انھیں ایسے کنٹینروں میں محفوظ رکھا جائے گا جو بار بار استعمال کیے جاسکیں۔

ہم بہت سی ایسی روایتی اور الیکٹرونک دور سے تعلق رکھنے والی صنعتیں پاسکتے ہیں، جن میں ری سائیکلنگ سے وابستہ صنعتیں بھی شامل ہیں، جو شہری زراعت کے پہلو بہ پہلو کام کرسکتی ہیں۔ خاندانی تعاون کی سرگرمیاں، مثلاً کمیونٹی کی بنیاد پر ڈے کیئر کی سہولت، خاندانی مشوروں کی سہولت، اسکول، خاندانی صحت کے مراکز، اور کثیر مقصد کمیونٹی سنٹر، محلے کی سطح پر مربوط کاموں کی شکل اختیار کرسکتی ہیں اور ان میں لوگ، اپنے گھروں سے پیدل کے فاصلے پر، کارآمد اور بامعنی انداز میں شریک ہو سکتے ہیں۔ بہت سے مقامات اپنی کرنسی جاری کر سکتے ہیں جو مقامی لین دین میں مدد دے اور کمیونٹی سے باہر دولت کے اخراج کی حوصلہ شکنی کرے۔ بیشتر بالغ افراد اپنے وقت کو اس طرح تقسیم کریں کہ مالی معیشت اور سماجی معیشت کے لیے کی جانے والی سرگرمیاں متوازن رہیں۔ اس کے نتیجے میں ہمیں محسوس ہوگا کہ گھر کا وہ کثیر مقصد تصور واپس آ گیا ہے جو خاندان اور کمیونٹی کی زندگی کا مرکز ہے اور جس سے ٹرانسپورٹ کی ضروریات بڑی حد تک کم ہو جاتی ہیں۔ ہم اپنی گلیوں کو اشتہاری بورڈوں کے بجائے درختوں سے آراستہ کرسکتے ہیں۔ ہم اشتہار سازی کو تیار کردہ شے کے بارے میں ضروری معلومات تک محدود کرسکتے ہیں، جو طلب کرنے پر دستیاب ہو، اور صرف اس وقت جب ہم چاہیں۔

حقیقی سماجی موثریت کے راستے پر چل کر ہمارے پاس بہت سا وقت ہوگا جسے ہم زندگی کے دوسرے پہلوؤں، مثلاً تفریح، ثقافتی اظہار، دانشورانہ اور روحانی ترقی اور سیاسی عمل میں شرکت، کے لیے استعمال کرسکیں گے۔ ہم ثقافتی تبادلے کی غرض سے دوسرے مقامات کا سفر کر سکتے ہیں۔ ہم

وڈیوفون کی مدد سے دنیا بھر میں مختلف لوگوں کے ساتھ دوست اور ساتھی کے طور پر تعلقات استوار کر سکتے ہیں۔ یا ہم کمپیوٹر کانفرنسنگ کے ذریعے آپس میں نت نئی اقسام کی کھانے کی ترکیبوں اور اس قسم کے خیالات کا تبادلہ کر سکتے ہیں کہ مقامی طور پر غذائی اشیا کے کوآپریٹو کیسے قائم کیے جائیں یا عوامی ٹرانسپورٹ کی سہولتوں کو بہتر بنانے کے لیے مہم چلانے کے سلسلے میں اپنے تجربات میں دوسروں کو شریک کر سکتے ہیں۔ ہم دنیا بھر میں نئے تجارتی قوانین سے شہریوں کے لیے پیدا ہونے والے مسائل پر پیروکاری کے بین الاقوامی نیٹ ورک قائم کر سکتے ہیں۔ یا ہم ریڈیو پر روس، ہندوستان، چلی وغیرہ کی نشریات سن سکتے ہیں تاکہ یہ جان سکیں کہ وہاں کے لوگ جنوبی افریقہ میں ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں کیا تاثرات رکھتے ہیں۔

ہمارے پاس صحت مند معاشرے تخلیق کرنے کا انتخاب یقینی طور پر موجود ہے جن میں ہم مکمل انداز میں زندگی بسر کر سکیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی قوت کو بحال کریں اور اس مقصد کے لیے عملی کام کا آغاز کریں، جیسا کہ دنیا بھر کے لاکھوں لوگ پہلے ہی کر چکے ہیں۔

۳

> میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم سب شہروں، حیاتیاتی علاقوں، براعظموں اور پورے کرۂ ارض کے اندر یوں ہیں جیسے زندہ جسموں کے اندر زندہ خلیے ہوتے ہیں، تو کیا ہم زیادہ باوقار طور پر کارآمد نہیں بن جائیں گے۔ اگر ہم اپنے کام کو یوں دیکھیں کہ ہم ان زندہ جسموں کو ان کی زندہ تکمیل تک پہنچنے میں مدد دے رہے ہیں، تو کیا ہمارے تناؤ میں کمی اور صحت میں بہتری نہیں ہو جائے گی؟
>
> — میسولا، منی سوٹا، کے میئر، ڈینیل کیمس (Daniel Kemmis)

> میں خود سے ہمیشہ یہ سوال کیا کرتی ہوں: ”وہ کون سے تخلیقی اور عمل انگیز رشتے ہیں جو انسانی کمیونٹیوں کو مضبوط کرتے ہیں اور انھیں اس قابل بناتے ہیں کہ وہ معاشی اور تکنیکی عمل پر اپنا سماجی اور ماحولیاتی کنٹرول قائم کر سکیں؟“
>
> — وندنا شیوا (Vandana Shiva)

Scanned with CamScanner

ہمیں جو بحران درپیش ہے اس کی روحانی اور سیاسی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پالیسی کی بابت جس بحث پر اس قسم کی اقتصادیات کا غلبہ ہو جو روحانی یا سیاسی پہلوؤں کو خاطر ہی میں نہ لاتی ہو، وہ کسی کارآمد نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ صرف اس بحث میں جو ایک بیدار ہوتی ہوئی سول سوسائٹی نے چھیڑی ہے، ہمیں ایسا تناظر ملتا ہے جس کی بنیاد زیادہ حقیقت پسندانہ زمین پر قائم ہے۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے ہم اپنی گہری ثقافتی خوابیدگی سے بیدار ہوتے ہوئے اپنے معاشروں کی نظرانداز کردہ سیاسی سمت اور اپنے وجود کی نظرانداز کردہ روحانی سمت کو نئے سرے سے دریافت کر رہے ہوں۔ اگر ہمارا بحران حقیقت کو دیکھنے کے ایک نہایت محدود طریقے کا نتیجہ ہے — جیسا کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہے — تو یہ بیداری، ہمیں اس امر سے زیادہ مکمل طور پر آگاہ کر کے کہ ہم دراصل کون ہیں، ہمیں اپنی تکنیکی اور تنظیمی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی اس لازمی ذمے داری کو قبول کرنے پر آمادہ کر سکتی ہے جسے ہم نے بہت عرصے سے نظرانداز کر رکھا ہے۔

سائنس کائنات کی جو کہانی سناتی ہے اس کے مطابق انسانی شعور محض ایک فریب نظر ہے جو بعض کیمیائی عملوں کا نتیجہ ہے۔ اس کہانی میں کوئی معنی یا مقصد نہیں اور اس سے ہمیں ایسی کوئی وجہ نہیں ملتی کہ ہم اپنے عیش اندوزی کی جبلتوں کو قابو میں رکھیں۔ ٹامس بیری (Thomas Berry) کی کتاب *The Dream of the Earth* کے مطالعے نے میرے اس اعتقاد کو بیدار کیا کہ ایک نوع کے طور پر ہماری بقا کا انحصار جتنا کسی اور شے پر ہے اتنا ہی اس بات پر بھی ہے کہ ہم ایک نئی کہانی دریافت کریں جو ہمیں زندہ رہنے کا جواز مہیا کر سکے — ایک ایسی کہانی جو ہمیں ایک انتہائی بنیادی سوال کرنے پر آمادہ کر سکے: کیوں؟

یہ سوال میرے ذہن پر پچھلے کئی برس سے چھایا ہوا ہے۔ ایک نوع کے طور پر تباہی سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے، اس کا خاکہ ہم میں سے بہت سوں کے ذہن میں بہت عرصے سے واضح چلا آ رہا ہے۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ اگر بقا کے ہمارے لیے کوئی وسیع تر معنی نہ ہوں تو محض نیست و نابود ہونے سے محفوظ رہنا اس بات کی کافی وجہ فراہم نہیں کرتا کہ ہم وہ دشوار تبدیلیاں پیدا کریں جو اس مقصد کے لیے ضروری ہو گئی ہیں۔ زندگی کا انتخاب کرنے کے لیے ہمیں ایک ایسے ناقابل مزاحمت وژن

کی ضرورت ہے جو زندگی کے بامعنی ہونے کے احساس میں مضمر نئے امکانات کا ادراک دے سکے۔

اس ادراک کے لیے میری ذاتی تلاش نے میرے اس فیصلے میں بنیادی کردار ادا کیا کہ میں طے شدہ معمولات سے ناتا توڑ کر یہ کتاب تحریر کروں۔ اس قسم کی تلاش ناگزیر طور پر سائنس کی حقائق پر استوار دنیا سے آگے، اعتقاد اور ذاتی موضوعی واردات کی اقلیم میں لے جاتی ہے۔

میں جس کہانی کی تلاش میں تھا وہ ۱۹۹۳ء تک مجھ سے گریزاں رہی جب ایک دن مجھے اپنی ڈاک میں غیر طلبیدہ طور پر ڈوان ایلگن (Duane Elgin) کی کتاب ''بیدار ہوتی ہوئی زمین'' (Awakening Earth) موصول ہوئی۔ ایلگن اور میں آپس میں کبھی نہیں ملے تھے اور ایک دوسرے کو صرف تحریروں کے توسط سے جانتے تھے۔ ان کی کتاب مجھے ایک آسمانی تحفہ معلوم ہوئی۔ انسانی شعور کی رزمیہ بیداری کی داستان، جو ان پر ایک طویل ذاتی مراقبے کے دوران منکشف ہوئی، میرے داخلی وجود سے بھی کلام کرتی تھی اور اس کائناتی مقصد کے گہرے احساس سے مجھے آشنا کراتی تھی جو موجودہ انسانی کشمکش کی تہہ میں کارفرما ہے اور ان امکانات سے بھی جو آگے میسر آنے والے ہیں۔ اس نے مجھے ہماری کامیابی کے امکان کی ایک نئی امید بھی بخشی۔ اس نے زیرنظر کتاب کے بنیادی خیال پر، خصوصاً آخری ابواب پر، گہرا اثر ڈالا۔ ایلگن کا بنیادی پیغام دو جملوں میں بخوبی سما جاتا ہے:

> جوں جوں انسان تفکر آمیز شعور کی اپنی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے، کائنات کو بھی یہ صلاحیت بخشا جاتا ہے کہ وہ تفکر کے ذریعے سے اپنے وجود کا شعور حاصل کر سکے۔ انسانیت کی بیداری کے ساتھ ساتھ کائنات کو بھی یہ صلاحیت حاصل ہوتی جاتی ہے کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھ سکے اور — حیرت، تعجب اور تحسین کے ساتھ — اپنے وجود پر غور کر سکے۔

اس خیال سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اپنی پیدائش کے ذریعے ہم ایک ایسی ذمے داری ورثے میں پاتے ہیں جو محض ہماری بقا کو یقینی بنانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ حسن کا ادراک کرنے اور محبت کرنے کی ہماری حیران کن صلاحیت ہمارے وجود کا ایک بنیادی پہلو ہے اور اس عظیم کائناتی واقعے میں، جو متواتر وقوع پذیر ہو رہا ہے، ہمارے کردار سے نہایت مرکزی طور پر وابستہ ہے۔ یہ اپنے متبادل خیال کے مقابلے میں — کہ ہمارا شعور کا تجربہ ایک بے حیات کائنات میں محض ایک اتفاقی اور بے معنی واقعے سے زیادہ کچھ نہیں، یا یہ کہ ہمیں زندگی کا معجزہ اس لیے بخشا گیا تھا کہ ہم اس منفرد سیارے پر لاکھوں برس کے ارتقا

Scanned with CamScanner

کے ثمرات کو ضائع کر سکیں — کہیں زیادہ منطقی ہے۔ یہ ایسا خیال ہے جو ہم سے ہمارے اقدامات سے ارتقا کے عمل پر پڑنے والے اثرات کی ذمے داری قبول کرنے اور اس سیارے پر ارتقا کو مہمیز دینے والے حالات پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ خیال یہ بھی بتاتا ہے کہ زندگی کے اس وسیع تر تانے بانے سے ہمارا تعلق مالک اور نوکر کے تعلق کی طرح کا نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا وجود اس کائناتی شعور کا لازمی حصہ ہے اور اس سے جدا نہیں ہو سکتا جو ہمارے انفرادی وجود کے ذریعے خود کو منکشف کر رہا ہے۔ اس سے مجھے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس زندہ کائنات کے بے پناہ حسن کو حیرت اور مسرت کے ساتھ محسوس کر کے، اور اپنی ذات، خاندان، کمیونٹی، کرۂ ارض اور اس کائنات کے تعلق سے اپنی زندگی کو بھرپور انداز میں گزار کر ہم اپنے لیے اور اس پورے کُل کے لیے زیادہ کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ اگرچہ ہم زندگی کی دوسری شکلوں کے مقابلے میں کمتر یا برتر نہیں، لیکن ہمارے پاس اس کُل کے تعلق سے اپنی منفرد صلاحیتیں اور کام ہیں۔ یہ ہم پر منحصر ہے کہ ان صلاحیتوں کو ترقی دیں اور یہ دیکھیں کہ ہم کون سے کام انجام دے سکتے ہیں۔

یہ بات مسلّم ہے کہ اس سیارے پر موجود دوسری مخلوقات کی بہ نسبت ہمیں زیادہ طاقت اور زیادہ آزادی حاصل ہے۔ ہم نے اس طاقت اور آزادی کو غلبہ پانے کے حق سے خلط ملط کر کے خود کو خطرے میں ڈال دیا ہے، بجائے اس کے کہ اس بات کو تسلیم کرتے کہ ہماری طاقت اور آزادی ہمیں پورے کُل کے لیے دوسروں سے زیادہ ذمے دار ٹھہراتی ہے۔ ایلگن کے لفظوں میں:

> ہماری کائنات بے حد شفیق ہے، لیکن ہمیں وہ قیمتی آزادی دینے پر بھی مصر ہے جس کی ہمیں اس لیے ضرورت ہے کہ تفکر کے ذریعے کسی فیصلے تک پہنچنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔۔۔۔ ہمیں وجود کا بے بہا تحفہ دینے کے بعد، یہ کائنات سے ماورا کائنات اپنی بے انتہا شفقت کا اظہار اس طرح کرتی ہے کہ ہمارے انفرادی اور پورے سیارے کی سطح پر کیے ہوئے فیصلوں میں مزاحم نہیں ہوتی۔

میرے نزدیک یہ خیال اس تبدیلی کو ناقابلِ مزاحمت معنی مہیا کرتا ہے، جسے روبہ عمل لانے کا، میرے اعتقاد کے مطابق، ماحولیاتی انقلاب ہم سے مطالبہ کر رہا ہے۔

ہماری نوع، کسی بھی اور مخلوق سے کہیں بڑھ کر، ذہنی، سماجی اور تکنیکی ارتقا کے ایک ایسے متواتر

عمل سے دوچار رہی ہے جو ہم میں ہمیشہ نت نئی صلاحیتوں کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یہ کائنات کے انتہائی حیران کن اور مرموز عجائب میں سے ہے کہ جب ہمارے ارتقا کا ایک مرحلہ دوسرے مرحلے کی تیاری میں پوری طرح صرف ہو جاتا ہے تو یہ ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ ہم مانوس معمولات کی زنجیریں توڑ کر نامعلوم منطقے میں ایک غیر یقینی قدم رکھ سکیں۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یقین رکھتے ہیں کہ آج ہم سے ایسا ہی قدم اٹھانے کی، دہلیز پار کر کے ایک نئے دور میں داخل ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔ ایک خاص قسم کے سائنسی انداز فکر نے، جو شعور کو کم بیش مسترد کر دیتا ہے، ہماری زندگی کی تمام توانائیوں کو طبعی دنیا کے رازوں کی ملکیت پانے اور ایسی تکنیکی صلاحیتیں تعمیر کرنے پر مرکوز کر دیا جنھوں نے اب ایسے صحت مند معاشرے تیار کرنے کے بے پناہ مواقع پیدا کر دیے ہیں جو ہماری سماجی، ذہنی اور روحانی افزائش کو اپنا مقصد بنا سکیں۔ ہم نے اپنی اس صلاحیت کا بہت سے ہولناک طریقوں سے غلط استعمال کیا ہے، اور ابھی یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ ہماری نوع کو وہ پختگی حاصل ہو گئی ہے کہ اپنی اس نئی حاصل شدہ قوت کو دانائی کے ساتھ استعمال کر سکے۔ تاہم، یہی ٹیکنالوجی ہمیں اس قابل بناتی ہے کہ ہم دنیا سے مادی محرومیوں اور نارسائیوں کا خاتمہ کر سکیں؛ تمام انسانوں کو یہ آزادی دے سکیں کہ وہ اپنی زندگی کی توانائیوں کا بیشتر حصہ ایسی سرگرمیوں پر لگا سکیں جو زندہ رہنے کی روزانہ مشقت سے کہیں زیادہ تسکین بخش ہیں؛ اور فطرت کے ساتھ اپنے وجود کا توازن قائم کر سکیں۔

جو دور اب گزر رہا ہے اس میں مغرب کی ناکامیوں اور کامیابیوں کی جڑیں اس عدم توازن میں تلاش کی جا سکتی ہیں جو اپنے وجود اور فطرت کے بارے میں ہمارے تصور میں پایا جاتا ہے۔ مادی وحدانیت ہمارے اس تکنیکی تکمیل تک پہنچنے کے لیے بہت اہم تھی، لیکن اس کے نتیجے میں ہمارے معاشروں کا مادی پہلو بے پناہ بڑھ گیا اور روحانی پہلو بالکل اوجھل ہو گیا۔ مادے اور روح کی دوئی نے ہمارے ذہن اور بدن کو دو حصوں میں بانٹ دیا، دونوں حصے ایک دوسرے سے بے نیاز ہو گئے جس سے دونوں کو نقصان پہنچا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغرب اور مشرق، شمال اور جنوب، سب کے مستقبل کا دارومدار اب اس بات پر ہے کہ ہم اوپر اٹھ کر ارتقا کے ایک وسیع تناظر تک پہنچیں جو ہمارے وجود کے مادی اور روحانی پہلوؤں کو بامعنی انداز میں متحد کر کے مکمل انسان، مکمل کمیونٹیاں اور مکمل معاشرے پیدا کر سکے۔

ہماری روحانی بیداری ہماری سیاسی بیداری کے لیے ناگزیر ہے۔ اپنی روحانی فطرت سے بے نیازی کے باعث ہم نے خود کو اشتہار سازوں اور سیاسی نظریہ بازوں کے ہاتھوں میں دے دیا ہے؛ اشتہار ساز ہمارے روحانی ربط کو دولت کی کبھی نہ مٹنے والی پیاس میں منقلب کر دیتے ہیں اور سیاسی نظریہ باز اس پیاس کو کارپوریشنوں کے مفادات سے جوڑ دیتے ہیں۔ جیسے سائنس کے ثقافتی پیغامات ہمیں روحانی طور پر مردہ کر دینے والے تھے، بالکل اسی طرح کارپوریٹ آزادی پسندی کے سیاسی نظریات ہمیں سیاسی طور پر بے جان کر دیں گے۔

کوپرنیکس کے انقلاب نے سائنس اور مذہب کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور ہمیں اپنے وجود کے مادی پہلو کے امکانات سے آگاہی کے راستے پر گامزن کیا۔ ماحولیاتی انقلاب اب ہمیں دعوت دے رہا ہے کہ ہم روحانی طور پر زندہ اور سیاسی طور پر فعال افراد کی حیثیت سے زندگی کا تجربہ کریں اور ایک زندہ کائنات کے رفتہ رفتہ منکشف ہونے کے عمل میں شریک ہوں۔

جوں جوں پرانے مفروضات مسمار ہوتے جائیں گے، پرانے سیاسی رشتے بھی معدوم ہوتے جائیں گے۔ دائیں اور بائیں بازو، لبرل اور قدامت پسند کے درمیان روایتی امتیاز اب بے معنی ہو چکا ہے۔ ایک سیاسی مرکز سے اپیل کرنا محض ان لوگوں کا ایک سیاسی شعبدہ بن کر رہ گیا ہے جو یہ سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں کہ ہمیں کس قسم اور کس نوعیت کا چیلنج درپیش ہے۔ سیاسی مستقبل ان کی ملکیت ہے جو نئے رشتے بنانے کی ہمت اور بصیرت رکھتے ہیں، ایسے رشتے جن کی بنیاد اس طرز فکر پر ہے جسے پرانی درجہ بندی کی اصطلاح میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں اس دشوار مرحلے کا سامنا کرتے ہوئے انسانی رنگارنگی کی بابت احترام اور ہمدردی کے جذبے سے کام لینا چاہیے جو ایسے صحت مند معاشروں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے جنھیں ہم تخلیق کرنے کی امید کر رہے ہیں۔ خواہ ہم میں سے ہر ایک اپنی مخصوص بنیادی اقدار پر کاربند رہنے اور انھی اقدار کے حامل لوگوں کے ساتھ رشتے قائم کرنے کے لیے کوشاں ہو، ہمیں اس بات سے ہمیشہ آگاہ رہنا چاہیے کہ ہم تخلیق کے ایک ایسے عمل میں مصروف ہیں جس کا پہلے سے کوئی تفصیلی نقشہ موجود نہیں ہے۔ ہم سب ایک ارتقا پاتے ہوئے عمل میں سیکھنے والوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس بات کے ضرورت مند ہیں کہ ہر اس نئے خیال کو جس میں سچائی کی رمق کے موجود ہونے کا امکان ہو، اور ہر اس انسان کو

Scanned with CamScanner

جس میں اچھائی کی حرارت چھپی ہونے کا امکان ہو، کھلے ذہن اور تنقیدی نگاہ سے دیکھیں۔ہم ایک ایسے عمل کو شروع کرنے کی دہلیز پر ہیں جو انسانی تاریخ میں راہ کی سب سے گہری تبدیلی کی ممکنہ حیثیت رکھتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم نوع انسانی کی تخلیقی صلاحیت کو پوری طرح بروئے کار لائیں۔

❊❊

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

گلِ ستارہ

مجھے پھول لگانے کا شوق تھا۔ شروع شروع میں تو میرے گھر کا پورا صحن پھولوں سے اس طرح بھرا رہتا تھا کہ وہاں چلنے پھرنے میں دقت ہوتی تھی۔ کم سے کم پچاس قسم کے پھول میرے یہاں موجود رہتے تھے اور میں ان میں سے ہر پھول کو بلکہ اس کے پودے، پتیوں، کلیوں اور بیجوں کو بھی پہچانتا تھا۔ سب ولایتی پھول تھے جن میں سے بعض میں خوشبو بھی ہوتی تھی۔ یہ فصلی پھول جاڑوں کے موسم میں پھولتے تھے اور سردیاں ختم ہونے کے ساتھ ختم ہو جاتے تھے۔ کچھ دن کے اندر ان کے پودے بھی سوکھ جاتے تھے اور اگلی فصل کے لیے پھر سے لگائے جاتے تھے۔ یہ محنت طلب کام تھا، مگر میں محنت کر لیتا تھا۔ بعض پھولوں کے بیج میں محفوظ کر لیتا تھا اور ان کو فصل آنے پر بو دیتا تھا۔ ان پر محنت بھی زیادہ کرتا اور انھیں اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔ باقی پھولوں کے پودے میں بلرام سے خریدتا تھا۔ بلرام سرکاری باغ میں ملازم تھا اور اس کی اپنی بغیا بھی تھی جہاں سب طرح کے پھول موجود رہتے تھے، اس لیے کہ سرکاری باغ نباتات کی تجربہ گاہ ہی تھا جہاں باہر سے پھول منگوا کر ان کو اپنے ملک کی زمین میں پنپنے کے قابل بنانے کے لیے تجربے کیے جاتے تھے جو کبھی ناکام رہتے، کبھی کامیاب ہو جاتے تھے۔ بلرام تجربہ گاہ سے بھی نایاب قسم کے پھولوں کے پودے لے آتا جن میں سے اکثر کے اسے نام بھی نہیں معلوم تھے یا وہ اپنی بولی میں ان کے غلط سلط اور بگڑے ہوئے نام لیتا تھا۔ مثلاً ''ناجیلا'' کو وہ ''ناریلا'' کہتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے ''آرٹوٹی'' کا پودا دیا۔ میرے پاس پھولوں پر کئی باتصویر کتابیں تھیں جن میں تلاش کر کے میں اس کے بگاڑے ہوئے ناموں کی اصل کا پتا لگا لیتا تھا۔ ''آرٹوٹی'' کا صحیح نام ''آرکٹوٹس' نکلا۔

Scanned with CamScanner

میرے یہاں کچھ دیسی پھول بھی تھے جو زیادہ تر سفید رنگ کے ہوتے تھے اور گرمیوں اور برسات کی فصل میں پھولتے تھے۔ صحن کے ایک کنارے پر ان کی باڑھ لگی رہتی تھی اور ان کی خوشبو سے پورا گھر بھر جاتا تھا۔ ان کے پودے فصل کے ساتھ ختم نہیں ہوتے تھے اور مجھے ان پر محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ میری بیوی کو یہی پھول زیادہ پسند تھے۔ رنگ برنگے ولایتی پھول بھی اسے اچھے لگتے لیکن اتنے نہیں جتنے مجھے لگتے تھے۔

بیوی کی بیماری کے بعد سے پھولوں میں میری دلچسپی کم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی اور میں نے ولایتی پھول لگانا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کی دیکھ بھال کے لیے وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ دیسی پھول البتہ دو تین سال تک کھلتے رہے، پھر پانی نہ ملنے کی وجہ سے ان کے پودے بھی مرجھا گئے۔ اب مدت سے صحن اجاڑ پڑا تھا اور میں پھولوں کے بجائے اپنی بچی سے دل بہلایا کرتا تھا۔

میری بچی ثنا خاصی نٹ کھٹ ہے اور نئی نئی شرارتیں ایجاد کیا کرتی ہے۔ مجھے اس کی شرارتوں میں مزہ آتا ہے۔ لیکن ایک دن وہ میرے سامان میں سے ایک چھوٹا پھاوڑا نکال لائی اور صحن کے آخری سرے پر اس سے مٹی کھودنے لگی۔ اس نے شاید اپنے اسکول کے مالی کو پھاوڑے سے کام کرتے دیکھ لیا تھا۔ میرے پھاوڑے کے چوڑے پھل کے پیچھے ایک پتلا پھل بھی تھا۔ اسے احتیاط سے نہ چلایا جاتا تو پتلے پھل سے چوٹ لگ سکتی تھی۔ میں نے ثنا کو منع کیا:

"ثنا بیٹی، یہ کھیلنے کے لیے نہیں ہے۔"

"پھر کاہے کے لیے ہے؟"

"اس سے کیاری بناتے ہیں۔"

"کیاری کیوں بناتے ہیں؟"

"پھول لگانے کے لیے۔"

"تو پھول لگایئے،" اس نے کہا، پھر اپنی کسی سہیلی کے باغیچے کا ذکر کیا جس میں کئی رنگ کے پھول لگے ہوئے تھے۔

مجھے اپنا شوق جاگتا محسوس ہوا اور گھر کا صحن اور بھی اجاڑ معلوم ہونے لگا۔ مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب پھولوں کی کثرت سے صحن میں چلنا مشکل ہو جاتا تھا۔ میں نے کہا:

Scanned with CamScanner

''اچھا، ہم بھی اپنی بیٹی کے لیے پھول لگائیں گے۔''

''گلابی والے لگائیے گا،'' اس نے کہا، ''جیسی ہماری فراک ہے۔''

''لیکن پہلے کیاری تو بنالیں۔''

میں نے اسی وقت کیاری کھودنا شروع کردی۔ زمین نرم تھی۔ کچھ دیر میں خاصی گہری اور لمبی کیاری تیار ہوگئی۔ ایک کنارے پر کیاری سے نکلی ہوئی مٹی کا ڈھیر لگ گیا اور ثنا نے بار بار اس ڈھیر پر چڑھنا شروع کردیا۔ اس میں کچھ مٹی واپس کیاری میں گرنے لگی۔ میں نے اسے روکا تو وہ میرے پاس آگئی اور میں اسے لے کر اس کی ماں کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پلنگ پر نیم دراز تھی۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ثنا نے پاس جا کر اسے پیار کیا اور بولی:

''اماں، پاپا ہمارے لیے پھول لگائیں گے۔''

ماں نے اپنے بے جان ہاتھوں سے اسے چمٹانے کی کوشش کی اور بڑی مشکل سے بولی:

''تم نے دودھ پیا؟'' پھر وہ گم صم ہوگئی اور ہم کمرے سے نکل آئے۔

کیاری میں ابھی تھوڑی کسر تھی۔ میں نے سوچا اسے مکمل کردوں۔ لیکن برسوں سے کوئی مشقت کا کام نہیں کیا تھا، اس لیے تھک گیا تھا۔

''اسے کل پورا کروں گا،'' میں نے اپنے آپ کو بتایا اور دالان میں آگیا۔

اُسی شام کو ثنا کی دسویں سال گرہ تھی جس میں اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر خاصا اُدھم مچایا۔ سہیلیوں کے جانے کے بعد دیر تک وہ ان میں سے ایک ایک کا حال بتاتی رہی اور اس میں اس نے ایک بار پھر اس سہیلی کے یہاں کے پھولوں کا ذکر کیا۔ میں نے کہا:

''کل ثنا کے یہاں بھی پھول لگ جائیں گے۔''

''گلابی والے۔''

''ہاں گلابی والے۔'' میں نے اسے آہستہ آہستہ تھپکنا شروع کیا. ''بس اب سوجاؤ، نہیں تو سویرے دیر میں آنکھ کھلے گی۔''

۲

دوسرے دن میری آنکھ دیر سے کھلی۔ ثنا اپنے کمرے میں کسی عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے اس کی گلابی ساری کی صرف ایک جھلک دکھائی دی۔

''ثنا کی استانی،'' میں نے سوچا، ''آج تو رنگین کپڑے پہنے ہوئے ہے۔''

وہ سویرے سویرے ثنا کو پڑھانے آتی تھی۔ مسکین سی لڑکی تھی اور ہمیشہ سفید لباس پہن کر آتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے کسی تقریب میں جانے کے لیے آج کی چھٹی لی تھی۔ میں نے سوچا، اس نے جانے سے پہلے آج بھی ثنا کو پڑھانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی تعریف کی۔

مجھے باہر جانے کی جلدی تھی۔ کئی کام اکٹھا ہو گئے تھے، اس لیے تھوڑا ناشتہ کر کے اور ثنا کا ناشتہ نعمت خانے میں رکھ کر ایک پرانا تھیلا اٹھایا اور گھر سے نکل گیا۔ کاموں میں خاصی دیر ہو گئی۔ مجھے ثنا کا خیال آیا۔ وہ اپنے بیشتر کام خود ہی کر لیتی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ وہ استانی سے پڑھ کر اور کپڑے بدل کر اور ناشتہ کر کے ٹھیک وقت پر اسکول کی بس کے انتظار میں دروازے پر کھڑی ہو گئی ہوگی اور اب اسکول میں اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی ہوگی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ اس کی واپسی میں ابھی دیر تھی، لیکن اس کی ماں اکیلی تھی۔ ملازمہ جو ہر وقت اس کے قریب رہتی تھی، دو دن سے اپنی بیمار بیٹی کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر تک تذبذب میں کھڑا رہا، پھر گھڑی دیکھی اور بلرام کی بغیا کی طرف چل پڑا۔

یہ دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کہ بغیا میں اب زیادہ پھول نہیں تھے اور جو تھے بھی وہ عام قسم کے تھے۔ بلرام چارپائی پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حقہ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بندگی، بھیا۔ آیئے آیئے،'' وہ بڑے تپاک سے بولا، ''کتنے دن بعد آئے ہیں۔ اب پھول دول نہیں لگاتے؟''

''بس، شوق جاتا رہا،'' میں نے کہا، ''تم سناؤ، کیا حال ہے؟''

اس پر اس نے اپنا قصہ چھیڑ دیا، جس کا خلاصہ یہ کہ سرکاری نوکری سے چھٹی پا گیا تھا۔ اس پر ملازمت کے دوران پھولوں کا ذاتی کاروبار کرنے کا الزام لگا تھا۔ بیوی مر چکی تھی، ایک لڑکا باہر کہیں محنت مزدوری کر رہا تھا، دوسرا کسی میلے میں کھو گیا تھا اور اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ اب بلرام تنہا رہتا تھا اور اسے سانس کی تکلیف ہو گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں نے اس سے ہمدردی کی دو چار باتیں کیں۔ کچھ اپنا حال بتایا۔ پھر پوچھا:

''پھول کون کون سے ہیں؟''

اس نے کئی پھولوں کے نام لیے۔ میں نے کہا:

''بس ایک کیاری میں لگانا ہیں۔ ہماری بٹیا کو شوق ہوا ہے۔ گلابی پھول کون کون سے ہیں؟ اس نے گلابی ہی پھولوں کو کہا ہے۔''

بلرام نے اس کے شوق کی تعریف کی، اس کی عمر پوچھا، اسے دعائیں دیں اور ایک کیاری کی طرف اشارہ کر کے بولا:

''پھر ہماری بٹیا کے لیے تو گل ستارہ لے جایئے۔''

''گل ستارہ؟''

''جسے ہم لوگ ہاشٹر کہتے ہیں۔''

آسٹر میرا بھی پسندیدہ پھول تھا، مجھے یاد آیا۔ میں نے ہی بلرام کو بتایا تھا کہ اسے ہماری زبان میں گل ستارہ کہتے ہیں، لیکن میں خود اسے آسٹر ہی کہتا تھا۔ یہ پودے کے چاروں طرف لمبے ڈنٹھلوں میں کھِلتا تھا اور اس کا ہر پودا ایک گل دستہ معلوم ہوتا تھا۔ بلرام سے میں گلابی آسٹر بھی لیتا تھا، اودے بھی اور سفید بھی۔ میں سب کو ایک ہی کیاری میں لگاتا تھا؛ بیچ میں اودے، ان کے گرد گلابی اور حاشیے پر سفید، اور وہ کیاری صحن میں سب سے نمایاں نظر آتی تھی۔ میں نے اس سے وہ پودے نکلوائے جو خاصے بڑے ہو چکے تھے اور ان میں کلیاں آگئی تھیں۔ اس نے کیاری کی ناپ پوچھی اور اس کے حساب سے کئی پودے بہت احتیاط کے ساتھ کھودے، ان کی جڑوں کی مٹی کو ہلکے ہاتھوں سے دبا دبا کر کچھ سخت کیا اور اس پر جنگلی گھاس لپیٹ دی۔ پھر کچھ رک کر بولا:

''کہیے تو ہم شام کو آکر کیاری ٹھیک کر کے انھیں بیٹھال دیویں۔''

''نہیں،'' میں نے کہا، ''کیاری تیار کر لی ہے۔ شام کو میں خود ہی لگا دوں گا۔''

میں نے تھیلے کا منھ کھول دیا اور بلرام نے پودوں کو سنبھال سنبھال کر اس میں رکھ دیا۔ چلتے وقت میں نے کہا:

''اچھا بلرام، اب تو جاڑے ختم پر ہیں۔ اگلے سال سے پھر سب طرح کے پھول لگانا شروع

کروں گا۔" پھر کچھ رک کر کہا، "کتنے پیسے ہوئے؟ اتنے برسوں میں پھولوں کے دام بھی بڑھ چکے ہوں گے۔"

"نہیں صاحب،" اس نے کہا، "یہ بٹیا کو ہماری طرف سے دے دیجیے گا۔ آپ سے اگلے سال..."

گھر پہنچتے پہنچتے وہ پھول مجھے کیاری میں کھلے ہوئے نظر آنے لگے اور مجھ کو ان سے بھی اتنی ہی محبت ہوگئی جتنی ثنا سے تھی۔

۳

ثنا ابھی اسکول سے نہیں آئی تھی اور جاتے وقت گھر کا دروازہ باہر سے بند کر گئی تھی۔ مجھے اس کی سمجھ داری پر تعجب ہوا۔ میں نے دروازہ کھولا اور ڈیوڑھی میں رک کر گھر کے اندر ایک نظر ڈالی۔

وہی روز کا منظر تھا۔ صحن کے دائیں طرف دالان جس کے تینوں دروں کو بند کر کے بیچ کے در میں دروازہ لگا دیا گیا تھا۔ دالان کے ایک طرف ثنا کا چھوٹا کمرہ تھا۔ دوسری طرف ایک اور کمرہ جس میں میری بیوی ملازمہ کے ساتھ رہتی تھی۔ دالان کے آگے بڑا سا صحن جس کے بالکل آخر میں وہ کیاری تھی جو میں نے پھولوں کے لیے بنائی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں دیکھ کر گیا تھا۔ پھر مجھے بیوی کا خیال آیا۔ صبح تک وہ ٹھیک تھی؛ میرا مطلب ہے، ویسی ہی تھی جیسی بیماری کے بعد ہوگئی تھی، یعنی چلنے پھرنے سے معذور اور دماغ زیادہ تر ماؤف۔ میں اس کی خبر رکھتا اور ثنا کی بھی پرورش کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے میرا گھر سے نکلنا قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔ بازار پاس ہی تھا اس لیے خریداری میں بھی زیادہ وقت نہیں لگتا تھا، بلکہ روزمرہ کی خریداری ملازمہ کر لیتی تھی۔ میں صرف کبھی کبھار خریداری کرتا تھا لیکن آج کئی کام کرنا تھے اور ثنا کے لیے پودے بھی لینا تھے، اس لیے زیادہ دیر ہوگئی تھی اور بیوی گھر میں اکیلی تھی۔

میں نے پودوں کا تھیلا دالان میں پھینکا اور لپکتا ہوا بیوی کو دیکھنے پہنچا۔ وہ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور ٹھیک ٹھاک معلوم ہو رہی تھی، بلکہ آج اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا:

"کھانا کھالیا؟"

"ابھی کھاتا ہوں،" میں نے کہا، "ثنا آجائے تو تینوں مل کر کھائیں گے۔"

Scanned with CamScanner

میں نے اسے لٹا دیا۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا رہا۔ پھر اپنے دالان میں آ گیا۔

پودے کچھ تھیلے کے اندر ہو گئے تھے، کچھ تھوڑے باہر نکل آئے تھے۔ مجھے کیاری درست کرنے کا خیال آیا، لیکن اس وقت اُسے درست کرنے کا دم نہیں تھا۔ میں نے سوچا شام کو پودے لگانے سے پہلے اسے مکمل کرلوں گا۔ پودوں پر پانی چھڑکنے کا خیال آیا، لیکن تھک گیا تھا۔ تخت پر بیٹھ گیا۔

کیاری سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے پاس ہی مٹی کے ڈھیر پر پھاوڑا رکھا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈھیر کی بہت سی مٹی واپس کیاری میں ڈال دی گئی ہے۔ ثنا کی کارستانی، میں نے سوچا۔ پھر مجھے کنارے پر پڑی ہوئی مٹی کے بچے کھچے ڈھیر کے پیچھے گلابی رنگ کی جھلکیاں دکھائی دیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ میں اٹھ کر تیزی کے ساتھ کیاری کے قریب پہنچا۔

کیاری میں ایک عورت بے ترتیبی کے ساتھ اوندھے منھ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پورے بدن پر تھوڑی تھوڑی مٹی ڈال دی گئی تھی۔ سر کے اوپر زیادہ مٹی ڈالی گئی تھی جو اس کے لمبے سیاہ بالوں کو پوری طرح چھپا نہیں سکی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ باقی بدن پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ جوان معلوم ہو رہی تھی۔ جس طرح وہ بے حرکت پڑی ہوئی تھی، اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے اور میں ایک لاش کے روبہ رو ہوں۔ میرا بدن سنسنانے لگا اور خوف نے مجھ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

میں خوف کی گرفت میں تھا کہ ثنا اسکول سے واپس آ گئی۔ بستہ دالان میں رکھ کر وہ سیدھی کیاری کی طرف آئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور میں نے اٹک اٹک کر پوچھا:

''یہ... یہ کیا ہے؟''

''یہ یہاں آکر مر گئیں۔''

''سویرے تم انھیں سے باتیں کر رہی تھیں؟''

''ہاں۔ انھوں نے کنڈی کھٹکھٹائی، ہم سمجھے ٹیچر آئی ہیں۔ دروازہ کھولا تو یہ اندر چلی آئیں۔''

''مگر یہ ہے کون؟''

''ہمیں نہیں معلوم۔ ان کی بیٹی کی ہپی برتھ ڈے ہے، اسی میں بلانے آئی تھیں۔ ہم نے کہا، ہم آپ کو نہیں جانتے، آپ کی بیٹی کو بھی نہیں جانتے۔ تو انھوں نے کہا، ہمارے میاں تمھارے پاپا کو جانتے

ہیں، ہم ان سے کہے دیتے ہیں۔ لیکن آپ جا چکے تھے۔ تو انھوں نے کہا ہم انتظار کریں گے۔ ہم نے سوچا آپ کی کیاری ٹھیک کر دیں۔ یہ بھی اٹھ کر ہمارے ساتھ آئیں۔ پھاوڑا اٹھایا، پھر رکھ دیا۔ پھر کیاری میں گر گئیں اور مر گئیں۔"

"تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یہ مر گئی ہیں؟"

"ہمیں معلوم ہو گیا تھا۔ ہم نے ان کو ہلا کر دیکھا تھا۔ ان کی سانس نہیں چل رہی تھی، دل بھی نہیں دھڑک رہا تھا۔ آپ بھی دیکھ لیجیے۔"

میں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا۔ خوف کے ساتھ ساتھ مجھے ثنا کی ہمت پر حیرت بھی تھی۔ میں نے پوچھا:

"اور تم لاش کو چھپا رہی تھیں؟"

"نہیں تو۔"

"پھر؟"

"دفن کر رہے تھے۔ پھر ہماری بس آگئی اور ہم اسکول چلے گئے۔" اس نے میری طرف دیکھا اور بولی، "اماں نے کہا تھا کہ مردے کو جلدی دفن کر دینا چاہیے۔"

"اس طرح دفن کیا جاتا ہے؟"

"پھر کس طرح؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مجھ کو مردوں سے ڈر لگتا تھا۔ میں نے آج تک کوئی لاش نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت بھی میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیاری میں پڑی لاش کی طرف دیکھوں۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دوں، لیکن مجھے پولیس والوں سے بھی ڈر لگتا تھا۔

"کیا کرنا چاہیے:" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ ثنا میرے قریب ہی چپ کھڑی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا:

"مجھ کو شروع سے بتاؤ، کیا کیا ہوا تھا؟"

اس نے پھر وہی سب بتا دیا جو پہلے بتا چکی تھی، اور یہ بھی کہ اس نے پہلے ماں کو عورت کے

مرنے کی خبر دی تھی۔ بڑی مشکل سے اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کوئی مر گیا ہے اور اس نے بے دلی سے کہہ دیا تھا:

''تو دفن کر دو۔''

اس کے بعد شاید بھول بھی گئی کہ اس نے کیا سنا تھا اور کیا کہا تھا۔

بہت دیر تک میں بدحواس رہا۔ پھر خیال آیا کہ کسی دوست سے مدد لی جائے۔ شہر میں میرے دوست تین ہی چار تھے مگر اس وقت کوئی دوست یاد نہیں آ رہا تھا۔ اسی وقت ثنا نے کہا:

''پاپا، آپ نے کھانا نہیں کھایا؟''

مجھے اس بے محل سوال پر کچھ غصہ آیا، لیکن فوراً ہی اتر گیا۔

''کھالوں گا،'' میں نے کہا اور کیاری کی طرف دیکھے بغیر اشارہ کیا، ''پہلے اس کا کچھ کر لوں۔''

میں سوچ رہا تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں تو جانا ہی ہے، مگر کس طرح؟ میرے دماغ میں پولیس کی اصطلاحیں گونج رہی تھیں جن کے مفہوم سے میں پوری طرح واقف بھی نہیں تھا، ''ایف آئی آر،'' ''پنچ نامہ''، ''پولیس ریمانڈ'' اور معلوم نہیں کیا کیا۔ ہر اصطلاح کے ساتھ طرح طرح کے اندیشے لگے ہوئے تھے۔ پولیس کے بارے میں جو کچھ میں سوچ رہا تھا اس میں سے کچھ باتیں شاید میری زبان پر بھی آ گئیں، اس لیے کہ میں نے ثنا کو دیکھا تو وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔

اسی وقت مجھے ایک دوست یاد آ گیا جس سے میری کسی حد تک بے تکلفی تھی لیکن ملاقات اب کم ہوتی تھی۔ میں نے ثنا سے کہا:

''اچھا میں تمھارے ساجد چچا کے پاس جا رہا ہوں۔ ابھی واپس آتا ہوں اور دیکھو...'' میں نے پھر کیاری کی طرف دیکھے بغیر اشارہ کیا، ''اس سے چھیڑ چھاڑ مت کرنا۔ جا کر منھ ہاتھ دھو لو۔ پھر دالان میں رہنا، یا اپنے کمرے میں چلی جانا،'' میں رکا، پھر بولا، ''یا اماں کے پاس چلی جانا، لیکن اب ان کو کچھ نہ بتانا۔''

میں نے جاتے جاتے رک کر کہا:

''اور دیکھو، اس کے بدن پر کوئی چادر ڈال دینا۔ میت کا منھ کھلا نہیں چھوڑتے۔''

ساجد کا مکان میرے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں جلد ہی وہاں پہنچ گیا۔ اتفاق سے وہ گھر پر

Scanned with CamScanner

موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ حیران ہوا، پھر باہری کمرہ کھولا۔ وہاں کچھ رسمی بات چیت کے بعد میں نے پوچھا:

''یہ بتاؤ، اگر کوئی اجنبی عورت تمھارے گھر آ کر مر جائے تو تم کیا کرو گے؟''

''پولیس کو خبر کروں گا۔''

''اس میں کوئی پیچیدگی تو نہیں ہوگی؟''

''پولیس کے معاملات میں پیچیدگیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ سب سے پہلے تو تمھیں پر شبہ کیا جائے گا۔ لاش کی شناخت کی کوشش کی جائے گی۔ پوسٹ مارٹم ہوگا۔ موت کے سبب کا پتا لگایا جائے گا۔ اگر کہیں موت غیر فطری نکلی، میرا مطلب ہے، زہر وغیرہ، تو سمجھو تم گئے کام سے۔''

میں بھی سمجھتا تھا کہ اس صورت میں کیا ہوگا۔ لیکن اُدھر سے توجہ ہٹا کر میں نے پوچھا:

''اور اگر پوسٹ مارٹم سے معلوم ہوا کہ موت فطری ہوئی ہے، تو؟''

''تو بھی پولیس کے چکر میں تو پڑنا ہی ہوگا۔ اور اچانک موت پر شبہ...'' اس نے رک کر غور سے مجھے دیکھا۔ ''مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

تب میں نے اسے تفصیل کے ساتھ پورا واقعہ بتا دیا۔ وہ سن کر دہشت زدہ سا ہو گیا۔

''بہت برا ہوا، بہت برا ہوا،'' دیر کے بعد اس نے کہا، ''پولیس میں رپورٹ تو کرنا ہی ہوگی۔ پولیس والے آ کر لاش کو اپنی تحویل میں لیں گے۔ پھر تم سے... تم اسے بالکل نہیں پہچانتے؟''

''نہیں،'' میں نے کہا اور سوچ رہا تھا کہ اسے کیوں کر بتاؤں کہ میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ پھر مجھے ایک بات سوجھ گئی۔ ''اس نے خود میری بیٹی سے کہا تھا کہ میں اسے نہیں جانتا۔'' پھر مجھے دوسری بات بھی سوجھ گئی۔ ''بات یہ ہے کہ وہ اوندھے منھ پڑی ہوئی ہے۔ میں نے اسے اسی طرح رہنے دیا تاکہ پولیس والے...''

''یہ تم نے اچھا کیا۔''

''تمھارے پاس اسی لیے آیا ہوں کہ اب کیا کیا جائے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔''

''میں بھی ان معاملات میں کورا ہوں،'' وہ بولا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا، ''ہم لوگ بھی کیا ہیں۔ چلو مُشّو کے پاس چلتے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''منشو؟''

''وہی اپنا مشتاق کنوارا۔ اب وہ وکیل ہو گیا ہے۔''

مجھے بھی مشتاق کنوارا یاد آ گیا۔ ایک زمانے میں اس سے میری گہری دوستی تھی۔ ''کنوارا'' کا لفظ اس کے نام کا جز بن گیا تھا، اس لیے کہ وہ شادی کرنے کا سخت مخالف تھا۔ ''شادی'' کا لفظ وہ تنہا استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ ''شادی کی حماقت'' کہتا تھا۔ میں نے ساجد سے پوچھا:

''تم سے مشتاق کنوارے سے ملاقات ہوتی ہے؟''

''قریب قریب روزانہ۔ ہم رمی کھیلتے ہیں۔ وہ چوکی تھانے کے معاملوں سے نپٹ سکتا ہے۔ بلکہ ابھی پولیس کو رپورٹ بھی نہ کی جائے۔ تم مشتاق کنوارے کو اپنا وکیل بنا لو۔ وہ سب سنبھال لے گا۔''

''تم نے بہت اچھی بات سوچی۔ میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔''

''اچھا تو تم گھر جاؤ۔ میں مشتاق کو لے کر آتا ہوں۔''

''ہم دونوں ہی اس کے پاس کیوں نہ چلیں؟''

''لاش پر مٹی پڑی ہوئی ہے،'' اس نے کہا اور اسے ہلکی سی جھرجھری آئی، یا شاید مجھے آئی ہو۔ ''تم جا کر مٹی صاف کرو۔''

''نہیں، میرا خیال ہے پہلے مشتاق اصل منظر کو دیکھ لے۔'' اور اس بار مجھ کو واقعی جھرجھری آئی۔ ''اس کے بعد وہ جیسا مناسب سمجھے۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہاں تمھاری بچی اکیلی ہے۔ لاش سے ڈرے گی تو نہیں؟''

پھر اسے خود ہی خیال آیا اور میں نے بھی کہا:

''ڈرے گی کیا۔ وہ تو لاش کو تنہا دفن کر رہی تھی۔''

''کمال ہے۔ بھئی یہ آج کل کے بچے... ٹھیک ہے، چلو ہم دونوں چلتے ہیں۔''

ہم مشتاق کے یہاں پہنچے۔ اتنی دیر میں مجھے اس خیال سے خاصا اطمینان ہو گیا تھا کہ اب ایک وکیل سارے معاملے کو ہاتھ میں لے لے گا۔

مشتاق اپنے باہری کمرے ہی میں مل گیا۔ ہمیں دیکھ کر پہلے تو گذشتہ رات کی رمی کے بارے میں ساجد سے ہنسی مذاق کیا، پھر مجھ سے بولا:

Scanned with CamScanner

"آج تم کدھر بھول پڑے؟"

"ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"خیریت؟"

ساجد نے اسے پورا قصہ سنایا جسے اس نے سنجیدگی سے سنا۔ پھر مجھ سے ہر بات کئی کئی دفعہ پوچھی۔ آخر میں بولا:

"تو تم نے اسے کیاری میں مرا ہوا پایا۔ اس سے پہلے کا سارا حال تمھاری بچی کا بتایا ہوا ہے۔ تمھیں یقین ہے کہ اس نے سب کچھ سچ سچ بتایا ہے؟"

مجھے کچھ ناگوار ہوا۔ میں نے کہا:

"وہ جھوٹ نہیں بولتی۔"

"بعض بچوں کو جھوٹ بولنے کا شوق ہوتا ہے۔"

"اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے؟"

"ضرورت نہیں، شوق۔ بھئی معاف کرنا، وکیل ہر سنی ہوئی بات پر یقین نہیں کر لیتا، خواہ کوئی بچہ ہی... اچھا چاے پی لو، پھر چلتے ہیں۔"

"نہیں بچی گھر میں اکیلی ہے۔"

"کیوں، بچی کی ماں؟"

"اُن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ قصہ پھر کبھی سناؤں گا۔"

مشتاق نے جلدی سے وکالت نامہ لکھ کر اس پر میرے دستخط لیے۔ پھر وکیلوں والا سیاہ گاؤن پہن کر تیار ہو گیا۔ اس کو اس لباس میں دیکھ کر میرا بوجھ اور ہلکا ہو گیا۔

راستے بھر وہ ساجد سے ہنستا بولتا رہا، لیکن میرا دماغ اب بھی فکروں سے خالی نہیں تھا۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اب شاید مجھے وہ لاش دیکھنا ہی پڑے۔ مردہ چہرے کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ مجھے یہ بھی خیال نہیں آ رہا تھا کہ زندہ آدمی مردوں سے کب تک بچ سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

۴

ہم پہنچ گئے۔ ثنا نے دروازہ کھولا۔ وہ شاید اتنے عرصے روتی رہی تھی۔ میں نے اس کا سر تھپتھپایا۔ وہ پھر رونے لگی اور بولی:

''اماں بے ہوش ہیں۔ ہمیں ڈر لگ رہا ہے۔''

''ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ بے ہوش تو وہ ہوتی ہی رہتی ہیں۔''

باہر والے کمرے میں ان دونوں کو بٹھا کر میں صحن میں آیا۔ ایک نظر پورے صحن پر دوڑائی۔ کیاری پر میری نظر نہیں رکی لیکن میں نے دیکھ لیا کہ لاش اب سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ میں پھر باہر والے کمرے میں آیا۔ ساجد کو بلا کر صحن میں لایا۔ کیاری کا منظر دور سے دکھایا اور کہا:

''تم جب تک مشتاق کو لا کر دکھاؤ۔ میں کچھ ناشتے کا سامان لے آؤں۔ بس ابھی گیا، ابھی آیا۔''

اس کے روکتے روکتے میں گھر سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر بازار میں وقت گذارنے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ ایسے موقعے پر میرا دیر تک باہر رہنا ٹھیک نہیں ہے، لہٰذا کچھ بسکٹ اور پھل خرید کر گھر واپس ہوا۔

منظر میری توقع کے خلاف تھا۔ مشتاق اب بھی اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا تھا اور ساجد اسے کچھ سمجھا رہا تھا۔

''بھائی، دیکھ تو لوں،'' مشتاق نے کہا۔

''اطمینان سے دیکھنا۔ ابھی تو تم فوراً گھر پہنچو اور گاڑی بھجواؤ۔ میں بھی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ سب سمجھا دوں گا۔''

''کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے؟''

ساجد کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ مشتاق نے پھر پوچھا:

''کچھ گڑبڑ ہے؟''

''سخت گڑبڑ ہے۔''

''تو مجھے بتاؤ نا۔ اس معاملے کے وکیل کی حیثیت سے...''

''کہہ تو رہا ہوں، سب بتا دوں گا۔''

''ساجد،'' مشتاق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ''میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

"ٹھیک سمجھ رہے ہو۔ تم گھر تو جاؤ۔" ساجد نے اسے قریب قریب اسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔
مشتاق کے جانے کے بعد وہ میری طرف مڑا۔ اتنی ہی دیر میں مجھے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ میں ساجد سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا، بس چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر وہی بولا:

"وہ ستارہ ہے۔"

"ستارہ؟"

"مشتاق کی بیوی۔ کبھی کبھی وہ گھر سے نکل جاتی تھی۔ آج تمھارے یہاں آ گئی۔ کسی طرح اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ تم مشتاق کے دوست ہو۔"

"لیکن مشتاق کنوارے نے تو شادی..."

"کر لی تھی۔ سب سے چھپا کر۔ پورا قصہ بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی اسے اٹھوانے کا بندوبست کرنا ہے۔ مشتاق لاش گاڑی بھجوا دے گا۔ میں جب تک کفن وغیرہ..."

وہ جانے لگا لیکن میں نے اسے روکا:

"نہیں، کچھ تو بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟"

"وہ مشتاق کے مکان کی اوپری منزل پر کرائے دار ہے، مطلب کرائے دار تھی۔ اس کا کوئی رشتے دار وغیرہ نہیں ہے۔ اکیلی رہتی تھی۔ مشتاق نے اس سے شادی کر لی، لیکن ظاہر یہی کرتا تھا کہ وہ اس کی کرائے دار ہے۔ جب تم نے اس کا اپنے یہاں آنا بتایا تو مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی ہو، لیکن جب تم نے بتایا کہ وہ تمھاری بچی کو اپنی بیٹی کی سال گرہ میں بلانے آئی تھی تو میں نے سوچا کوئی اور ہوگی۔"

"تو کیا اس کی کوئی بیٹی نہیں ہے؟"

"کمال کرتے ہو! ان کی شادی چھپ کر ہوئی تھی۔ سب اسے غیر شادی شدہ سمجھتے ہیں۔"

"پھر وہ سال گرہ کس کی منا رہی تھی؟"

"میرا خیال ہے کسی کی نہیں۔ اس کا جی اولاد کو ضرور چاہتا ہوگا۔ لیکن مشتاق شادی کا اعلان نہیں کر رہا تھا۔"

"کیوں؟"

"وہ مشتاق 'کنوارا' جو مشہور ہے۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

"اسے کہاں لے جاؤ گے؟"

"مشتاق کے گھر۔ آخر وہ وہیں رہتی تھی۔" وہ جاتے جاتے رکا، "تم یہیں رہو۔ بعد میں چاہے آجانا۔"

"میں یہیں ہوں،" میں نے کہا، "لیکن بیوی کی حالت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ اسے بھی دیکھنا ہے۔ مشتاق کو بتا دینا۔"

اس نے میری بات کچھ سنی، کچھ نہیں سنی، اور گھر سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی میں بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اب ہوش میں تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے رک رک کر لیکن سہمے ہوئے سے انداز میں پوچھا:

"کیا کوئی لاش نکلی ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

"لیکن ثنا تو..."

"وہ شاید یوں ہی معلوم کرنا چاہ رہی ہوگی۔ اگر کوئی لاش کسی گھر میں ہو..."

"تو اسے جلدی دفن کر دینا چاہیے،" اس نے کہا۔

اس کا دماغ پھر خیالوں سے خالی ہوگیا اور وہ تکیوں پر گر پڑی۔ میں نے اسے ٹھیک سے لٹایا اور کمبل اُڑھا دیا۔

بہت دیر تک میں اس کے پاس بیٹھا رہا اور باہر صحن سے آتی ہوئی ساجد اور کچھ اور لوگوں کی آوازیں سنتا رہا۔ آخر خاموشی ہوگئی اور میں باہر صحن میں آگیا۔

رات ہوگئی تھی اور کیاری خالی تھی۔ اس کی مٹی پھر پہلے کی طرح تودے کی صورت میں باہر ڈھیر تھی۔ ثنا اس کے پاس کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور پوچھنے لگی:

"پاپا، اب تو کچھ نہیں ہوگا؟"

"کچھ نہیں،" میں نے کہا، "نہیں، کچھ تو ہوگا، لیکن اس سے ہمیں شاید مطلب نہیں ہوگا۔"

میں اسے لے کر دالان میں آگیا۔ اب اس نے پوچھا:

"پاپا، کچھ معلوم ہوا، وہ کون تھیں؟"

Scanned with CamScanner

''ایک جاننے والی تھیں۔ یہاں آکر بے چاری کا ہارٹ فیل ہوگیا۔''

''بہت خوب صورت تھیں۔ ان کا نام کیا تھا؟''

''ستارہ... ستارہ ان کا نام تھا۔''

اس وقت مجھے اپنے آسٹر یاد آئے۔ ان کے پودے اُسی طرح پڑے پڑے غالباً مرجھا گئے تھے اور اب لگانے کے قابل نہیں رہ گئے تھے۔

کیاری بھی اس قابل نہیں رہی تھی کہ میں اس میں پھول لگا سکتا۔

❁❁

شخصیات

انیس
نیر مسعود
Rs.375

جوئندہ یابندہ
رالف رسل، ترجمہ: ارجمند آرا
Rs.295

جواب دوست
نسیم انصاری
Rs.70

Choosing to Stay
Nasim Ansari
Rs.160

گردشِ پا
زبیر رضوی
Rs.70

دیواروں کے باہر
ندا فاضلی
Rs.100

دیواروں کے بیچ
ندا فاضلی
Rs.80

میری ناکام زندگی
اختر حامد خاں
Rs.80

میرا بچپن
عذرا عباس
Rs.80

نئے خاکے
اختر حامد خاں
Rs.80

چند بزرگ
اختر حامد خاں
Rs.80

قرۃ العین حیدر کے خطوط ایک دوست کے نام
ترتیب: خالد حسن
Rs.180

Scanned with CamScanner

ناتالیا گنزبرگ (Natalia Ginzburg) ۱۹۱۶ء میں اٹلی کے صوبہ صقلیہ (Sicily) میں پیدا ہوئی۔ لیکن وہ شہر تورینو (Turin) میں پلی بڑھی جہاں اس کے بچپن ہی میں اس کے والدین منتقل ہو گئے تھے۔ اس کا باپ یہودی تھا اور ماں کیتھولک عیسائی تھی، لیکن ناتالیا گنزبرگ کی پرورش غیر مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اس کی ادبی تصنیفات کا سلسلہ ۱۷سال کی عمر سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے لیون گنزبرگ سے شادی کی جو روسی ادب کا پروفیسر تھا۔ دونوں ایک مرکزِ اشاعت سے منسلک ہو گئے جس سے ناتالیا کی چند کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ فاشزم کی مخالفت میں سیاسی سرگرمیوں کے باعث ناتالیا اور لیون تین سال تک ایک چھوٹے سے گاؤں میں نظر بند رہے۔ رہائی کے بعد دونوں روم منتقل ہو گئے۔ لیون دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور قید ہی میں ۱۹۴۴ء میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۵۰ء میں ناتالیا گنزبرگ کی دوسری شادی گابریئیلے بالدینی (Gabriele Baldini) سے ہوئی جو انگریزی ادب کا پروفیسر تھا اور جو ۱۹۶۹ء تک زندہ رہا۔

۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۷ء تک اطالوی کمیونسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر ناتالیا اٹلی کی پارلیمنٹ کی منتخب رکن بھی رہی، جہاں وہ انسانی بہبود کے مسائل، مثلاً بنیادی ضرورتوں کی اشیا کی ارزاں فراہمی، فلسطینی بچوں کی امداد، ذہنی مریضوں کے حقوق کے قوانین وغیرہ میں سرگرم رہی۔

ناتالیا گنزبرگ کی تصانیف میں افسانے، ناول، ڈرامے، سوانح، اور غیر اطالوی ادب کے ترجمے شامل ہیں۔ جس ادبی انداز کو ہماری روایت میں سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے، مصنفہ کی نثر اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ مشکل لفظوں، پیچیدہ ترکیبوں، اور مرصع عبارت کے استعمال سے احتراز کرتی ہے۔ نہ ہی زورِ بیان کے لئے وہ جذبات کا سہارا لیتی ہے۔ لیکن اس کی تحریر غیر جذباتی سیدھی سادی واقعہ نگاری پر مشتمل ہونے کے باوجود قاری کو متاثر کرتی ہے۔ اس کے موضوع اکثر معاشرتی پسِ منظر میں خاندانی اور دوستانہ رابطوں اور عورتوں کے کردار سے تعلق رکھتے ہیں۔

موجودہ کہانی "ماں" ("La Madre") ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مرکزی کردار ایک عورت ہے جو اگرچہ ایک ماں ہے لیکن "مثالی ماں" کا ارفع تصور اس پر منطبق نہیں ہوتا، کیونکہ اچھی ماؤں میں جو خصوصیات ضروری سمجھی جاتی ہیں ان سے وہ عورت محروم ہے۔ اُس کو خاندان، خاندانی دوست، بچے، مکان، اور پیشہ ورانہ ملازمت سب میسر ہیں، ان خاندانی اور معاشرتی رابطوں کے باوجود وہ ایک شدید تنہائی کے احساس میں مبتلا ہے۔ وہ ایک بے سہارا، کمزور، اور ناکام عورت ہے جو طمانیت اور مسرت کی تلاش میں بے قرار ہے لیکن یہ چیزیں اس کی رسائی سے باہر نظر آتی ہیں۔

ماں کی زندگی کے واقعات اس کے بچوں کے محسوسات اور خیالات کے ذریعے بیان کئے گئے ہیں۔ زندگی کی پیچیدگیوں کا مشاہدہ بچے اپنی فطری سادگی کے ساتھ کرتے ہیں اور پھر ان مشاہدات سے معصومانہ قسم کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔

— مترجم

ناتالیا گنز برگ

انگریزی سے ترجمہ: کمال ابدالی

ماں

ان لڑکوں کی ماں قامت کی چھوٹی اور دبلی پتلی سی تھی اور اس کے کاندھے ذرا گول تھے۔ وہ ہمیشہ نیلی اسکرٹ اور سرخ اونی بلاوز پہنا کرتی تھی۔ اس کے سر کے بال کالے، چھوٹے اور گھونگھریالے تھے جن کو وہ تیل چپڑ کر قابو میں رکھتی تھی؛ اپنی بھنوؤں کے بال موچ موچ کر اس نے ان کی ایسی شکل بنا رکھی تھی جیسے دو کالی مچھلیاں اس کی کنپٹیوں کی طرف تیر رہی ہوں؛ اس کے چہرے پر پیلا پوڈر تھپا رہتا تھا۔ وہ کافی کمسن تھی؛ اس کی صحیح عمر کا تو ان لڑکوں کو اندازہ نہیں تھا، مگر اسکول کے دوسرے لڑکوں کی ماؤں سے وہ یقیناً کم عمر نظر آتی تھی۔ اپنے دوستوں کی ماؤں کو دیکھ کر انھیں خاصا تعجب ہوتا تھا کیونکہ یہ بہت بوڑھی اور موٹی دکھائی دیتی تھیں۔

وہ بے تحاشا سگریٹ پیا کرتی تھی، جس سے اس کی انگلیوں پر سگریٹ کے داغ پڑ گئے تھے؛ بلکہ وہ رات کو سوتے وقت بستر میں بھی سگریٹ پیتی تھی۔ وہ تینوں ایک زرد لحاف والے بڑے سے بستر میں ساتھ ہی سوتے تھے۔ ماں بستر کے دروازے کی طرف والے کنارے پر سوتی تھی۔ بستر سے متصل چھوٹی میز پر رکھے برقی لیمپ کے شیڈ پر لال کپڑا منڈھا تھا کیونکہ وہ اسی روشنی میں پڑھتی اور تمباکو نوشی کرتی تھی۔

بعض دفعہ وہ رات کو بڑی دیر میں واپس آتی جس پر لڑکے جاگ جاتے اور اس سے پوچھتے کہ وہ کہاں رہ گئی تھی۔ اس کا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ ''سینما میں'' یا ''اپنی ایک دوست کے ساتھ۔'' اب اس

کی دوست کون تھی یہ ان کو معلوم نہیں تھا، کیونکہ کبھی بھی اس کی کوئی دوست عورت اس سے ملنے ان کے گھر نہیں آئی تھی۔

وہ رات کو لباس تبدیل کرتے وقت لڑکوں کو دوسری طرف کروٹ بدلنے کو کہتی۔ ان کو کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دیتی اور دیواروں پر سائے ناچتے دکھائی دیتے، پھر ٹھنڈے ریشمی شب خوابی کے لباس میں ملبوس اس کا دبلا پتلا جسم بستر میں ان کے قریب آن سماتا۔ وہ جتنا ممکن ہوتا اس کے پاس سے اتنی ہی دور ہٹ جاتے کیونکہ وہ ہمیشہ ان کو ٹوکتی تھی کہ وہ اس سے چپک جاتے ہیں اور نیند میں لاتیں چلاتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ روشنی بجھا دیتی تا کہ ان کو نیند آ جائے، پھر وہ اندھیرے اور خاموشی میں سگریٹ پیتی۔

ان کی ماں کسی شمار میں نہیں تھی۔ گھر کے اہم لوگ تھے نانی اور نانا اور کلیمنٹینا خالہ جو گاؤں میں رہتی تھی اور سنگھاڑوں یا مکئی کے آٹے کے ساتھ کبھی کبھار آ نکلتی تھی، اور ملازمہ دیومیرا، اور قلی جیووانی، جو تپ دق کا مریض تھا اور بید کی کرسیاں بُنتا تھا۔ دونوں لڑکوں کی نظر میں یہ ہستیاں ایسی تھیں جن پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ ان کی بات ماننی ضروری تھی، ان کو ہر کام ٹھیک سے کرنا آتا تھا، ان میں عقل بھی تھی اور طاقت بھی، اور وہ آندھیوں اور ڈاکوؤں سے بچا سکتے تھے۔ گھر میں ماں کے ساتھ اکیلے رہنے میں ان لڑکوں کو ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کا رہنا نہ رہنا برابر تھا۔ کسی کام کی اجازت دینا یا اس سے منع کرنا ماں کے بس کی بات نہیں تھی۔ بہت تنگ ہونے پر تھکی تھکی آواز میں صرف وہ یہ کہتی، ”مت کرو نا اتنا ہنگامہ، میرے سر میں درد ہے۔“ اگر وہ اس سے کسی کام کے لیے اجازت مانگتے تو وہ ان سے کہتی کہ جاؤ نانی سے جا کر پوچھ لو۔ یا وہ پہلے ”نہیں“ کہتی پھر ”ہاں“، پھر دوبارہ ”نہیں“ کہتی، اس لیے ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں۔ جب وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلے گھر سے باہر جاتے تو مذبذب اور سہمے سہمے رہتے، کیونکہ وہ ہمیشہ غلط طرف مڑ جاتی اور پھر اس کو کسی پولیس کے سپاہی سے راستہ پوچھنا پڑتا۔ دکانوں میں داخل ہوتے یا دکاندار سے چیزوں کے بارے میں کچھ پوچھتے وقت وہ کھسیانی کھسیانی اور جھینپی جھینپی سی لگتی۔ پھر وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ دکان میں بھول آتی، جیسے دستانے یا دستی تھیلا یا مفلر، اور پھر اسے یہ چیزیں واپس لینے دوبارہ دکان میں جانا پڑتا جس سے لڑکوں کو بڑی شرم محسوس ہوتی۔

ان کی ماں کی درازیں بے ترتیب رہتیں اور چیزیں اِدھر اُدھر پھیلی رہتیں۔ اس لیے کمرہ درست کرتے وقت دیومیرا ہمیشہ بڑبڑایا کرتی، بلکہ اکثر نانی کو بلا کر اس کو بھی کمرے کی یہ درگت دکھاتی۔ پھر

دونوں مل کر بکھرے ہوئے کپڑے اٹھاتیں اور چاروں طرف گری ہوئی سگریٹ کی راکھ کو پونچھتیں۔

صبح صبح ان کی ماں سودا سلف لینے جاتی اور واپسی پر اپنا ڈوری سے بُنا ہوا خریداری کا تھیلا باورچی خانے کی سنگِ مرمر کی میز پر ڈال کر، اچھل کر اپنی سائیکل پر سوار ہوتی اور اپنے دفتر کی طرف روانہ ہو جاتی۔ دیومیرا تھیلے کا سامان جانچتی، ہر سنگترے کو ٹٹولتی، گوشت کو غور سے دیکھتی، اور چلّا کر نانی کو بلا کر دکھاتی اور شکایت کرتی کہ کتنا خراب گوشت آیا ہے۔ ان کی ماں سہ پہر کو دو بجے لوٹتی جب گھر میں سب لوگ کھانا کھا چکے ہوتے، وہ جلدی جلدی کھانا کھاتی جس کے دوران اخبار اس کے گلاس کے سہارے ترچھا کھڑا رہتا۔ پھر وہ جلدی سے سائیکل پر چڑھ کر دوبارہ دفتر چلی جاتی۔ شام کو لڑکے کھانے کے وقت بعض دفعہ چند لمحوں کے لیے اسے دیکھ پاتے کیونکہ کھانے کے بعد وہ اکثر پھر باہر چلی جاتی۔

لڑکے اپنا ہوم ورک سونے کے کمرے ہی میں کرتے تھے۔ بستر کے سرہانے ان کے باپ کی ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی، جس میں اس کی چوڑی سیاہ داڑھی، گنجا سر، اور کچھوے کی کھپری جیسے نقوش والے چشمے کا فریم نمایاں تھے۔ اس کی ایک اور تصویر میز پر رکھی ہوئی تھی جس میں چھوٹا لڑکا اس کی گود میں تھا۔ ان کا باپ ان کے بچپن ہی میں فوت ہو چکا تھا اور ان کو بالکل یاد نہیں تھا۔ پھر بھی بڑے لڑکے کے حافظے میں ماضی بعید کی ایک سہ پہر کا دھندلا سا نقش ضرور موجود تھا جس میں گاؤں میں کلیمنتینا خالہ کے گھر کے پاس اس کا باپ اس کو ایک ہرے رنگ کی ہاتھ گاڑی میں بٹھائے ایک گھاس بھرا میدان پار کر رہا تھا۔ بعد میں اس لڑکے کو اس ہاتھ گاڑی کے کچھ حصے، جیسے دستہ اور ایک پہیہ، کلیمنتینا خالہ کے گھر کی اٹاری میں نظر آئے تھے۔ جب نئی ہوگی تو یہ ہاتھ گاڑی یقیناً ایک شاندار چیز رہی ہوگی۔ اس لڑکے کو یہ بڑی اچھی لگتی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اس کا باپ اُسے ہاتھ گاڑی میں بٹھا کر گاڑی کو دھکیلتے وقت دوڑ رہا تھا جس سے اس کی لمبی داڑھی زور زور سے ہل رہی تھی۔ ان لڑکوں کو اپنے باپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم تھا، لیکن پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ ان کے باپ میں ضرور کاموں کا حکم دینے اور ان سے منع کرنے کے لیے عقل بھی ہوگی اور طاقت بھی۔ جب نانا یا دیومیرا کو ماں پر غصہ آتا تو نانی کہتی کہ لوگوں کو اس لڑکی پر ترس کھانا چاہیے کیونکہ وہ بیچاری کتنی بدقسمت ہے، اگر ان لڑکوں کا باپ یوجینیو زندہ ہوتا تو ان کی ماں کسی اور ہی قسم کی عورت ہوتی۔ یہ اس کی سخت بدقسمتی ہے کہ وہ اتنی کم عمری میں اپنے شوہر سے محروم ہو گئی۔ کچھ دنوں تک ان لڑکوں کی دادی بھی زندہ تھی۔ وہ اس سے کبھی نہیں ملے تھے کیونکہ وہ

Scanned with CamScanner

فرانس میں رہتی تھی۔ مگر وہ ان کو خط لکھتی رہتی تھی اور کرسمس کے موقع پر تحفے بھی بھیجا کرتی تھی۔ بہت بوڑھی ہو جانے پر آخر کار اس کا انتقال ہو گیا۔

سہ پہر کی چائے کے وقت وہ سنگھاڑے یا تیل اور سرکہ لگا کر روٹی کھاتے تھے۔ اگر ان کا ہوم ورک جلدی ختم ہو جاتا تو پھر وہ کھیلنے کے لیے چھوٹے چوک میں جا سکتے تھے، یا پھر ان پرانے حماموں کے کھنڈروں میں جو ہوائی حملے میں مسمار ہو گئے تھے۔ چھوٹے چوک میں بہت سارے کبوتروں کا بسیرا تھا، جن کو کھلانے کے لیے وہ روٹی کے ٹکڑے ساتھ رکھ لیتے یا دیومیرا سے باسی چاول مانگ کر کاغذ کے تھیلے میں بھر کر لے جاتے۔ وہاں بہت سارے لڑکوں سے ان کی ملاقات ہوتی، جیسے محلے کے لڑکے، اپنے اسکول کے لڑکے، یا کھیل کے کلب کے وہ لڑکے جو اُن کو اتوار کو منعقد ہونے والے فٹ بال میچ میں بھی ملتے۔ اس میچ میں دون ویلیانی کالی جرسی پہنے آتا اور گیند کو پاؤں سے کِک لگاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ چھوٹے چوک میں فٹ بال یا "سپاہی اور ڈاکو" والا کھیل بھی کھیلتے تھے۔ بعض دفعہ ان کی نانی بالکنی میں آ کھڑی ہوتی اور انھیں پکار کر کہتی کہ خیال رکھو، چوٹ نہ لگ جائے۔ اندھیرے چوک سے تیسری منزل کی اونچائی پر نمایاں اپنے گھر کی روشن کھڑکیاں دیکھ کر انھیں بہت اچھا لگتا، کیونکہ انھیں اطمینان محسوس ہوتا کہ وہ گھر واپس جا کر گرم چولھے پر آگ تاپ سکتے ہیں اور بہ حفاظت رات گزار سکتے ہیں۔

دیومیرا کے ساتھ نانی باورچی خانے میں بیٹھی چادریں رفو کرتی رہتی۔ نانا اپنی ٹوپی پہنے کھانے کے کمرے میں بیٹھا پایپ پیتا رہتا۔ نانی بڑی موٹی سی تھی اور سیاہ لباس پہنے رہتی تھی۔ اس کے سینے پر اور یستے چچا کا تمغہ ٹنگا رہتا تھا جو جنگ میں مارا گیا تھا۔ نانی پیزا اور دوسری چیزیں پکانے میں ماہر تھی۔ کبھی کبھی وہ ان لڑکوں کو اتنے بڑے ہونے کے باوجود بھی کھینچ کر اپنے گھٹنوں پر بٹھا لیتی تھی۔ وہ موٹی تھی اور اس کا سینہ بہت بڑا اور بہت گداز تھا۔ اس کی گردن کے نیچے سے اس کی گول، لہرے دار حاشیے والی سفید اونی صدری نظر آتی تھی جسے اس نے خود ہی سیا تھا۔ وہ اپنے گھٹنے پر انھیں بٹھا کر ان سے اپنی پرانے زمانے کی زبان میں ملائم اور شفیق الفاظ کہتی تھی۔ پھر وہ اپنے جوڑے سے بالوں کی لمبی سی آہنی پن نکال کر ان کے کان کا میل نکالنے لگتی، جس پر وہ چیخ پڑتے اور اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتے۔ یہ شور غل سن کر نانا اپنے پائپ سمیت دروازے پر آ جاتا۔

نانا ہائی اسکول میں یونانی اور لاطینی گرامر پڑھایا کرتا تھا۔ لیکن اب وہ پنشن پا رہا تھا، اور یونانی

گرامر پر ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے پرانے شاگرد کبھی کبھار اس سے ملنے آجاتے۔ ایسے موقعے پر دیومیرا قہوہ بناتی۔ غسل خانے میں کاپیوں کے کچھ اوراق رکھے ہوئے تھے، جن میں یونانی اور لاطینی کے ہوم ورک کی مشقیں درج تھیں۔ بعض صفحے بالکل نہیں پڑھے گئے تھے اور بعض پر لال اور نیلے رنگوں سے اصلاح کی گئی تھی۔ نانا کی چھوٹی سی سفید داڑھی تھی جو صرف اس کی ٹھوڑی تک محدود تھی۔ ان لڑکوں کے لیے نانا کی موجودگی میں ہنگامہ مچانا منع تھا کیونکہ برسوں کی محنت سے اس کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔ چیزوں کے دام چڑھتے رہنے سے بھی وہ پریشان رہتا تھا۔ نانی سے صبح کو نانا کا تھوڑا سا جھگڑا ہوتا تھا کیونکہ نانا کو یقین نہیں آتا تھا کہ ان سب کو اتنی زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کہتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دیومیرا نے تھوڑی بہت شکر داب لی ہو یا چھپ کر کافی بنالی ہو۔ یہ سن کر دیومیرا دوڑتی ہوئی آتی اور چلّا کر کہتی کہ کافی تو بنی تھی آپ کے شاگردوں کے لیے جن کا ہمیشہ تانتا بندھا رہتا ہے۔

مگر اس قسم کے جھگڑے بے ضرر تھے اور فوراً ہی سلجھ جاتے تھے، اور ان سے لڑکوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ البتہ ان کے گھبرانے کی بات جب ہوتی تھی جب نانا اور ماں میں لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ یہ بعض دفعہ اس وقت ہوتا تھا جب ان کی ماں بہت دیر سے گھر لوٹتی۔ شب خوابی کے لباس پر اوورکوٹ لٹکائے نانا اپنے کمرے سے باہر نکل آتا اور پھر نانا اور ماں میں خوب ڈانٹ ڈپٹ چلتی۔ نانا چلّاتا، ”مجھے معلوم ہے تو کہاں تھی، مجھے معلوم ہے تو کہاں رہی، مجھے معلوم ہے تو کیا بن گئی ہے۔“ ماں کہتی، ”تو پھر کیا ہوا، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔“ اور پھر کہتی، ”اب دیکھیے آپ نے میرے بچوں کو جگا دیا۔“ اس پر نانا کہتا، ”ہاں کیوں نہیں، بڑی فکر ٹھیری تجھے بچوں کی۔ مت نکال منھ سے کوئی لفظ۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تو کیا ہے، رنڈی کہیں کی۔ تو رات بھر پگلی کتیا کی طرح آوارہ گھومتی پھرتی ہے۔“ پھر نانی اور دیومیرا اپنے اپنے شب خوابی کے لباس پہنے باہر آکر نانا کو پکڑ کر، ”بس کرو، بس کرو“ کہتی ہوئی، اس کے کمرے میں لے جاتیں۔ پھر ماں بستر میں آلیٹتی اور چادر میں منھ ڈالے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی، اور اس کی ہچکیوں کی آواز اندھیرے کمرے میں گونجتی رہتی۔ لڑکوں کو لگتا کہ یقیناً نانا کی بات ہی صحیح ہے اور ماں کا رات کو سنیما جانا یا اپنی دوست عورت سے ملنا غلط بات ہے۔ وہ بڑے مغموم ہو جاتے، خوفزدہ اور مغموم، اور اپنے کشادہ اور نرم گرم بستر میں ایک دوسرے سے چپک جاتے۔ بڑا لڑکا، جس کی جگہ چھوٹے لڑکے اور ماں کے بیچ میں تھی، ماں سے پرے ہو جاتا تاکہ ماں کے جسم سے اس کا جسم نہ چھو جائے۔ ماں کے

آنسوؤں اور ان سے گیلے ہو جانے والے تکیے سے اسے گھن آتی۔ اس کے خیال میں ماں کا رونا بچوں کے لیے بڑی مصیبت کی بات تھی۔

دونوں لڑکے ماں اور نانا کے جھگڑوں کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے تھے اور بڑی احتیاط برتتے تھے کہ ان جھگڑوں کا موضوع نہ اٹھ کھڑا ہو۔ لیکن دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور ماں کے رونے کے دوران وہ ساتھ لپٹے رہتے۔ مگر صبح کو اٹھ جانے کے بعد انھیں رات کے وقت کا باہم لپٹنا یاد آنے پر بڑی خفت محسوس ہوتی، جیسے وہ ڈرپوک ہوں اور یہ انھوں نے ایک دوسرے کو خوف سے بچانے کے لیے کیا ہو۔ پھر وہ دوسری بات بھی ہوئی تھی جس کا ذکر بھی انھیں گوارا نہیں تھا۔ بہرحال وہ اپنا رنج و غم جلد ہی بھول جاتے کیونکہ نیا دن شروع ہوتے ہی وہ اسکول جاتے، راستے میں دوستوں سے ملتے جلتے، اور تھوڑی دیر کے لیے اسکول کے پھاٹک کے سامنے کھیلنے لگتے۔

ان کی ماں صبح کے ملگجے اُجالے ہی میں اٹھ جاتی۔ کمر میں پیٹی کوٹ لپیٹے، اور کھڑے ہو کر کمرے کی دیوار پر لگی سلفچی پر جھکی، وہ اپنی گردن اور بازوؤں کو صابن سے دھوتی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ لڑکے اس کو نہ دیکھ پائیں، مگر پھر بھی آئینے میں اس کے بھورے رنگ کے سوکھے پتلے سے کاندھوں اور چھوٹی چھوٹی ننگی چھاتیوں پر ان کی نظر پڑ جاتی۔ سردی میں اس کے سینے کی گھنڈیاں ابھر آتیں اور ان کا رنگ گہرا ہو جاتا۔ وہ بازو اونچے کر کے اپنی گھنے پیچ دار بالوں سے بھری بغلوں میں پوڈر لگاتی۔ لباس بدلنے کے بعد وہ اپنی بھنوؤں کے بال نکالنا شروع کرتی، جس کے لیے وہ آئینے کے بالکل نزدیک آ کر اپنی شکل دیکھتی اور ہونٹوں کو پوری طاقت سے بھینچ لیتی۔ پھر وہ اپنے چہرے پر ڈھیر سی کریم پوت کر کے ایک گلابی پف کو زور سے جھٹک جھٹک کر چہرے پر پوڈر لگاتی۔ اس سے اُس کا چہرہ پیلا ہو جاتا۔ بعض صبحوں کو اس کا موڈ بڑا اچھا ہوتا اور وہ لڑکوں سے بات کرنا چاہتی۔ وہ ان سے ان کے اسکول اور ان کے دوستوں کے بارے میں سوال پوچھتی اور خود اپنے اسکول کے زمانے کی باتیں سناتی، جیسے یہ کہ اس کی ایک سینوریناڈیرپے نام کی استانی تھی جو خاصی بوڑھی تھی لیکن جوان نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ پھر ماں اپنا کوٹ پہن کر اور ڈوری سے بنا ہوا خریداری کا تھیلا اٹھا کر جھک کے لڑکوں کو چومتی، اور اسکارف سر کے گرد لپیٹے، خوشبودار پیلے پوڈر سے چہرہ مزین کیے، تیزی سے باہر نکل جاتی۔

لڑکوں کو اس بات سے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ وہ اس ماں کے بچے ہیں۔ اُس سے کہیں کم

حیرت کی بات یہ ہوتی کہ ان کو نانی یا دیومیرا نے جنا ہوتا، کیونکہ ان کے بڑے ڈیل ڈول والے گرم جسم تھے جو ان کو خوفناک چیزوں سے بچا سکتے تھے اور طوفانوں اور ڈاکوؤں سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ یہ سوچ کر لڑکوں کو بہت تعجب ہوتا کہ یہ عورت ان کی ماں تھی اور وہ اتنے دن اس کے ننھے سے پیٹ میں رہے ہیں۔ ان کو یہ سکھایا گیا تھا کہ بچے پیدائش سے پہلے ماں کے پیٹ میں رہتے ہیں، اس لیے انھیں اِس رحم کی پیداوار ہونا کچھ عجیب بھی لگتا تھا اور اس بات پر تھوڑی سی شرم بھی آتی تھی۔ یہ اور حیرت انگیز بات لگتی تھی کہ اس ماں نے اپنی چھوٹی چھوٹی چھاتیوں سے انھیں دودھ بھی پلایا ہے۔

بہرحال اب چھوٹے بچوں کو کھلانے پلانے کی ذمے داری اُس پر نہیں باقی رہی تھی اور وہ لڑکے ہر صبح یہ دیکھتے تھے کہ ان کی ماں خریداری سے واپس لوٹتے ہی، بے فکری سے اور خوش وخرم، تیز تیز سائیکل چلاتی گھر سے چلی جاتی تھی۔ اب یقیناً وہ ان کی کچھ نہیں رہی تھی۔ نہ وہ اس کی ذات پر اعتماد کر سکتے تھے نہ ہی کچھ پوچھ سکتے تھے۔ یقیناً بہت ساری دوسری مائیں، مثلاً ان کے اسکول کے دوستوں کی مائیں، ایسی تھیں جن سے ہر طرح کے سوال کیے جا سکتے تھے۔ ان لڑکوں کے دوست اسکول میں چھٹی ہوتے ہی اپنی ماؤں سے ملنے کے لیے دوڑتے۔ وہ ان ماؤں سے دنیا بھر کی باتیں پوچھتے۔ ان کی مائیں ان کی ناک پونچھتیں، ان کے اوورکوٹ کے بٹن بند کرتیں اور ان کا ہوم ورک اور کامکس دیکھتیں۔ یہ کافی معمر مائیں تھیں جو ہیٹ یا چہرے کی جالی یا سمور کا گلوبند لگائے رکھتیں اور تقریباً ہر روز ماسٹر صاحب سے جا کر بات چیت کرتیں۔ یہ مائیں نانی اور دیومیرا سے ملتی جلتی عورتیں تھیں۔ یہ بھاری بھرکم، پلپلے، تحکمانہ شان والے جسموں کی مالکائیں ایسی شخصیتیں تھیں جن سے غلطیاں نہیں ہوتی تھیں، جن کی چیزیں کھوئی نہیں جاتی تھیں، جو باہر جاتے وقت درازوں کو بے ترتیب نہیں چھوڑا کرتی تھیں، جو رات کو بہت دیر کر کے نہیں واپس ہوتی تھیں۔ ان کے مقابلے میں ان کی ماں خریداری سے واپسی پر فوراً بھاگ نکلتی تھی۔ ویسے تو وہ ٹھیک سے خریداری بھی نہیں کر سکتی تھی۔ قصائی اس کو خراب مال دیتا اور دکاندار اکثر اس کو کم ریزگاری واپس کرتے۔ وہ جب روانہ ہو جاتی تو اس کو پکڑنا ناممکن تھا۔ لیکن اس کو جاتے دیکھ کر لڑکے دل ہی دل میں حیرت اور فخر بھی محسوس کرتے۔ اس کا دفتر کیسا تھا یہ تو ان کو نہیں معلوم تھا، کیونکہ وہ دفتر کا کبھی ذکر ہی نہیں کرتی تھی، البتہ وہ فرانسیسی اور انگریزی میں خطوط لکھنے اور ٹائپ کرنے کا کام کرتی تھی۔ انھیں لگتا تھا کہ وہ اس کام میں شاید ماہر ہوگی۔

Scanned with CamScanner

ایک دن جب کہ وہ لڑکے دون ویلیانی اور کھیل کے کلب کے ساتھیوں کے ساتھ سیر کرنے نکلے تھے تو واپسی پر انھیں اپنی ماں ایک نواحی قہوہ خانے میں نظر آئی۔ وہ قہوہ خانے کے اندر تھی اور اسے انھوں نے کھڑکی سے دیکھا تھا۔ ایک مرد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی ماں کا چوخانے والا اسکارف میز پر پھیلا ہوا تھا۔ وہیں پر اس کا پرانا گھڑیال کی کھال والا دستی تھیلا بھی رکھا ہوا تھا جسے وہ اچھی طرح پہچانتے تھے۔ مرد ایک ڈھیلا سا ہلکے رنگ کا اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی بھورے رنگ کی مونچھیں تھیں اور وہ ان کی ماں سے مسکراتے ہوئے باتیں کر رہا تھا۔ ان کی ماں کے چہرے پر بڑی بشاشت تھی، اطمینان اور بشاشت، جس سے گھر پر اس کا چہرہ ہمیشہ محروم رہتا تھا۔ ماں کی نگاہیں اس مرد کے چہرے پر مرکوز تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے تھے۔ ماں کو لڑکے نظر نہیں آئے۔ لڑکے دون ویلیانی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ جس نے سب کو تیز تیز چلنے کی تاکید کی تاکہ وہ ٹرام پکڑ سکیں۔ جب وہ سب ٹرام پر سوار ہو گئے تو چھوٹا لڑکا اپنے بھائی کے نزدیک آیا اور بولا، ''ممی کو دیکھا تھا تم نے؟'' بڑے لڑکے نے جواب دیا، ''نہیں، میں نے تو نہیں دیکھا۔'' چھوٹا لڑکا آہستہ سے ہنس کر بولا، ''ارے تم نے ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ عورت ممی ہی تھیں اور ایک مرد ان کے ساتھ تھا۔'' بڑے لڑکے نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ تیرہ سال کا ہونے والا تھا اس لیے تقریباً جوان ہو چلا تھا۔ چھوٹے بھائی پر اسے بڑی جھلاہٹ ہو رہی تھی کیونکہ وہ اس طرح کی باتیں کر رہا تھا جیسے کہ اسے دردپرسی کی ضرورت ہو۔ لیکن اس کو نہ جانے کیوں چھوٹے بھائی پر غصّے کے ساتھ ترس بھی آ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی ایک کرب میں تھا۔ جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا، بلکہ اس کی تمنا تھی کہ کسی طرح ایسا ہو جاتا کہ جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

ان لڑکوں نے نانی کو کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے دن، جب ان کی ماں لباس بدل رہی تھی، چھوٹا لڑکا بولا، ''ہم لوگ کل جب دون ویلیانی کے ساتھ گھومنے گئے تھے تو آپ ہمیں ایک آدمی کے ساتھ نظر آئی تھیں۔'' ماں ایک دم سے ان کی طرف مڑی۔ اس کا چہرہ سخت اور تند ہو گیا اور اس کی بھنوؤں کی کالی مچھلیاں چلبلا کر ایک دوسرے سے جڑ گئیں، اور وہ بولی، ''وہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا بات کرتے ہو! تم کو معلوم ہی ہے کہ شام کو مجھے دیر تک دفتر میں رہنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تم کو کچھ دھوکا ہوا ہے۔'' تو پھر بڑے لڑکے نے مضمحل لیکن پُرسکون لہجے میں کہا، ''نہیں، وہ آپ نہیں تھیں۔ آپ سے ملتی جلتی کوئی اور

عورت ہو گی۔" دونوں لڑکے سمجھ گئے کہ ان کے لیے اس واقعے کو ذہن سے نکال دینا ہی بہتر ہے، اور دونوں نے اپنی گہری سانسوں کے جھونکوں سے اس کو اڑا دینے کی کوشش کی۔

وہ ہلکے رنگ کے اوورکوٹ والا آدمی ایک دفعہ ان کے گھر آیا۔ لیکن چونکہ موسمِ گرما شروع ہو چکا تھا اس لیے اس آدمی نے اوورکوٹ نہیں پہنا تھا، بلکہ اس نے نیلا چشمہ لگا رکھا تھا اور ایک سوتی سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ لنچ کے دوران اس نے اپنا کوٹ اتارنے کی اجازت مانگی۔ نانا اور نانی اپنے کسی رشتے دار سے ملنے میلان گئے ہوئے تھے اور دیومیرا اپنے گاؤں چلی گئی تھی، اس لیے گھر میں صرف ان کی ماں اور وہ لڑکے موجود تھے۔ اسی موقعے پر وہ آدمی بھی آیا تھا۔ لنچ بڑے مزے کا تھا۔ ان کی ماں تقریباً سارا کھانا پکے پکائے گوشت کی ایک دکان سے خرید لائی تھی۔ مرغی کا گوشت اور آلو کے قتلے اسی دکان سے آئے تھے۔ پاستا ان کی ماں نے پکایا تھا جو ویسے تو اچھا خاصا تھا مگر اس کے اوپر کا شوربہ ذرا جل گیا تھا۔ کھانے کے ساتھ وائن بھی حاضر تھی۔ ماں بڑی پھرتیلی لگ رہی تھی، ساتھ ہی اس میں کچھ بے چینی بھی نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت ساری باتیں بیک وقت کرنا چاہ رہی ہو۔ مرد کا نام میکس تھا۔ وہ افریقہ میں رہ چکا تھا۔ اس کے پاس وہاں کی بہت ساری تصویریں تھیں جو اس نے سب کو دکھائیں۔ ایک تصویر اس آدمی کے پالتو بندر کی بھی تھی، جس کے بارے میں لڑکوں نے بے تحاشا سوال پوچھے۔ یہ بندر بظاہر بہت ذہین تھا اور اس آدمی کو بہت چاہتا تھا۔ مٹھائی حاصل کرنے کے لیے بڑی دلچسپ اور مزاحیہ حرکتیں کرتا تھا۔ لیکن میکس نے اس بندر کو افریقہ ہی میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ بیمار ہو گیا تھا اور جہاز کے سفر میں شاید ہی زندہ بچتا۔

لڑکوں کی میکس سے خاصی نبھنے لگی۔ اس نے وعدہ کیا کہ کسی دن ان کو سنیما لے جائے گا۔ جو تھوڑی سی کتابیں ان کے پاس تھیں وہ انھوں نے اس کو دکھائیں۔ اس نے پوچھا کہ کیا انھوں نے "ساتورنینو فارندولا" نام کی کتاب پڑھی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے نہیں پڑھی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ ان کو یہ کتاب لا دے گا بلکہ "روبینسون دیلّے پراتیری" بھی جو ایک اور بڑے مزے کی کتاب ہے۔ لنچ کے بعد ان کی ماں نے ان کو میدان میں جا کر کھیلنے کو کہا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ میکس کے ساتھ ہی ٹھہریں اور اس کے لیے انھوں نے تھوڑی سی ضد بھی کی۔ لیکن ان کی ماں اور میکس دونوں نے یہی کہا کہ ان کو ضرور چلے جانا چاہیے۔

جب وہ شام کو واپس آئے تو میکس جا چکا تھا۔ ان کی ماں نے جلدی جلدی رات کا کھانا تیار کیا جو دودھ والی کافی اور آلو کے سلاد پر مشتمل تھا۔ وہ لڑکے اس دن بہت خوش تھے۔ انھیں افریقہ اور اس بندر کے بارے میں باتیں کرنے کا بڑا دل چاہ رہا تھا۔ نہ جانے ان کو کیوں ایسی، حد سے زیادہ، خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ ان کی ماں بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس نے لڑکوں سے طرح طرح کی باتیں کیں۔ ایک بندر کا بھی ذکر کیا جس کو اس نے ایک باجے کی موسیقی کے ساتھ ناچتے دیکھا تھا۔ پھر اس نے لڑکوں کو سونے کے لیے جانے کو کہا اور بولی کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر جانا چاہتی ہے۔ اس میں ان کو ڈرنا نہیں چاہیے کیونکہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پھر اس نے جھک کر بچوں کو چوما اور کہا کہ انھیں نانا اور نانی سے میکس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ وہ دوسرے لوگوں کو گھر بلانا پسند نہیں کرتے۔

اس طرح چند دن دونوں لڑکے اور ماں گھر پر تنہا رہے۔ چونکہ ان کی ماں کچھ پکانا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس عرصے میں انھوں نے عجیب عجیب قسم کے کھانے کھائے، جیسے خشک کیا ہوا گوشت مربے کے ساتھ، یا دودھ بھری کافی اور پکے ہوئے گوشت کی دکان سے خریدی ہوئی تلی ہوئی چیزیں۔ کھانے کے بعد تینوں مل کر برتن دھوتے تھے۔ لیکن نانا اور نانی کے واپس آنے پر لڑکوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب میز پوش دوبارہ کھانے کی میز پر بچھایا گیا۔ گلاس اور برتن اپنی اپنی صحیح جگہ پر رکھے گئے۔ نانی اپنے پلپلے جسم اور اپنی مخصوص بو کے ساتھ اپنی جھولنے والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دینے لگی۔ چونکہ نانی بہت بوڑھی اور موٹی تھی اس لیے وہ لمحوں میں نظر سے اوجھل نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی کا اس طرح مستقل گھر میں رہنا اور غائب نہ ہونا بڑی تقویت کی بات تھی۔

لڑکوں نے نانی سے میکس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ انھیں ''ساتورنینو فارندولا'' کتاب کا انتظار رہا۔ وہ اس کے بھی منتظر رہے کہ میکس ان کو سینما لے جائے یا اپنے بندر کی اور کچھ تصویریں دکھائے۔ ایک دو بار انھوں نے اپنی ماں سے پوچھا بھی کہ سینور میکس کے ساتھ وہ کب سینما جائیں گے، اس پر ماں نے بہت روکھے لہجے میں جواب دیا کہ سینور میکس کہیں اور چلے گئے ہیں۔ چھوٹے لڑکے نے پوچھا کہ کیا وہ افریقہ گئے ہیں۔ ماں نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لڑکے نے یہی نتیجہ نکالا کہ میکس اپنے بندر کو لانے افریقہ گیا ہوگا۔ اس نے تصور ہی تصور میں یہ سوچا کہ ایک نہ ایک دن میکس اپنے بندر کو گود میں اٹھائے ہوئے ایک سیاہ فام نوکر کے ساتھ ان لڑکوں کو لینے اسکول کے باہر نمودار ہوگا۔

Scanned with CamScanner

اسکول دوبارہ شروع ہو گیا اور کلیمنٹینا خالہ کچھ دن کے لیے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کے لیے آئی۔ تحفے کے طور پر وہ ناشپاتیوں اور سیبوں سے بھرا ایک تھیلا لائی۔ ان پھلوں کو مار سالا اور شکر ملا کر بھٹی میں پکایا گیا۔ ان دنوں ان کی ماں کا مزاج بہت خراب رہنے لگا اور نانا کے ساتھ اس اکثر جھگڑا ہونے لگا۔ وہ رات کو دیر سے واپس لوٹتی اور بستر میں لیٹی سگریٹ پھونکتی اور جاگتی رہتی۔ وہ اور زیادہ دبلی ہو گئی تھی اور اس کی بھوک بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ سکڑ کر اور چھوٹا لگتا تھا اور رنگ پہلے سے بھی زیادہ زرد ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنی پلکوں پر کالا سرمہ بھی لگانے لگی تھی۔ وہ ایک ننھے سے ڈبے میں تھوکتی اور جس جگہ سرمے کے سفوف میں اس کا تھوک پڑتا وہاں سے سفوف ایک برش سے نکال کر لگاتی۔ وہ اب ڈھیروں پوڈر تھوپتی۔ اس کے چہرے پر لگے پوڈر کی اتنی موٹی تہہ نانی کو اچھی نہیں لگتی تھی اس لیے وہ ایک رومال لے کر تھوڑا سا پوڈر پونچھ دینا چاہتی، لیکن ماں اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیتی۔ ماں نے بات چیت کرنی بھی بہت کم کر دی تھی، اور جب وہ بڑی کوشش سے کچھ بولتی بھی تو اس کی آواز بہت دھیمی ہوتی۔

ایک دن ماں چھ بجے سہ پہر کے قریب گھر واپس آئی۔ یہ معمول کے بالکل خلاف تھا کیونکہ وہ روزانہ رات کو بہت دیر میں لوٹتی تھی۔ آتے ہی وہ اپنے کمرے میں گھس گئی اور اندر سے دروازے کا تالا بند کر لیا۔ چھوٹے لڑکے کو ایک کاپی کی ضرورت تھی اس لیے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو ماں خفا ہو کر اندر سے بولی کہ وہ سونا چاہتی ہے، لوگ اس کو چین سے رہنے دیں۔ لیکن پھر اس نے دروازہ کھول ہی دیا۔ لڑکے کی ماں پر نظر پڑی تو اس کو ماں کا چہرہ سوجا اور بھیگا ہوا نظر آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ رو رہی تھی۔ اس نے نانی کو جا کر بتایا، ''ممی رو رہی ہیں،'' اور نانی اور کلیمنٹینا خالہ میں چپکے چپکے بہت دیر تک کچھ باتیں ہوئیں جو کہ اس لڑکے کی سمجھ میں نہیں آئیں۔

ایک رات ماں سرے سے گھر واپس ہی نہیں آئی۔ نانا اس کے انتظار میں بار بار شب خوابی کے کپڑوں پر اوورکوٹ لٹکائے ننگے پاؤں اپنے کمرے کے باہر آتا رہا۔ نانی بھی آتی رہی۔ لڑکوں کو ٹھیک سے نیند نہیں آئی کیونکہ ان کو نانا اور نانی کے گھر میں اِدھر اُدھر چلنے اور کھڑکیوں کو کھولنے بند کرنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ لڑکے بہت خوفزدہ ہو گئے۔ صبح ہوتے ہی گھر کے لوگوں نے پولیس کو فون کیا تو پتا چلا کہ ان کی ماں ایک ہوٹل کے کمرے میں مردہ پائی گئی ہے۔ اس نے زہر کھا لیا تھا۔ کمرے میں اس کا ایک خط بھی ملا۔ نانا اور کلیمنٹینا خالہ اس سلسلے میں باہر گئے۔ نانی چیخ پکار کر رویا کی۔ لڑکوں کو نچلی

Scanned with CamScanner

منزل پر ایک بوڑھی خاتون کے ساتھ ٹھہرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ خاتون بار بار یہی جملہ دہراتی رہی کہ کیسی سنگدل ماں تھی جس نے ان بچوں کو اکیلا چھوڑ دیا۔

ماں کی لاش گھر لائی گئی۔ جب اس کو نہلا دھلا کر اور کپڑے بدل کر بستر پر لٹا دیا گیا تو پھر لڑکوں کو مردہ ماں کے دیدار کے لیے بلایا گیا۔ دیومیرا نے اس کو چمکیلے چمڑے کے جوتے اور اس کی شادی کے دن کے سرخ ریشمی کپڑے پہنا دیے تھے۔ وہ اس وقت ایک ننھی سی گڑیا لگ رہی تھی۔ اس پرانے کمرے میں پھول اور موم بتیاں کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ دیومیرا، کلیمنتینا خالہ اور نانی گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے سب کو یہ بتایا تھا کہ ماں غلطی سے زہر کھا گئی تھی کیونکہ اگر پادری کو پتا چل جاتا کہ ماں نے خودکشی کی تھی تو وہ مُردے کی مذہبی رسوم بجالانے کے لیے ہرگز ان کے گھر نہ آتا۔ دیومیرا نے لڑکوں کو کہا کہ ماں کو بوسہ دیں۔ ان کو شرم تو بہت آئی لیکن آخرکار انھوں نے ماں کے دونوں ٹھنڈے گالوں پر یکے بعد دیگرے بوسہ دیا۔ پھر جنازہ نکلا۔ قبرستان جانے کے لیے پورا شہر پار کرنا پڑا جس میں بہت دیر لگی۔ جنازے میں دون ویلیانی بھی شامل تھا اور کھیل کے کلب کے بہت سارے دوسرے بچے بھی۔ قبرستان میں بڑی سردی تھی اور بہت تیز ہوا بھی چل رہی تھی۔

جب وہ آخری رسومات ادا کر کے واپس لوٹے تو نانی کے آنسو نکل آئے۔ اور پھر جب دروازے کے قریب رکھی ہوئی ماں کی سائیکل پر نانی کی نظر پڑی تو وہ دہاڑیں مار کر رونے لگی۔ ماں کی نئی رخصت کا سماں اس کی ہمیشہ کی سائیکل سواری سے ملتا جلتا تھا، جس میں وہ بھاگتی ہوئی اپنی سائیکل پر چڑھتی، اس کا پابندیوں سے مبرّا جسم اور اُڑتا اسکارف تیزی سے نظروں سے دور ہونے لگتے، پھر چند لمحوں میں ہی وہ بالکل اوجھل ہو جاتی۔

دون ویلیانی نے لڑکوں سے کہا کہ اب ان کی ماں جنت میں پہنچ گئی ہے۔ یا تو اس کو معلوم نہیں تھا کہ ان کی ماں نے خود اپنی جان لی ہے، یا اس کو معلوم تو تھا مگر وہ ویسے ہی یہ بات کہہ رہا تھا۔ بہرحال لڑکوں پر یہ قطعی طور پر واضح نہیں تھا کہ جنت ہے بھی یا نہیں، کیونکہ نانا کے خیال میں جنت جیسی کسی چیز کا وجود نہیں تھا اور نانی کے خیال میں ضرور تھا۔ اور ان کی ماں نے ان کو یہ بتایا تھا کہ ننھے فرشتوں اور خوبصورت موسیقی والی جس جنت کا ذکر کیا جاتا ہے اس کا وجود تو نہیں ہے، مگر مرنے کے بعد لوگ ایک ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ بیمار، اور جہاں ان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی،

Scanned with CamScanner

البتہ انھیں اطمینان اور پورا سکون میسر رہتا ہے۔
کچھ دنوں کے لیے لڑکے کلیمنٹینا خالہ کے ساتھ گاؤں میں رہے۔ وہاں ہر شخص ان کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آیا۔ سب نے بچوں کو گلے لگایا اور بوسہ دیا جس پر انھیں بڑی شرم آئی۔ انھوں نے پھر کبھی آپس میں اپنی ماں یا میکس کے بارے میں بات نہیں کی۔ خالہ کی اٹاری میں ان کو ''ساتورنینو فارندولا'' مل گئی جس کو انھوں نے بار بار پڑھا کیونکہ یہ کتاب ان کو بہت مزے کی لگی۔
بڑے لڑکے کو اکثر اپنی ماں کی یاد آیا کرتی تھی، خاص طور پر اس دن کا منظر جس میں وہ قہوہ خانے میں میکس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی؛ اس کا ہاتھ میکس کے ہاتھ میں تھا، اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر بشاش اور مطمئن تھا۔ لڑکے کے ذہن میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ممکن ہے میکس کے افریقہ واپس چلے جانے اور ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کے غم میں ماں نے زہر کھالیا ہو۔
لڑکے کلیمنٹینا خالہ کے کتے بوبی کے ساتھ خوب کھیلے۔ وہیں انھوں نے درخت پر چڑھنا بھی سیکھا جو ان کو پہلے نہیں آتا تھا۔ وہ دریا میں تیرنے بھی گئے۔ جب وہ شام کو کلیمنٹینا خالہ کے گھر واپس آتے تو پھر سب مل کر لفظی معمے حل کرتے۔ کلیمنٹینا خالہ کے گھر رہنے میں لڑکوں کو بڑا مزہ آیا۔
پھر جب وہ اپنی نانی کے گھر واپس لوٹے تو وہاں بھی خوش رہے۔ نانی اپنی کرسی میں بیٹھی جھولتی رہتی تھی اور اپنے بالوں کی پن سے ان کے کان صاف کرنا چاہتی تھی۔ اتوار کے اتوار وہ پھول خرید کر ساتھ لیے دیومیرا سمیت قبرستان جاتے۔ واپسی میں کسی بار میں رک کر گرم چیچ پیتے۔ قبرستان میں نانی ان کی ماں کی قبر پر دعائیں پڑھتی اور گریہ وزاری کرتی۔ لیکن یہ ماننا لڑکوں کو مشکل لگتا تھا کہ اس قبر، اس پر لگی صلیبوں اور اس قبرستان کے تکلفات کا ان کی ماں سے کوئی تعلق ممکن تھا؛ خاص طور پر ایسی بھولی ماں سے جس کو قصائی غلط مال دے دیتا تھا، جو سائیکل پر اچھل کر چڑھتی اور منٹوں میں اوجھل ہو جاتی تھی، جو بے تحاشا سگریٹ پیتی تھی، جو ہمیشہ راستہ بھول جاتی تھی، اور جو رات کو ہچکیاں لے لے کر روتی تھی۔
ماں کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بستر اب ان کو بہت بڑا لگتا تھا۔ اب دونوں کو ایک ہی تکیے پر گذارا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، بلکہ اب ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ تکیہ ملا ہوا تھا۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں زیادہ نہیں سوچتے تھے کیونکہ اس کے خیال سے انھیں ذہنی کرب بھی محسوس ہوتا اور شرم بھی آتی تھی۔ وہ دونوں اکیلے اکیلے بعض دفعہ یاد کرنے کی کوشش کرتے کہ ماں کیسی نظر آتی تھی۔ مگر اس کے

Scanned with CamScanner

چھوٹے چھوٹے گھونگھریالے بالوں، اس کی پیشانی پر کی مچھلیوں، اور اس کے لبوں کو اکٹھا کر کے اس کی شکل کا تصور کرنا لڑکوں کے لیے روز بروز مشکل ہوتا گیا۔ وہ ڈھیروں پیلا پوڈر لگاتی تھی، یہ انھیں اچھی طرح یاد رہا۔ رفتہ رفتہ ان کے تصور میں صرف ایک پیلا دھبا تو باقی رہا، لیکن اس کے گالوں اور چہرے کی باقی تفصیلات کا تصور ناممکن ہو گیا۔ بہر صورت اب ان کو یہ احساس بھی ہو چلا تھا کہ ان کو اپنی ماں سے کبھی بھی بہت زیادہ محبت نہیں رہی تھی اور شاید ماں بھی ان سے زیادہ محبت نہیں کرتی تھی۔ اگر وہ واقعی ان سے محبت کرتی تو یوں زہر کھا کر ختم نہ ہو جاتی۔ انھوں نے خود اپنے کانوں سے دیومیرا اور قلی اور نچلی منزل کی خاتون کو زہر کھانے کے واقعے کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا اس لیے یہ صحیح بات ہی ہو گی۔

اسی طرح بہت سال گزر گئے اور وہ لڑکے بڑے ہو گئے۔ اور اس عرصے میں اتنے سارے نئے واقعات پیش آئے کہ وہ چہرہ جس سے ان کو کبھی بھی زیادہ محبت نہیں تھی، ان کی یادداشت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محو ہو گیا۔

❊❊

Scanned with CamScanner

دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی

ڈیوڈ سی کورٹن

ترجمہ: حمید زماں، محسن جعفری، زینت حسام

تدوین: اجمل کمال

Rs.400

سٹی پریس بک شاپ

سے دستیاب ہے

Scanned with CamScanner

۵۴

قیمت

۱۱۰ روپے

Scanned with CamScanner